لاہور میں

اِسلام کے سفیر

عہدِ غزنوی سے قیامِ پاکستان تک



ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

لاہور میں

اسلام کے سفیر

عہدِ غزنوی سے قیامِ پاکستان تک

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
اردو بازار لاہور

ISBN 969-503-139-0

باراول: مئی 2000ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی-

قیمت: =/200

میرے رب!

مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکریہ ادا کروں' جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی۔ نیز (مجھے توفیق عطا فرما) کہ میں وہ نیک کام کروں' جسے تو پسند فرمائے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما!

(آمین)

(سورہ النمل: 19)

اِنتساب

﴿ابوالنجم ملک ایازؒ﴾

کے نام

جن کی بدولت سرزمین لاہور کو امن و امان کا ماحول میسر آیا'
اور سفیران اسلام کو بہ اطمینان یہاں کام کرنے کا موقع ملا۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی

(علامہ اقبالؒ)

فہرست

پہلی بات

علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد (1930ء) میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک ہی سبق سیکھا ہے'
اور وہ یہ کہ اسلام نے ہر آڑے وقت میں مسلمانوں کو بچایا ہے۔"

علامہ اقبال کی اس باون تولہ پاؤ رتی سچی اور کھری بات کو بیان کرتے ہوئے میں ہمیشہ یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ اسلام کی یہ لازوال اور حیات آفریں قوت ہم تک صوفیائے اسلام کی وساطت سے پہنچی ہے۔ وہ صوفیائے اسلام جو ہر عہد میں قرآن و سنت کا جیتا جاگتا اور خوبصورت عملی نمونہ تھے۔

آنحضور' پرنور' شافع یوم نشور ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسلام کے عالمگیر پیغام کو حدود عرب سے باہر لیبیا' مصر' شام' اردن' لبنان' عراق' ایران' افغانستان' عمان' قطر' روسی آذر بائیجان' مشرقی جنوبی ترکی' روسی تاجکستان' ازبکستان' ترکمانستان' کویت' بحرین' شمالی سوڈان' مراکش' الجزائر اور تیونس تک پہنچایا۔ پھر ملوکیت کا دور آیا تو مسلمان مبلغین نے علم اسلام کو اپنے مبارک ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ تھاما اور رحمتہ للعالمین ﷺ کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج (بالخصوص اس برصغیر میں) اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہاں اسلام صوفیائے کرام کی بدولت پہنچا ہے' تو اس حقیقت سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔

"لاہور میں اسلام کے سفیر" ایسے ہی مردان حق کی داستان عالی شان ہے' جو متحدہ ہندوستان میں دور دراز ملکوں کا سفر طے کر کے ایک خاص مقصد کے تحت یہاں پہنچے تھے اور وہ خاص مقصد یہ تھا کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے سے غافل نہ ہو۔ اس کے آخری اور محبوب رسول (ﷺ) کے پیغام اسلام سے غافل نہ ہو۔

ہر شخص کوئی اہم مقصد حاصل کرنے کے لیے دنوں‘ مہینوں اس کے لیے محنت کرتا ہے۔ سلاطین بھی کسی ملک پر حملہ کرنے کے لیے مہینوں تیاریوں میں صرف کر دیتے ہیں‘ پھر کہیں جا کر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ کچھ اس سے ملتا جلتا حال اسلام کے سفیروں کا بھی ہے۔ یہ ملکوں کو فتح کرنے کے لیے تو نہیں آتے‘ لیکن پیار اور محبت سے دلوں کو فتح ضرور کرتے ہیں۔ ان کی تگ و دو ملکوں کو اجاڑنے کے لیے نہیں‘ بلکہ انسانوں کو سنوارنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ تخریب کے نہیں‘ بلکہ تعمیر کے علمبردار ہوتے ہیں۔ نفرت کے نہیں محبت کے پیامی ہوتے ہیں۔ اپنا یہ مقصد وحید حاصل کرنے کے لیے انہیں بھی برسوں سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ پاک ضمیر‘ روشن خیال اور نیک نفس مرشدوں کے حلقہ تربیت میں ریاضتیں کرنا پڑتی ہیں۔ یہ مرشد ان کے پیکر خاکی میں جوہر ملکوتی پیدا کرتے ہیں۔ انہیں پتھر سے پارس بنا دیتے ہیں اور آپ جانتے ہیں پارس دوسرے پتھروں کو بھی پارس بنا دیتا ہے۔ پس جب یہ پارس بن جاتے ہیں تو ان کے مرشد انہیں حکم دیتے ہیں کہ اب جاؤ‘ اور دور دراز ملکوں میں جا کر پتھر صفت انسانوں میں "پارس" کی خوبیاں پیدا کرو۔ اسلام کے یہ سفیر بھی کالے کوسوں کا سفر طے کر کے لاہور میں اسی غرض سے آئے تھے کہ یہاں بسنے والے انسانوں کو راہ ہدایت دکھائیں۔ ان کے تاریک سینوں کو نور اسلام سے جگمگائیں۔ انہوں نے مصطفیٰ کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کی سیرت طیبہ میں رنگی ہوئی اپنی زندگیوں کو ان کے سامنے پیش کیا۔ لوگ ان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہوئے اور جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ اسلام کے ان سفیروں نے گناہوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے‘ ان انسانوں کو اٹھایا اور محبت سے اپنے سینوں سے لگایا اور پھر اسلام کا وہ لافانی و ابدی پیغام انہیں سنایا‘ جو دلوں کو مسرت و کامرانیوں سے ہمکنار اور محبت و اخوت کے جذبوں سے سرشار کرنے والا ہے۔

اسلام کے ان سفیروں سے "محبت" مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ ان سے میری محبت کی وجہ محض یہ ہے کہ یہ نفوس قدسیہ اللہ تعالیٰ کی کتاب عظیم یعنی قرآن حکیم کی تعلیم عظیم کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ انہیں اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی مبارک اور کامل و اکمل زندگی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی اولیاء اللہ ہیں

جن سے ہر دور میں گم کردہ راہ انسانوں کو ہدایت کا راستہ ملتا ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

بمصطفیٰ ؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی ۔ تمام بولہبی ست

الحمدللہ! میری تحریروں کا موضوع ہمیشہ قرآن' حامل قرآن ﷺ اور اولیائے ذیشان رہے ہیں۔ میری یہ تازہ تالیف "لاہور میں اسلام کے سفیر" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے اپنی تالیف "اولیاء اللہ" کے بعد آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اسلام کے سفیر اس اعتبار سے تو ہمارے محسن ہیں ہی کہ ان کی بدولت اللہ تعالیٰ کا آخری اور سچا دین (اسلام) ہم تک پہنچا لیکن یہ حضرات اس لحاظ سے بھی ہمارے محسن ہیں کہ آج جس خطۂ ارضی یعنی پاکستان میں ہم رہ رہے ہیں' وہ بھی ہمارے لیے انھی کا ایک عطیہ خاص ہے۔ ہمارے حضرت خواجہ حسن نظامی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان کی تقسیم ہندو مسلم قومیتوں کے تناسب کی بنیاد پر ہوئی' جہاں بھی ان اولیاء اللہ کی مساعی جمیلہ کی بدولت مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ علاقے پاکستان میں شامل ہوئے۔ لٰہذا اگر ہم ناقدری نہ کریں تو اسلام کے ان سفیروں کو پاکستان کا حقیقی بانی کہہ سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کی تیاری میں کئی ماہ صرف ہوئے۔ بے شمار کتابیں پیش نظر رہیں۔ ان کی فہرست کتاب کے آخر میں موجود ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر مضمون لکھتے وقت میرا ذوق میرے ہم رکاب رہا۔ کتنی ہی عبارتیں تحریر و تحقیق کے دوران چھان پھٹک کی نذر ہو گئیں۔ مختصر یہ کہ اس تالیف کی تیاری کے دوران میرا مطمح نظر صرف یہ رہا کہ انسانی سیرت و کردار کی تعمیر و تشکیل کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح اور تاریخی حالات و واقعات جمع کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ آپ ہی کریں گے۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ جو نتائج میں نے اخذ کیے ہیں' وہ حرف آخر ہیں۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ وہ مجھے کوتاہیوں سے ضرور آگاہ فرمائیں۔ میرے نزدیک کسی کام میں غلطی رہ جانا اس بات کی علامت ہے کہ یہ ایک انسان کے ہاتھوں تکمیل پانے والا کام ہے۔

"لاہور میں اسلام کے سفیر" عہد غزنوی سے لے کر قیام پاکستان تک منتخب اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے ذکر خیر پر مشتمل ہے۔ میری خواہش تھی کہ آغاز کتاب میں برصغیر (پاک و ہند) کی گزشتہ ایک ہزار سالہ سیاسی و ثقافتی تاریخ بھی مختصراً شامل کردوں' یہ کام شروع بھی کر دیا تھا' لیکن پھر اس کی ضرورت یوں محسوس نہیں ہوئی کہ ان حالات و واقعات کی جھلکیاں تسلسل کے ساتھ ان مضامین میں بھی نظر آتی ہیں۔ بلاشبہ یہ اولیاء اللہ وہ عہد ساز ہستیاں ہیں' جن کے بغیر ہماری تاریخ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

آخر میں اپنے دیرینہ دوست پیرزادہ محمد اقبال فاروقی صاحب اور حکیم سید امین الدین احمد قادری خوشحالی کا بھی ممنون ہوں' جنھوں نے اس کتاب کے لیے دیباچہ تحریر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ میں اس کتاب کے ناشر محمد فیصل صاحب کا بھی شکرگزار ہوں' جو اس ارمغان کو نہایت محبت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

عابد نظامی

29 رمضان المبارک' 1419ھ

مطابق 20 جنوری 1999ء

اعظم گارڈن ملتان روڈ' لاہور

دیباچہ

لاہور میں اسلام کے سفیر

برصغیر پاک و ہند میں خورشید اسلام کی ضیائیں پھیلنے لگیں تو لاہور روحانیت کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ مسلمان فاتحین کے لشکروں کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ کا ورود مسعود ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے لاہور کو تبلیغ و ہدایت کا مرکز بنایا۔ بادشاہ آتے رہے' قابض ہوتے رہے' تخت نشین ہوتے رہے۔ ان کے اقتدار شکست و ریخت کا شکار ہوتے رہے۔ لیکن اہل اللہ نے لاہور کو اپنا مستقل مستقر بنایا' حتیٰ کہ اسے روحانیت کا گہوارہ بنا دیا۔ اولیاء اللہ کو نہ کبھی شکست ہوئی نہ انہوں نے قیام کے بعد یہاں سے کبھی واپس جانے کا سوچا۔ انہوں نے اس شہر میں رہ کر اسے اسلام کے روحانی فیضان سے منور کیا اور اس شہر کو اتنا عالی وقار اور بلند آثار بنا دیا کہ اس کے بعد بادشاہوں کی فتح و شکست کے اثرات کو بھی اس نے کبھی قبول نہ کیا۔

ہزاروں بار گزرے ہیں رسالے کج کلاہوں کے
قدم چومے ہیں' اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے
کبھی تیمور نے روندا' کبھی بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا

لاہور کی "عالی وقاری" سو فی صد ان بزرگان دین کی روحانی تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کی مرہون منت ہے جسے زمانے کے بدلتے ہوئے اثرات متاثر نہ کر سکے۔

تاریخی شواہد اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے برصغیر کو ایک فاتح کی حیثیت سے زیراقتدار کیا تو ان کے ابتدائی لشکروں کے ساتھ حضرت سید اسماعیل بخاری رحمتہ اللہ علیہ ایک عظیم محدث اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے لاہور میں وارد ہوئے۔ انہوں نے یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا تو ہزاروں لوگ کفر کی

ظلمت سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آنے لگے۔ آپ نے یہاں اسلام کی شرعی تعلیمات ہی کو رواج نہیں دیا بلکہ اسلام کی روحانی ضیاؤں کو پھیلانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہاں حضرت سید ابوالحسن علی ہجویری غزنوی رحمتہ اللہ علیہ (المعروف داتا گنج بخش لاہوری") تشریف لائے تو اسے مستقل طور پر علم و فضل اور رشد و ہدایت کا گہوارہ بنا دیا۔ وہ علوم شریعت کے ساتھ ساتھ رموز تصوف کے بھی ترجمان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں وہ انقلاب آفریں کام کیا کہ ابتدائی ایام ہی میں لاہور اسلام کی روحانی تعلیمات کی بدولت بقعہ نور بن گیا۔ آپ کی مجالس میں تربیت پانے والے علماء و صوفیاء برصغیر کے جن گوشوں میں بھی گئے' اسلام کے روحانی انوار کو پھیلاتے چلے گئے۔

حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے لاہور کو اپنی علمی اور روحانی تعلیمات کا مرکز بنایا تو لاہور سے گزر کر آگے جانے والے اولیاء اللہ آپ کے مرکز فیضان سے حصہ لیتے گئے۔ یہی وہ مردان حق تھے جنہوں نے پورے برصغیر کو اسلام کا گہوارہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور صدیوں تک نہیں بلکہ آج تک علم و فضل کا مرجع رہا ہے۔ "دارالارشاد" رہا ہے۔ "مدینتہ الاولیاء" رہا ہے۔

ہمارے محترم فاضل تذکرہ نگار جناب ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی مدظلہ العالی اولیاء اللہ سے گہری محبت رکھتے ہیں۔ وہ اولیاء اللہ کی مبارک اور انقلاب آفریں زندگیوں پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک خاص انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ سے محبت رکھنے والے حضرات ان کی تحریروں کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ان کی تحریروں کو تلاش بھی کرتے رہتے ہیں' اور حرزِ جاں بناتے ہیں۔ بزرگانِ دین کے اذکار و تذکار سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی پر مغز اور مفید کتابیں اپنے کتب خانوں کی زینت بناتے ہیں۔ خواجہ صاحب آسان زبان لکھتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بڑی بڑی کتابوں کے سمندر سمو کر علمی دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

زیر نظر کتاب "لاہور میں اسلام کے سفیر" میں انہوں نے بزرگان لاہور اور اولیائے لاہور کا ذکر خیر کیا ہے۔ انہوں نے بڑے شستہ انداز میں' بڑے میٹھے الفاظ میں' بڑے پیارے اسلوب میں اور بڑی محبت کے ساتھ بزرگان دین کے حالات طیبات بیان کئے ہیں۔ ان واقعات کو جمع کرنے میں انہوں نے کس قدر سعی کی ہے اس کا اندازہ اہل

علم کو ان کی یہ کتاب پڑھ کر بخوبی ہو جائے گا۔ وہ اس انداز سے اہل اللہ کے حالات و واقعات اور افکار و کمالات بیان کرتے ہیں کہ ایک عام اردو خواں بھی آسانی کے ساتھ ان دشوار گزار راہوں سے گزر جاتا ہے جہاں علم اور فن کے ماہرین بھی قدم بقدم اور رک رک کر چلتے ہیں۔ لاہور میں اولیاء اللہ پر لکھے جانے والے کئی تذکرے ہمارے سامنے ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اپنے اپنے حالات کے پیش نظر قلم بند کئے گئے ہیں، مگر فاضل تذکرہ نگار جناب ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی کی اس کتاب کو جو انفرادیت و جامعیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ انشاء اللہ ان کے انداز تحریر اور اسلوب بیان کو نہ صرف یہ کہ قارئین پسند کریں گے بلکہ اس سے خوب خوب فائدہ اٹھائیں گے۔

جہاں تک تذکرہ نگاری میں خواجہ صاحب کی مہارت و تحقیق کا تعلق ہے اس سلسلے میں صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ اس میدان میں نئے نہیں، ایک عرصہ سے اپنے قلم معجز رقم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ابھی چند سال قبل ان کی کتاب "اولیاء اللہ" شائع ہو کر اہل علم اور صاحبان ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ لکھنے سے قبل موضوع سے متعلق کتب کو خوب کھنگال لیتے ہیں اور غور کے بعد ایک رائے قائم کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لے کر تقسیم برصغیر تک لاہور میں آنے والے نامور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ان میں ایسے ایسے صوفیائے کرام اور داعیان اسلام کے حالات بھی آ گئے ہیں جو کئی سابقہ تذکروں میں نہیں ملتے تھے اور ابھی تک ہمارے تذکرہ نگاروں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ ہمیں توقع ہے کہ فاضل مؤلف کی یہ گراں قدر کوشش اہل علم و معرفت کے ہاں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی اور ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مقبولیت حاصل کرے گی۔ انشاء اللہ العزیز!

محمد اقبال فاروقی
(ایڈیٹر جہانِ رضا)
لاہور 31 دسمبر 1998ء

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمده ونصلی ونسلم علی رسوله الکریم

اما بعد فقال الله تعالی فی القرآن المجید

اعوذ بالله من الشیطان الرجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ربنا و ابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم

ایتک ویعلمھم الکتب والحکمه ویزکیھم

(سورۃ البقرہ پارہ 129:1)

ترجمہ "اے رب ہمارے' تو ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ نفس کرے بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔"

میرا موضوع شروع سے تصوف ہی رہا ہے اور اسی سلسلہ میں تذکرہ حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ' تذکرۂ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ' ذکر حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ العزیز' اور تذکرۂ صوفیہ نقشبندیہ رحمہم اللہ اور تذکرہ منصور حلاج لکھے۔

چونکہ تصوف کے معنی تزکیہ نفس اور جلائے قلب کے ہیں اور اگر کلام پاک کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ باآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی نفوس انسانی کا تزکیہ ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے لیے جو دعا فرمائی اس کا مقصد یہی بیان فرمایا "اے رب ہمارے! تو ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ نفس کرے۔ بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی اور حضور پاک علیہ الصلوٰۃ و السلام آخری نبی کی حیثیت سے اس دنیا میں تشریف لائے تو اس کی غرض و غایت بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمائی: "اور جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہارا تزکیہ نفس کرتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ جمعہ میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و السلام کی بعثت کی غرض و غایت بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ان الفاظ میں احسان کا اظہار فرمایا ہے: "وہ خدا ہے جس نے بنی اسماعیل میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔"

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا اصل مدعا اسی چیز کو قرار دیا گیا ہے (فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہو کہ ہے تیرے اندر کچھ رغبت کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔)

نیز قرآن اس بات پر شاہد ہے کہ آخرت میں انسان کی نجات و فلاح کا دار و مدار اور انحصار تزکیہ نفس پر ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اس نے ہی فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو معصیت میں چھپایا۔" ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اس نے ہی فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا یعنی جس نے تزکیہ حاصل کیا۔"

اس تزکیہ نفس کے متعلق حضور سید عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "خبردار انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر اس کی اصلاح ہو گئی تو تمام جسم کی اصلاح ہو گئی اگر وہ خراب ہو گیا تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور خبردار وہ لوتھڑا قلب "دل" ہے۔"

یہ حدیث پاک بتاتی ہے کہ انسان کی اصلاح دل کی پاکیزگی سے ہوتی ہے اور دل کی

پاکی اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں پر اسوۂ حسنہ کی روشنی میں عمل سے ہوتی ہے اور دل کی پاکی یہ ہے کہ مومن کی ہر حرکت و سکونِ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔

عبادت کا یہی جامع مفہوم ہے کہ پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بسر کی جائے اور اصل میں عبادت کا مقصد تزکیہ نفس اور تطہیر قلب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔

مندرجہ بالا آیات مقدسہ اور احادیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تزکیہ نفس جو تصوف کی اصل اور روح ہے' یہی تمام دین شریعت کی غایت اور تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا حقیقی مقصود ہے' اور دین میں جو اہمیت اس چیز کو حاصل ہے وہ کسی اور چیز کو میسر نہیں' دوسری چیزیں ذرائع اور وسائل کی حیثیت رکھتی ہیں اور تزکیہ نفس غایت و مقصد کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تصوف کہیں یا تزکیہ نفس اس کا سرچشمہ اور منبع و مصدر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ اس کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اسی کے حقائق و دقائق اور اسرار و رموز ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ اور وسیلہ سے واضح ہو کر تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

شیخ سراج رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب "کتاب اللمع" میں ظاہری اور باطنی علوم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"علم کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی۔ جب تک اس (علم) کا تعلق زبان و اعضاء سے ہوتا ہے اسے علم ظاہر سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا نام شریعت ہے مثلاً عبادات میں طہارت' نماز' روزہ' زکوٰۃ حج وغیرہ یا احکام میں طلاق' فرائض اور قصاص وغیرہ۔

جب اس کا اثر ظاہر سے گزر کر قلب و باطن تک محیط ہو جاتا ہے تو اس کو علم باطن کہتے ہیں یا طریقت سے موسوم کرتے ہیں۔ یہاں عبادات و احکام کی بجائے مقامات و احوال کی اصطلاحات رائج ہیں مثلاً تصدیق' اخلاص' صبر' تقویٰ' توکل' محبت اور عشق وغیرہ اور اس تفریق کی سند قرآن مجید سے ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "و اسبغ علیکم

نعمہ ظاہرۃ و باطنہ" ترجمہ: "اور تمہیں بھرپور دیں اپنی نعمتیں ظاہر اور چھپی۔"
(سورۃ لقمان پارہ: 21)

مندرجہ ذیل حدیث شریف سے طریق تصوف کی اصل ثابت ہے حدیث جبرائیل علیہ السلام جو بخاری اور مسلم کی روایت سے مشکوٰۃ شریف کے شروع میں کتاب الایمان میں منقول ہے جس کے مبارک الفاظ یہ ہیں:۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید البیاض الشیاب قال اَخبِرنِی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(مشکوٰۃ شریف' کتاب الایمان۔ حدیث اول)

ترجمہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم رسول اللہ ﷺ کے حضور میں حاضر تھے کہ ناگاہ ایک شخص مسافرانہ شکل میں بڑے سفید کپڑوں والا آیا اور اسلام کی بابت سوال کر کے یہ سوال کیا کہ یا حضرت! احسان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کیا کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا ہے تو کم از کم یہ بات ذہن نشین رکھ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔"

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں: "شریعت اور حقیقت بالکل ایک ہی ہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے اور استدلال اور کشف کا ہے یعنی جو بات ظاہری علوم شرعیہ میں بالاجمال اور بالاستدلال ملتی ہے وہی طریقت میں بالتفصیل اور مشاہدہ سے نظر آتی ہے۔"
(جلد اول مکتوب 84)

ایک شخص نے خواجہ خواجگاں حضرت بہاء الدین نقشبند بخاری رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ سیر و سلوک یعنی تصوف سے کیا مطلب ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: "اجمالی

معرفت تفصیلی ہو جائے اور جو امر عقلی یا نقلی دلیل سے سمجھا جائے وہ کشفی طور سے مشاہدہ میں آ جائے۔" ایک دوسرے مقام پر موصوف نے فرمایا: "درمیان علماء اور صوفیاء کے اتنا ہی فرق ہے کہ علما استدلالاً اور علماً جانتے ہیں اور صوفیہ کشفاً اور ذوقاً پا لیتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ہمارا سارا طریقہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا پابند ہے جو شخص کلام الٰہی کا حافظ اور احادیث رسول ﷺ کا عالم نہیں اس کی تقلید طریقت کے باب میں درست نہیں۔ ہمارے سارے علم سلوک کا ماخذ قرآن و حدیث ہیں۔

تصوف کے معانی مختلف صوفیائے کرام اور مشائخ عظام نے مختلف بیان فرمائے ہیں۔

غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:۔

"صوفی وہ ہے جو اپنے مقصد کی ناکامی کو خدائے تعالیٰ کا مقصد جانے۔ جو اپنی مراد کو مراد حق کے تابع کر دے اور ترک دنیا کر کے مقدرات کی موافقت کرنے لگے یہاں تک کہ وہ خادم بنے اور آخرت سے پہلے ہی دنیا ہی میں وہ فائز المرام ہو جائے تو ایسے شخص پر خدا کی جانب سے سلام آنے لگتا ہے اور اس پر سلامتی نازل ہونے لگتی ہے۔"

حضرت ابو الحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ نے تصوف کی یہ تعریف بیان کی ہے:۔

"اعتقادات صحیحہ اور فرائض و سنن کی پابندی کے ساتھ تمام اخلاق رذیلہ سے علیحدگی اور جملہ اخلاق فاضلہ سے متصف ہونے کو تصوف کہتے ہیں۔"

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمام تعلقات سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر رہنے کو تصوف کہتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نفس کو لوازم عبودیت کی مشق کرانا ہی تصوف ہے۔

حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت مختصر الفاظ میں تصوف کی یہ تعریف کی ہے کہ اخلاق حسنہ کا نام تصوف ہے۔

حضرت ابو حفص حداد نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ظاہر و باطن میں آداب شرعیہ کے ساتھ قائم ہونے کو تصوف کہتے ہیں اس طرح کہ ان کا اثر ظاہر سے

باطن اور باطن سے ظاہر تک پہنچ جائے۔

حضرت بشر بن الحارث رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق برتنے اور مخلوقات کے ساتھ خلق برتنے کو تصوف کہتے ہیں۔

سید الاولیاء حضرت شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اخلاق و معاملات کو مہذب بنانے اور اپنے باطن کو شرک و کفر کی آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک کرنے کا نام تصوف ہے۔

لفظ صوفی کے ماخذ کے متعلق بھی اولیاء کرام کے نظریات مختلف ہیں:۔

چنانچہ بشر بن الحارث رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "صوفی وہ ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کی خاطر پاک و صاف ہو۔" بعض کا قول ہے کہ انہیں صوفی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ خدائے عز و جل کے حضور میں پہلی صف میں ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو صوفی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کے اوصاف ان اہل صفہ کے اوصاف سے ملتے جلتے ہیں جو عہد رسالت میں تھے۔

کسی نے اس کو صفا سے مشتق کیا ہے تو کسی نے اس کا تعلق یونانی لفظ سوف سے جوڑا ہے جس کے معنی عرفان کے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے اور اس رائے سے ابن خلدون بھی متفق ہیں کہ انہیں صوف پہننے کی وجہ سے صوفی کہا گیا ہے۔ چونکہ حضور سید عالم ﷺ اون کی موٹی کھردری کمبلی اوڑھتے تھے اس لئے عاشقان رسول ﷺ نے بھی اسی لباس کو اختیار کیا۔

لفظ صوفی اور تصوف کی اصطلاح کی تاریخ کے متعلق بھی اقوال مختلف ہیں۔ اگرچہ بعض کا قول ہے کہ اسلام میں تصوف ایک زائیدہ لفظ ہے اور صوفی کا لقب اہل بغداد کی ایجاد ہے مگر علامہ ابو نصر عبداللہ بن علی السراج الطوسی رحمتہ اللہ علیہ اس لقب کو اہل بغداد کی ایجاد نہیں سمجھتے بلکہ ان کو نہایت قدیم زمانہ میں اس کا سراغ ملتا ہے چنانچہ موصوف اپنی تصنیف منیف "کتاب اللمع" میں لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے زمانہ میں یہ نام مشہور تھا جنہوں نے اصحاب رسول ﷺ کی ایک جماعت کا زمانہ مبارک پایا تھا۔ موصوف یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ میں نے طواف کے دوران ایک صوفی کو دیکھا اور ان کو کچھ دینا چاہا مگر انہوں نے نہیں لیا۔ نیز موصوف بیان کرتے ہیں کہ ایک کتاب میں جس میں اخبار مکہ جمع کئے گئے ہیں محمد بن اسحاق بن یسار

رحمتہ اللہ علیہ اور دوسرے لوگوں سے یہ روایت ہے کہ اسلام سے پہلے کسی وقت میں مکہ خالی ہو گیا تھا یہاں تک کہ کوئی شخص خانہ کعبہ کا طواف نہیں کرتا تھا اس وقت کسی دور دراز ملک سے صرف ایک صوفی آتا تھا اور طواف کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ پس اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبل از اسلام یہ نام مشہور تھا اور اس کی طرف اہل اصلاح منسوب کئے جاتے تھے' لیکن جہاں تک تاریخی روایتوں سے ثابت ہے اسلام میں سب سے پہلے ابو ہاشم صوفی کو یہ خطاب ملا جنہوں نے 150ھ میں وفات پائی۔

امام قشیری رحمتہ اللہ علیہ اپنے رسالہ قشیریہ میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کے علاوہ اور کوئی لقب ایجاد نہیں ہوا کیونکہ شرف صحبت سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہو سکتا تھا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ و التسلیم کی صحبت کو وہ عظمت اور خصوصیت حاصل ہے کہ جس شخص کو یہ عزت حاصل ہو گئی اس کو کوئی دوسرا خطاب جو اس سے بڑھ کر ہو' نہیں دیا جا سکتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین زہاد' عباد' متوکلین' فقرا' صوفیاء' اہل رضا' اہل صبر اور اہل تواضع کے امام ہیں اور ان کو یہ رتبہ رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے حاصل ہوا' اس لئے زمانہ باسعادت میں مومن کے لیے کوئی لفظ "صحابی" سے زیادہ افضل نہیں ہو سکتا تھا' چنانچہ اس وقت کے افاضل اسی لقب سے موسوم ہوئے اس کے بعد ان صحابیوں سے صحبت یافتہ حضرات کے لیے تابعین کی اصطلاح وضع ہوئی۔ اور ان کی صحبت پانے والے تبع تابعین کہلائے۔

اس کے بعد جب امت زیادہ پھیلی تو بزرگان دین زاہد اور عابد کے نام اور لقب سے ممتاز ہوئے لیکن زہد و عبادت کا دعویٰ ہر فرقے کو تھا یہاں تک کہ اہل بدعت کو بھی تھا۔ اس وقت اہل سنت کے طبقۂ خاص نے جو ذکر الٰہی میں مشغول اور غفلتوں سے دور رہتا تھا اپنے لیے اہل تصوف کی اصطلاح قائم کی اور صوفی کہلائے اور یہ لقب دوسری صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے رواج پا چکا تھا۔ لیکن بعض تنگ نظر حضرات زمانہ باسعادت کے بعد ہونے کی وجہ سے اس طریقہ کو بدعت کہتے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں:۔

"اگر تصوف' صوفی اور دوسری اصطلاحات بدعت کے لغوی مفہوم کے لحاظ سے بدعت ہی میں داخل سمجھی جائیں تو پھر تفسیر' اصول تفسیر' فقہ' اصول فقہ و کلام آج جو

ماشاء اللہ دفتر کے دفتر موجود ہیں عہد رسالت میں یہ کہاں تھے اور سب کو جانے دیجئے۔ براہ راست سنت رسول اللہ ﷺ ہی کو لیجئے آج حدیث کے متون ہی کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پھر ان کی شرحیں ہیں۔ ان کی تسہیل کے لیے مستقل لغات ہیں۔ رجال کا ایک مستقل فن ہے۔ احادیث کے جانچنے پرکھنے' روائت ودرائت کے قانون اور ضابطے ہیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں مصطلحات فن ہیں ظاہر ہے کہ عہد رسالت میں یہ کچھ بھی نہ تھا۔ سرور عالم ﷺ کی سادہ اور روزمرہ کی گفتگو حدیث تھی اور آپ کا ہر چھوٹا بڑا عمل سنت ہے۔ تو کیا اب کوئی اس بناء پر حضرات محدثین کی ساری کاوشوں اور کوششوں کو بدعت کہہ دینے کی جرات کرے گا۔"

اسی طرح حضرات فقہاء کی ساری موشگافیاں' قیاس و اجماع کی بحثیں' استقراء اور استنباط کا عقیدہ' اجتہاد کے مسائل' عبارت و اشارت اور دلالت النص کی قسمیں اور دلالت النص کی قسم کی سینکڑوں اصطلاحیں دور نبوی ﷺ میں کہاں تھیں اور کیسے ہو سکتی تھیں تو کیا بخاری"' مسلم"' ترمذی" اور امام ابو داؤد کی طرح امام ابو حنیفہ"' امام شافعی' امام مالک و امام احمد رحمتہ اللہ علیہم اجمعین' نخعی رحمتہ اللہ علیہ' اوزاعی' شیبانی اور طحاوی رحمھم اللہ علیہم اجمعین کی جانفشانیوں کو بھی ضائع قرار دیئے اور بدعت کے حکم میں لانے کی جرات کرکے شریعت ہی کے ایک بہت بڑے حصہ سے انکار کر دیا جائے گا؟ اور تو اور خود قرآن مجید اس مکتوبی شکل میں اعراب و علامات وقف سے مزین پاروں' سورتوں' رکوعوں اور آیتوں کے ساتھ مدون عہد رسالت میں یکجا کہاں موجود تھا؟ آگے چل کر مولانا عبدالماجد دریابادی مزید فرماتے ہیں:۔

"غرض یہ کہ جو حال فقہ' حدیث' تفسیر اور جملہ علوم شرعی ظاہری کا ہے کچھ ایسا ہی حال علوم باطن یعنی سلوک و تصوف کا ہے۔ عہد نبوی میں بے شک نہ لفظ تصوف رائج تھا نہ صوفی نہ ذکر و شغل' حال و مقام' مکاشفہ اور مراقبہ کی وہ سینکڑوں اصطلاحیں مروج تھیں جن سے کتب فن لبریز ہیں' خود الفاظ مرشد اور شیخ اور بیعت و مسترشد بھی اس اصطلاحی معنی میں ناپید تھے' لیکن اس اصطلاحی معنی میں خود فن حدیث ہی کہاں موجود تھا نہ کوئی اسماء الرجال کے نام سے آشنا تھا نہ جرح و تعدیل کے اصول و ضوابط سے نہ ضعیف اور موضوع' متواتر اور مشہور' صحیح اور حسن کی اصطلاحیں مقرر ہوئی تھیں۔

لیکن اگر لفظ و اصطلاح کی بحث سے گزر کر نفس حقیقت اور اصل مدعا پر پہنچنا

مقصود ہے تو جس طرح صحابی رضی اللہ عنہ یا بزم رسول ﷺ کا صحبت یافتہ اور دربار رسول ﷺ کا حاضرباش اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے درجہ ظرف و بساط اور استعداد کے موافق مفسر' محدث' فقیہہ اور متکلم تھا اسی طرح اور اسی نسبت سے صوفی اور سالک بھی تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مریدین اور مسترشدین تھے اور ان کے سب کے پیشوا و مرشد وہی تھے' جو ساری کائنات کے لیے معلم و مزکی اور مطہر بنا کر بھیجے گئے تھے۔

بہرحال لغت کے اعتبار سے تصوف کی اصل خواہ صوف ہو اور حقیقت کے لحاظ سے اس کا رشتہ چاہے صفاء سے ملتا ہو اس میں شک نہیں کہ یہ دین کا ایک اہم جزو ہے جس کی اساس خلوص فی العمل اور خلوص نیت پر ہے اور جس کی غایت تعلق مع اللہ اور حصول رضائے الٰہی ہے۔

یہ تو اسی دور کی سنت ہے جب سرور کائنات فخر موجودات ﷺ غار حرا میں بیٹھ کر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ اس غار حرا میں تزکیہ اور تصوف کا جو مقدس پودا لگایا گیا تھا وہ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ و السلام کی متبرک تعلیمات کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا اور ایک تناور درخت بن کر صبر و شکر' عزیمت و استقامت' خلوص نیت' اطاعت الٰہی اور اتباع سنت کی صورت میں برگ و بار لایا اور اس عظیم الشان درخت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو سکون دل اور اطمینان قلب میسر آیا۔

تصوف اور معرفت ایسا بحر ذخار اور بے پایاں سمندر ہے جس کا کوئی حد و حساب نہیں ہے اگر دفتر کے دفتر اس موضوع پر لکھے جائیں تو بھی یہ مضمون تشنہ تکمیل رہے گا۔ بس مختصر یہ ہے کہ اوامر و نواہی کا پابند ہونا شریعت ہے اور اوامر و نواہی کی روشنی میں ضمیر کی صفائی اخلاق کی تطہیر اور نفس کے تزکیہ کا نام طریقت ہے اور ماسویٰ اللہ سے منقطع ہو کر روح میں جلا پیدا کرنا حقیقت ہے۔ اس طرح شریعت سے طریقت اور طریقت سے حقیقت حاصل ہوتی ہے۔

از طاعتِ الٰہی دیدم جمال احمد ﷺ
و از حبِ مصطفائی دریافتم خدارا

سطور بالا میں' میں نے تزکیہ نفس کی اہمیت' لفظ صوفی اور تصوف کے معانی اور بعض حضرات کی تصوف کے بارے میں موشگافیوں کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میرے مخدوم و محترم فاضل جلیل'

ادیب بے مثل' دانشور' ادیبوں اور فضلاء میں ایک جانی پہچانی محبوب شخصیت جناب پروفیسر ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی صاحب مدظلہ' نے "لاہور میں اسلام کے سفیر" کے عنوان سے آسودگان صوفیاء و اولیائے لاہور کے سوانح' حالات و کرامات' رشد و ہدایت' تبلیغ اسلام کی سعی و کوشش کے واقعات' مقامات مقابر و مزارات کی نشاندہی نہایت معتبر اور معتمد کتب کے حوالوں سے صحیح تحقیق کی روشنی میں تحریر فرمائے ہیں اور بعض مروجہ غلط روایات کی تغلیط و تردید دلائل و شواہد کے ساتھ تاریخی حقیقت کی روشنی میں ان کی تاریخ پیدائش و وصال کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ اس تصنیف کی چند خصوصیات یہ ہیں اول تو یہ کہ بعض ان اولیاء اللہ کا بھی فاضل مصنف نے ذکر کیا ہے جو اس موضوع پر لکھی جانے والی دیگر کتابوں میں کم سامنے آئے ہیں دوسرے یہ کہ وہ لکھنے سے پہلے مصدقہ کتابوں کو پڑھ کر اور خوب تحقیق کے بعد رائے قائم کر کے لکھتے ہیں۔ جس کے باعث قارئین کو تنقید اور اعتراض کا موقعہ نہیں ملتا۔

موصوف نے اپنی تصنیف میں ابوالنجم ملک ایاز غزنوی ثم لاہوری کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے متعلق (المتوفی 449ھ) مفتی غلام سرور لاہوری نے "گنج تاریخ" میں لکھا ہے کہ ایاز' لاہور کے قدیم بزرگوں میں سے ہیں۔ ان کا تعلق سلسلہ جنیدیہ سے تھا اور ماثر لاہور کے مصنف کے مطابق وہ صاحب کرامت بزرگ تھے۔

حضرت خواجہ عابد نظامی صاحب نے اپنی موقر تالیف کا آغاز حضرت سید اسماعیل محدث لاہوری" کے ذکر خیر سے کیا ہے۔ جو سلطان محمود غزنوی کے فتح لاہور کے وقت ان کی فوج کے ہمراہ لاہور تشریف لائے اور تمام سوانح نگاروں کی متفقہ رائے کے مطابق حضرت سید محمد اسماعیل محدث لاہوری" سب سے پہلے مبلغ ہیں اور اسلام کے سفیر بھی' جنہوں نے لاہور میں اس وقت اسلام کا جھنڈا نصب کیا جبکہ لاہور میں کوئی بھی مسلمان نہیں تھا' محدث موصوف جو قرآن و حدیث کے حافظ اور علوم ظاہری اور باطنی کے باکمال بزرگ تھے۔ ان کی مساعی جمیلہ سے لاہور اسلام کا گہوارہ بن گیا اور جیسا کہ لکھا ہے کہ حضرت محمد اسماعیل محدث رحمتہ اللہ علیہ کی زبان اور بیان میں ایسی تاثیر تھی کہ لوگ پروانوں کی طرح آپ کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور ہر جمعہ کو آپ کا وعظ سن کر سینکڑوں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوتے تھے اور آپ کے بیان کی یہ کرامت تھی کہ جو غیر مسلم آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہوتا کلمہ توحید پڑھے بغیر مجلس سے نہیں جاتا تھا۔ مصنف موصوف

نے دوسرے نمبر پر سید الاولیاء' امام الاصفیاء' پیشوائے اتقیاء' حضرت علی بن عثمان الجلابی الغزنوی ثم الہجویری کا ذکر جمیل لکھا ہے جو بعد میں حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے نام نامی اور اسم گرامی سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہوئے۔ حضرت داتا صاحب" کے مرشد کامل حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی رحمتہ اللہ علیہ ہیں' جو تفسیر و حدیث کے بہت بڑے عالم اور سلسلہ عالیہ جنیدیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ان اوصاف حمیدہ و عالیہ کے حامل بزرگوں میں سے ہیں جن کی شان و عظمت کے تذکرہ میں علامہ اقبال مرحوم یوں رطب اللسان ہیں:

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو
ید بیضاء لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

حضرت شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی سیرت آج بھی گم کردہ راہوں کے لیے شمع ہدایت اور صراط مستقیم کے متلاشیوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ آپ نے صدہا برس پیشتر شریعت و سنت کے عین مطابق اصلاح معاشرہ کے لیے جو زریں اصول پیش کئے تھے انسانی زندگی کو جو پاکیزہ سانچہ عطا کیا تھا وہ آج بھی انسانی تہذیب کی بقا کی علامت اور ضمانت ہے۔ آپ کی عملی زندگی اور افعال و کردار کا نمونہ دین و دنیا کے لیے ایسا لائحہ عمل ہے جس سے استفادہ کے بعد انسانی کردار کو ثریا کی رفعت سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے جہاں اپنی لاجواب تصنیف کشف المحجوب کے ذریعہ حقیقت و معرفت کے جوابوں کی نقاب کشائی کی ہے اور ریاضت و مجاہدہ کے کے عمیق رموز بیان فرمائے ہیں اور مکاشفہ اور مجاہدہ کی تجلیات کی کرنوں کو چمکایا ہے۔ وہاں آپ نے اوامر و نواہی کی پابندی اور احکام شریعت کی پیروی کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی تعلیم کے ساتھ ظاہری احوال و معاملات کی درستی کی بھی تعلیم فرمائی ہے اور اس سلسلہ میں ایک عارف کو بااصول ہونا قرار دیا ہے۔

محترمی جناب خواجہ صاحب نے حضرت داتا گنج بخشؒ کے حالات اس خوبی سے چند صفحات میں قلم بند کئے ہیں کہ گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اس مضمون سے دل اور

روح کا ساز چھڑ گیا اور چند سطریں بے ساختہ حضرت داتا صاحبؒ سے تعلق اور عشق و محبت کی بنا پر یہاں لکھی گئیں ورنہ میرے لیے یہاں کچھ لکھنا موزوں نہیں تھا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے حضرت عبداللہ المعروف شیخ ہندی لاہوریؒ کا تذکرہ لکھا ہے جو سلطان مودود والئی کابل و غزنی کی طرف سے ولایت پنجاب کا نائب حاکم تھا جس کا نام قبول اسلام سے پیشتر رائے راجو تھا وہ سب سے پہلا ہندو تھا جو حضرت داتا صاحبؒ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوا اور آپ نے اس کا نام "عبداللہ" رکھا' لیکن شیخ ہندی ان کا لقب یا خطاب تھا۔ مرشد کامل ان کو پیار و محبت سے اس لقب سے پکارتے تھے۔

بعد ازاں فاضل مصنف نے اپنی تصنیف میں حضرت میراں حسین زنجانی رحمتہ اللہ علیہ کا تذکرہ لکھا ہے جس میں ان کی ریاضت' مجاہدہ اور سنت نبوی و احکام الٰہی کا اتباع اور اوراد و وظائف مع اوقات معینہ تفصیل کے ساتھ ذکر کئے ہیں اور خصوصیت سے مع دلائل اور تحقیق کے اس بات کی تردید کی ہے جو روایت کے طور پر حضرت سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب' آپ کے مجموعہ ملفوظات مبارکہ "فوائد الفواد" کے حوالہ سے بیان کی جاتی ہے کہ "شیخ حسین زنجانی کافی دیر سے لاہور میں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیر نے جو اس عہد کے قطب تھے خواجہ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ لاہور جاؤ اور وہاں سکونت اختیار کرو۔ حضرت علی ہجویریؒ نے اپنے پیر سے عرض کیا کہ حسین زنجانی وہاں موجود ہیں۔ پیر نے فرمایا کہ تم جاؤ جب علی ہجویری ان کے ارشاد کے مطابق لاہور پہنچے تو رات کا وقت تھا دوسری صبح کو لوگ شیخ حسین زنجانی کے جنازہ کو شہر سے باہر لے آئے۔" اہل تحقیق نے اس روایت کو الحاقی قرار دیا ہے۔ حضرت خواجہ عابد نظامی صاحب نے بعض نامور اور معتمد سوانح نگاروں کے حوالہ جات سے ثابت کیا ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے جس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت داتا صاحب علیہ الرحمتہ کا سنہ وفات 1072ھ ہے اور حضرت حسین زنجانی رحمتہ اللہ علیہ کا سن وفات 1204ھ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ نے کشف المحجوب میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ملک شام میں بانیا ندی کے کنارے موضع بیت الجن میں جب ان کے مرشد کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کا سر مبارک ان کے زانو پر تھا۔ اول صورت میں حضرت ہجویریؒ ' حضرت حسین زنجانیؒ کے جنازہ میں کیسے شریک ہو گئے۔ دوسری صورت میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ

ان کے مرشد نے انہیں اپنی زندگی میں لاہور نہیں بھیجا۔ اس کے بعد سید احمد توختہ" کا ذکر ہے۔ محترم عابد نظامی نے حضرت سید احمد توختہ کے حالات میں لفظ توختہ لقب کی وجہ تسمیہ جس انداز میں لکھی وہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ واقعہ یوں ہے۔ "یہ چھٹی ہجری کا واقعہ ہے ترکستان میں ایک شیخ طریقت نے اپنے ایک مرید صادق کو طلب فرمایا۔ اتفاق سے وہ اس وقت خانقاہ میں موجود نہ تھے کچھ دیر کے بعد آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ مرشد کامل نے انہیں طلب فرمایا ہے۔ شام ہو چکی تھی فوراً مرشد کے حجرے کی طرف لپک کر گئے' لیکن دیکھا حجرہ بند ہے۔ اندر جانا خلاف ادب جانا۔ وہیں کھڑے ہو گئے کہ مرشد طلب فرمائیں گے تو میں خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ سخت سردی کا موسم تھا' تمام شب وہیں کھڑے رہے۔ صبح تہجد کے وقت مرشد نے دروازہ کھولا تو دیکھا۔ مرید صادق دروازہ کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ بہت خوش ہوئے۔ دعائیں دیں اور فرمایا "تم توختہ ہو۔" توختہ ترکی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں: "حاضر باش۔" مرشد کامل سے دعائیں لینے والے اس مرید صادق کا نام سید احمد تھا جو اس کے بعد سید احمد توختہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔"

اسی تذکرہ میں حضرت بی بیاں پاک دامن کی کہانیوں اور روایتوں کا ذکر اور ان روایتوں پر تنقید بڑی تفصیل کے ساتھ مستند حوالوں کے ساتھ بڑے ادیبانہ اور فاضلانہ انداز میں لکھی ہے۔

اس کے بعد حضرت سید یعقوب زنجانی المعروف صدر دیوان" کا تذکرہ لکھا ہے۔ آپ کا سلسلہ جنیدیہ تھا اور سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم رحمتہ اللہ علیہ 186ھ سے ملتا ہے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے مالک تھے اور بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے۔ آپ کے علم و فضل زہد و تقویٰ اور کرامات کی شہرت لاہور سے باہر پورے پنجاب میں پھیل گئی اور بے شمار لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور بہت سے علماء اور فضلاء نے بھی آپ سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد محترم جناب خواجہ صاحب نے ترتیب وار آسودگان لاہور رحمہم اللہ کا تذکرہ لکھا ہے۔ جو بڑی تحقیق کاوش' مستند سوانح نگاروں کی کتابوں کے حوالہ جات پر مشتمل ہے اس کام میں کتنی محنت شاقہ کرنی پڑی اور کتنی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ اس کا اندازہ کوئی مصنف ہی کر سکتا ہے۔ بہرحال ہر کارے و ہر مردے۔

ان اولیاء اللہ نے دین اسلام کی جو عظیم الشان خدمت کی ہے اور جس طرح اپنی

ساری زندگی اسلام کی تبلیغ' ترویج اور اشاعت میں گزار دی اس اعتبار سے "لاہور میں اسلام کے سفیر" نہایت ہی موزوں اور مناسب نام ہے اور اس میں جدت بھی ہے اور ندرت بھی۔

یہ تمام اولیاء اللہ جن کے سوانح اور حالات مخدومی جناب خواجہ صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ تسلیم و رضا' توکل و قناعت' امید و بیم' محبت و اخوت' خلوص و خدمت خلق' فقرو فاقہ اور ایثار و استقامت کا پیکر تھے۔ عشق الٰہی کے اسیر تھے۔ دین کے نصیر تھے۔ روشن ضمیر تھے۔ بیکسوں کے دستگیر تھے۔ پیر کامل تھے۔ وہ در بے بہا تھے اور بے مثل و بے نظیر تھے۔ امیر شریعت تھے' جویائے حقیقت تھے۔ صاحب نسبت تھے' صاحب ہدایت' شمع شبستان معرفت' لالہ گلزار حقیقت اور چراغ دودمان ولایت تھے۔ علوم ظاہرو باطن میں باکمال تھے۔ مخلوق سے بے نیاز تھے۔ قومی اور نسلی امتیازات سے پاک و صاف تھے۔ مذہبی تعصبات سے مبرا تھے۔ وہ اہلِ صفا تھے۔ ولیؔ خدا تھے۔ عالم باعمل تھے اور صاحب جود و کرم تھے۔ وہ شمس و قمر میں' جان و جگر میں' لعل و گہر میں' شام و سحر میں' برگ و ثمر میں' آتش نمرود میں' گلزار ابراہیم میں خدا کا جلوہ کار فرما دیکھتے تھے۔

ان کی زندگی نکاتِ طریقت کا خزینہ تھی۔ حقیقت و معرفت کا آئینہ تھی۔ وصول الی اللہ کا زینہ تھی۔ اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منبع تھی۔ جمال رخ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس تھی۔

یہ حضرات (لاہور میں اسلام کے سفیر) لاہور بالخصوص اور ظلمت کدۂ ہند پر حکمرانی کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ اسلام کی شمع روشن کرنے آئے تھے۔ بھارت کے حکمرانوں اور برہمنوں کو حق و اسلام کی راہ دکھانے آئے تھے۔ مندر کے پجاریوں کو کعبہ کی شان دکھانے آئے تھے۔ پتھر کی مورتیوں کے آگے سر جھکانے والوں کو ایک معبود حقیقی کے آگے سر جھکانے اور رام رام جپنے والوں کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بتانے آئے تھے مگر اس شان سے آئے کہ ساتھ میں نہ کوئی فوج تھی' نہ لشکر' نہ کوئی تلوار تھی نہ خنجر' نہ کوئی ظاہری طاقت تھی نہ قوت۔ بس ہاتھ میں تسبیح تھی اور بغل میں قرآن۔ سر پر کھدر کی ٹوپی تھی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑانویں۔ دل میں شمع توحید کی روشنی اور آنکھوں میں نور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوے۔ پھر آہستہ آہستہ کفر و الحاد کی اجڑی ہوئی کھیتیاں حق و صداقت کے آبِ حیات سے سرسبز ہونے لگیں۔ بت خانوں میں اذان کی صدائے حق گونجنے لگی۔ مندروں کے پجاریوں کے سیاہ دلوں میں نور ایمان جگمگانے لگا۔ بتوں کے آگے

سر جھکانے والے ایک معبودِ حقیقی کے آگے سر جھکانے لگے۔

یہ صوفیاء کرام اور یہ اسلام کے سفیر رحمہم اللہ انسان نما حیوانوں کی عادات رذیلہ اور خصائل ذلیلہ کو قرآن و سنت کے وعظوں' خطبوں اور درسوں کے ذریعہ اور اپنے اخلاق حسنہ کے ذریعے زائل کر کے انہیں عظمت انسانیت اور احترام آدمیت کی تلقین فرماتے ہیں اور تعلیمات مقدسہ سے متاثر ہو کر انسان بندوق و کلاشنکوف سے دست بردار ہو کر حق پرست بن جاتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ قوم کو درپیش دہشت گردی' قتل و غارت اور بے حیائی جیسے شرمناک مسائل کا واحد حل تصوف اور تعلیمات صوفیہ ہی میں ہے۔ اولیاء اللہ کے مقامات و کمالات عالیہ' اور ان کی تعلیمات سے آگہی اور ان کے ذکر سعید سے راہنمائی اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

مخدومی خواجہ عابد نظامی صاحب زاد اللہ مراتبہٗ اردو ادب کے مایہ ناز ادیب ہیں۔ ادب ان کو جانشین شیخ الاسلام سلطان المشائخ زری زر بخت محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت خواجہ حسن نظامی قدس سرہ سے ورثہ میں ملا ہے۔ انداز بیان نہایت سادہ' سلیس اور دلنشیں ہوتا ہے۔ موصوف نے "لاہور میں اسلام کے سفیر" لکھ کر اردو ادب اور روحانیت میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے۔ وہ ایک بلند پایہ نعت گو شاعر ہیں۔ سلاست اور روانی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت اپنے حبیب لبیب' محسن انسانیت رحمتہ للعالمین ﷺ کے صدقہ میں فاضل مولف کو اس روحانی کیف پر وقت صرف کرنے کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ ان کی اس کوشش کو کامیاب فرمائے اور یہ چمن ولایت کا گلدستہ سدا بہار رہے۔ ناشرین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ نیز قارئین کرام کو عمل کی توفیق نصیب فرمائے اور وہ مجسمہ اخلاق بن کر قاسم حسنات و خیرات نظر آئیں۔ آمین بجاہِ طٰہٰ و یاسین ﷺ

سگِ بارگاہِ جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

احقر و آثم (حکیم) سید امین الدین احمد قادری خوشحالی

239۔ شاد باغ۔ لاہور

(6 مارچ 1999ء)

حضرت سید محمد اسماعیل محدث لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 448ھ)

محققین کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں اشاعت اسلام کا اولین مرکز جنوبی ہند میں مالا بار کا علاقہ ہے' پھر اس کے بعد سندھ کا علاقہ ہے' جو مسلمان فاتحین کے ہاتھوں اسلامی حکومت کا حصہ بنا' اور برصغیر پاک و ہند میں "باب الاسلام" کے نام سے مشہور ہوا۔ صوفیائے عظام اور علمائے کرام کی تبلیغی مساعی کی بدولت یہاں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ پھیلا اور کئی اسلامی مراکز قائم ہوئے' جن میں منصورہ' اوچ شریف اور ملتان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لاہور غزنی دور میں اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ 390ھ میں سلطان محمود غزنوی کی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول ہوئی' تو رفتہ رفتہ ہندوستان کا بیشتر مغربی حصہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا۔ 412ھ میں لاہور غزنی حکومت میں شامل ہوا' تو یہاں مسلمان مبلغین کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔

مآثر لاہور کے مؤلف کے مطابق قرین قیاس یہی ہے کہ حضرت سید اسماعیل محدؒث 412ھ کو لاہور میں آئے۔ اسی سال سلطان محمود غزنوی لاہور کی طرف آیا تھا۔ لاہور میں اس وقت راجہ جے پال کا پوتا جے پال دوم حکمران تھا۔ وہ محمود غزنوی کی آمد کی خبر سنتے ہی اجمیر کے راجہ کے پاس بھاگ گیا۔ سلطان نے لاہور پر بے کھٹکے قبضہ کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھایا اور لاہور کو غزنی کے ماتحت ایک صوبہ قرار دیا۔ اس وقت بادشاہی افواج کے ساتھ علماء و فضلاء کی ایک کثیر تعداد بھی ہوتی تھی اور یہ بالکل ممکن ہے کہ حضرت سید اسماعیل محدث غزنوی فوج کے ہمراہ لاہور آئے ہوں اور خدمت دین و اشاعت اسلام کے لیے لاہور ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا ہو۔ لیکن مولانا اعجاز الحق

قدوسی نے "تذکرہ صوفیائے پنجاب" میں حضرت شیخ اسماعیل" کا لاہور میں آمد کا سال 396ھ (مطابق 1005ء) تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لاہور میں جو سب سے پہلے مبلغ تشریف لائے' وہ شیخ اسماعیل بخاری تھے۔ وہ اس زمانے میں لاہور وارد ہوئے' جب لاہور میں ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ یہ راجہ سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا اور اس وقت لاہور میں سلطان محمود غزنوی کا کوئی نائب نہ تھا۔ شیخ اسماعیل بخاری سادات میں سے تھے۔ علوم ظاہری اور علوم باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ وہ 396ھ (مطابق 1005ء) میں لاہور پہنچے' اور انہوں نے لاہور میں اشاعت اسلام اور تبلیغ و ترویج دین کے لیے بے پناہ کوششیں کیں۔

(صفحہ:40)

بہرحال لاہور میں ورود کے سلسلے میں مورخین کے اس اختلاف کے باوجود اس حقیقت پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ لاہور میں اولین مبلغ اسلام ہیں جن کی تبلیغ سے بے شمار لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان محققین میں مفتی غلام سرور لاہوری اور نور احمد چشتی مؤلف تحقیقات چشتی اور مولوی فقیر محمد جہلمی مؤلف "حدائق الحنفیہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت شیخ اسماعیل محدث" کے بیان میں وہ دلائل اور ان کی زبان میں وہ تاثیر تھی کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ (بحوالہ نقوش لاہور نمبر ص:146)

لاہور میں جس مقام کو آپ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا وہ ہال روڈ پر واقع وہی جگہ ہے جہاں آج کل آپ کا مزار مبارک ہے۔ یہیں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی' جس میں آپ قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس دیتے تھے۔ اس زمانے میں مسجد کے ساتھ تالاب بھی تھا اور مدرسہ کی بہت بڑی عمارت بھی تھی' جو اب دکانوں' سڑکوں اور گرجوں کی عمارات میں تبدیل ہو چکی ہے۔ البتہ تنگ سی جگہ پر ایک بلند چبوترے پر حضرت کا مزار شریف اب بھی محفوظ ہے۔

حضرت سید اسماعیل محدث" بخارا کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

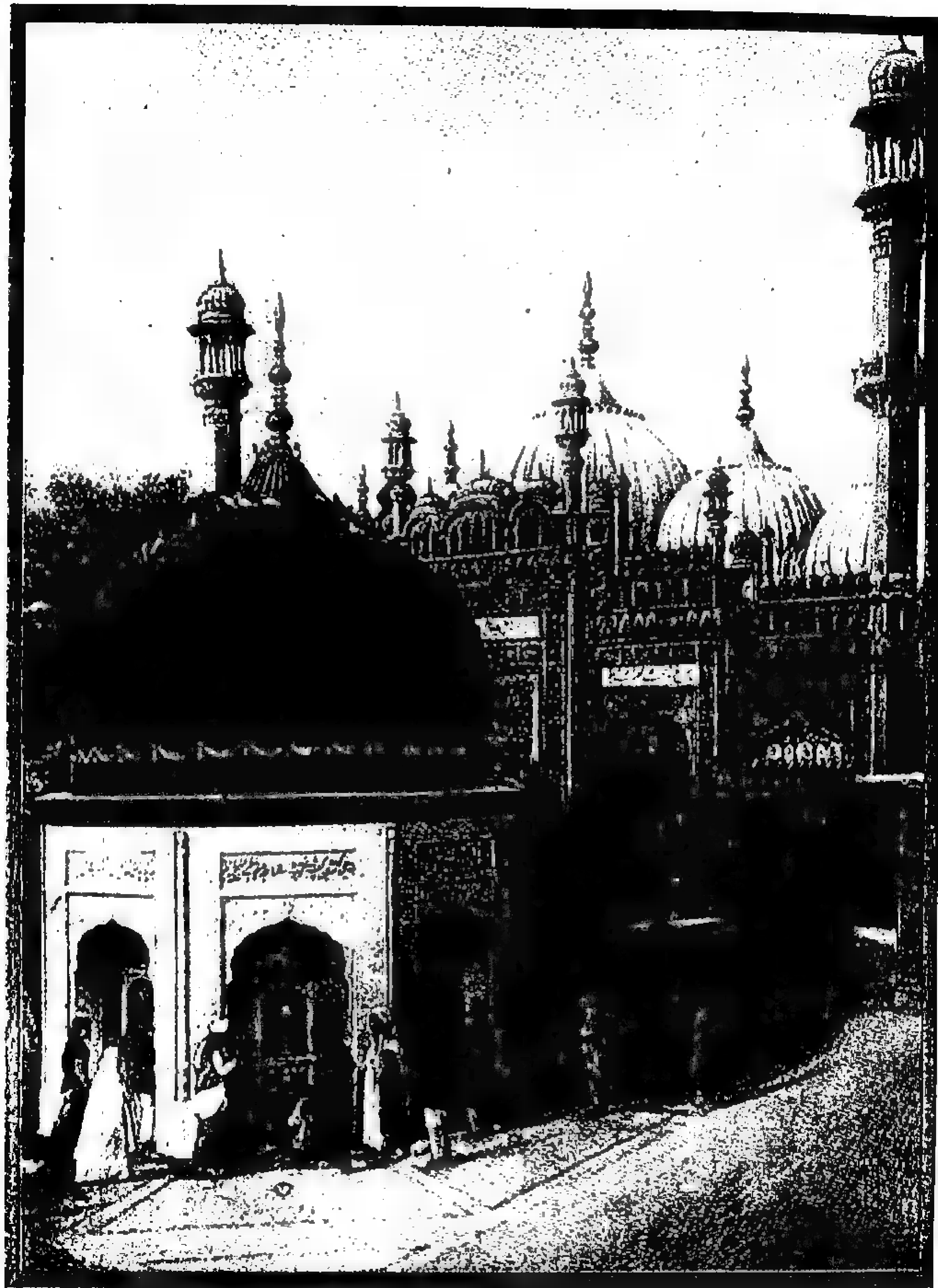
اسلامی علوم کی تحصیل انہوں نے بخارا ہی میں کی۔ آپ کو علوم ظاہریؒ و باطنی میں کمال حاصل تھا۔ فن خطابت میں آپ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ قرآن و حدیث دونوں کے حافظ تھے۔ لاہور میں نماز جمعہ کے موقع پر خطاب فرماتے تو بے شمار لوگ جمع ہو جاتے' اس موقعہ پر کئی ہندو آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کرتے۔

"اولیائے لاہور" کے مؤلف محمد لطیف ملک کے مطابق جب حضرت لاہور تشریف لائے تو یہاں ایک بھی مسلمان موجود نہ تھا۔ پہلے روز جمعہ کو انہوں نے وعظ فرمایا تو دو سو پچاس' دوسرے جمعہ کو تین سو پچاس اور تیسرے جمعہ کو پانچ سو ہندو حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ "حدائق الحنفیہ" میں ہے کہ جو غیر مسلم آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہوتا' کلمہ توحید پڑھے بغیر واپس نہ جاتا تھا۔ (صفحہ: 221) رائے بہادر کنہیا لال نے لکھا ہے کہ آپ کی تبلیغی مساعی کی بدولت یہ حال ہوا کہ ہر جمعہ کو آپ کے خطبہ کے موقع پر پانچ سو سے زیادہ افراد کا مجمع ہو جاتا تھا۔ (تاریخ لاہور ص 308)

لاہور میں اسلام کے یہ پہلے مبلغ حضرت سید محمد اسماعیل محدث لاہوریؒ 448ھ میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کو اپنے قائم کردہ مدرسے کے قریب ہی دفن کیا گیا' جہاں آپ نے چھتیس سال تک وعظ و ارشاد سے اہل لاہور کے دلوں کو نور ایمان سے جگمگایا تھا۔ خفتگان خاک لاہور کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپ کی تبلیغی مساعی سے ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لفظ "مہتاب" سے آپ کا سال وفات 448ھ برآمد ہوتا ہے۔ (ص: 453 مؤلف پروفیسر محمد اسلم)

حضرت کے مزار کے سامنے سے آج ہر روز ہزاروں اشخاص بے خبری کے عالم میں گزر جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہال روڈ جیسی پر رونق سڑک کے کنارے کون عظیم ہستی آسودۂ خواب ہے۔ اگر اہل لاہور کو ان کا مقام و مرتبہ معلوم ہو' تو شاید ایک شخص بھی فاتحہ پڑھے بغیر یہاں سے نہ گزرے کہ ان کے اب و جد کے قبول اسلام میں اس بزرگ کی تبلیغی مساعی کا حصہ کلیدی ہے۔

اس اولین مبلغ اسلام کو سلام
جس نے سنایا ہند کو اسلام کا پیام



مزار حضرت داتا گنج بخش

اللہ کا ولی وہی ہوتا ہے جو ہر طرح کے لالچ اور
نفس کی حرص سے آزاد ہو۔

(حضرت داتا گنج بخشؒ)

حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 465ھ)

یہ پانچویں صدی ہجری کی بات ہے۔

حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک پر سرہانے کی جانب ایک طالب علم محو عبادت تھا۔ اللہ کا کرنا اسی دوران اس پر غنودگی سی طاری ہوئی' اور ساتھ ہی اس کا نصیبہ جاگ اٹھا۔ خواب میں دیکھا کہ رحمتہ للعالمین' شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ضعیف العمر شخص بھی ہے۔ طالب علم نے سرکار والا تبار صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا' تو فوراً قدموں میں گر پڑا' پھر نہایت ادب سے پوچھا:

یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے ہمراہ یہ کون ہیں؟

فرمایا: علی! یہ تیرا اور تیرے دیار والوں کا امام ہے۔ اس کا نام ابو حنیفہ ہے۔

اس کرم بے پایاں کے بعد طالب علم کی آنکھ کھل گئی۔ قلب و ذہن پر ایک کیفیت طاری تھی۔ زبان پر درود شریف کا ورد جاری تھا۔ حضور پرنور' شافع یوم نشور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حضرت ابو حنیفہ کے نام کے ساتھ امام کا سابقہ سن کر طالب علم کے دل میں امام کی محبت اور بڑھ گئی' اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ زندگی فقہی مسائل میں وہ انہی کی پیروی کو اپنے اوپر لازمی قرار دے گا۔

یہ طالب علم جس پر رویا میں رحمت عالم' نور مجسم' فخر آدم و بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی کرم فرمایا تھا۔ غزنی (افغانستان) سے حصول علم کی خاطر سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا شام میں پہنچا تھا۔ اس کا نام علی بن عثمان الجلابی الغزنوی ثم الہجویری تھا' جو بعد میں حضرت داتا گنج بخش" کے نام نامی سے پوری دنیا میں معروف ہوا۔

انصاف اور تحقیق کی نظر سے دیکھیں' تو ہم اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ

سکتے کہ خلفائے راشدین اور تابعین کے بعد دنیا کے دور دراز علاقوں میں اسلام کا نور صوفیائے کرام نے پھیلایا۔ یہ لوگ دنیاوی حرص و آز سے دور اور شہرت و جاہ سے نفور تھے۔ ان نفوس قدسیہ کا بس ایک ہی کام تھا کہ سنت مصطفیٰ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و الثناء پر صدق دل سے پہلے خود عمل پیرا ہوں' اور پھر دوسروں کو اس کی تلقین کریں۔ یہ گروہ باصفا چونکہ خود اسلام کا عملی نمونہ تھا' اس لیے دل سے نکلی ہوئی ان کی باتیں براہ راست لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی تھیں' اور لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔

تبلیغ و تلقین کے میدان میں ان اصحاب مستطاب کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ان کا تعلق ہمیشہ خصوصیت کے ساتھ عوام کے نچلے طبقے سے رہتا تھا۔ آنحضور ﷺ کی طرح یہ حضرات بھی غریبوں سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے' اور ان کی خوشی و غمی میں شریک ہوتے تھے۔ معاشرے میں غریب اور پسماندہ لوگوں کی تعداد چونکہ زیادہ ہوتی ہے' اس لیے صوفیہ کو ہمیشہ اپنی بات پہنچانے کے لیے ایک وسیع حلقہ اور ماحول میسر آیا۔ برصغیر میں جن صوفیا کی بے ریا محبت اور خلوص نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا' ان میں حضرت داتا گنج بخش'' کا نام نامی بڑا نمایاں ہے۔

حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ 1009ء میں غزنی (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد عثمان بن علی بن عبدالرحمٰن اپنے زہد و تقویٰ کے باعث خلق خدا میں بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ غزنی پر اس وقت سلطان محمود غزنوی کا بیٹا سلطان مسعود غزنوی حکمران تھا۔ اس علم پرور سلطان کے باعث غزنی علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ سید علی ہجویریؒ کی عمر چار سال چار ماہ کی ہوئی تو ان کو مکتب میں پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا۔ غزنی میں ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے تحصیل علوم کے لیے دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کیا اور شام' عراق' بغداد' مدائن' فارس' آذربائیجان' طبرستان' خوزستان' خراسان' بخارا اور ماوراء النہر وغیرہ اسلامی علاقوں میں تشریف لے گئے اور نامور علماء و فضلاء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ آپ کے شوق علم کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف خراسان میں آپ تین سو سے زیادہ علماء و مشائخ کی خدمت میں حصول علم کی غرض سے حاضر ہوئے۔

حصول تعلیم کے بعد آپ مرشد کامل کی تلاش میں نکلے۔ قسمت آپ کو ابوالفضل

محمد بن الحسن ختلیؒ کی خدمت میں لے گئی' جو دمشق کے ایک گاؤں بیت الجن میں مقیم تھے۔ یہ تفسیر و حدیث کے بہت بڑے عالم اور تصوف میں حضرت جنید بغدادیؒ کے سلسلہ عالیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمیشہ روزہ سے رہتے۔ اکثر فرماتے کہ یہ دنیا ایک روزہ ہے' اور ہم روزہ سے ہیں۔ حضرت ختلی کی خدمت میں پہنچتے ہی حضرت سید علی ہجویری کے دل میں ایسی کشش پیدا ہوئی کہ آپ ان سے بیعت ہو گئے۔ سالہا سال آپ مرشد کامل کی نگرانی میں ریاضت و مجاہدات میں مشغول رہے۔ پھر ایک روز مرشد کامل نے ان کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ اے علی! ہمارے پاس تمہارا جو حصہ تھا' ہم نے تمہیں دے دیا' اب تم خلق خدا کی ہدایت اور فیض رسانی کے لیے لاہور چلے جاؤ۔ یہ حکم سنتے ہی آپ کفرزار ہند کی طرف روانہ ہوئے۔ لاہور کے اس سفر میں آپ کے دو رفیق شیخ احمد سرخسیؒ اور شیخ ابو سعید ہجویریؒ بھی ساتھ تھے۔ یہ سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت کے آخری ایام تھے۔

لاہور تشریف لا کر آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد تعمیر کی اور درس و تدریس کے ذریعے دعوت و اشاعت اسلام کا آغاز کیا۔ آپ کی طرف سے تبلیغ دین کا آغاز ہونا تھا کہ کفر و شرک میں ڈوبے ہوئے انسان آپ کی جان کے دشمن بن گئے' لیکن حضرت نے ہر قدم پر کمال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں میں آپ کی پر اثر باتیں اترنے لگیں۔ آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کرنے والوں میں لاہور کا گورنر رائے راجو بھی تھا۔ اس کو مسلمان کرنے کے بعد حضرتؒ نے اس کا نام عبداللہ رکھا' جو شیخ ہندی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ رائے راجو سورج بنسی کھشتری راجپوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ فنون حرب و ضرب کا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ علم نجوم و ریاضی میں بھی اسے دستگاہ حاصل تھی۔ ان اوصاف کے باعث وہ اپنی قوم میں بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ قبول اسلام کے بعد عبداللہ آپ کی خدمت میں رہنے لگا اور اس نے اسلام کے بارے میں حضرتؒ سے مکمل تعلیم حاصل کی۔ رائے راجو کے مسلمان ہونے کے بعد لاہور کے لوگ تیزی کے ساتھ حضرت کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے لگے۔

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ داتا صاحب نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ کی تصنیفات میں کشف المحجوب' کشف الاسرار' منہاج الدین' البیان لاہل العیان بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کو تصوف میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ شیخ

شہاب الدین سہروردیؒ کی عوارف المعارف اور ابن عربی کی فصوص الحکم وغیرہ تصوف کی کتابیں بعد میں لکھی گئیں۔

حضرت داتا صاحبؒ سنت نبوی ﷺ کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ ایسے صوفیوں پر کڑی تنقید کرتے تھے جو اسلام کے چشمہ صافی میں غیر اسلامی چیزیں شامل کرتے۔ حضرت لوگوں کو توحید و سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ کشف المحجوب میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے' اس کو دین میں کچھ نصیب نہیں ہوتا' اور جب دین جو اصل ہے مضبوط نہ ہو' تو تصوف' جو اس کی شاخ ہے' کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔"

امتداد زمانہ سے اب داتا صاحبؒ کی کتابوں میں سے صرف کشف المحجوب اور کشف الاسرار ہی باقی بچی ہیں۔ کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف پر لکھی ہوئی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس اعتبار سے اس کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب آپ نے اپنے رفیق خاص حضرت ابو سعید ہجویریؒ کے چند سوالوں کے جواب میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں تصوف کی تحقیق' اہل تصوف کے مقامات' صوفیہ کے اقوال' ہم عصر صوفیوں کے حالات اور رموز و اشارات کے علاوہ روزمرہ کے اسلامی آداب و اخلاق درج ہیں۔ اس کتاب کو اہل طریقت میں بلند مرتبہ حاصل ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں: کہ جس شخص کو مرشد میسر نہ ہو' وہ کشف المحجوب کا مطالعہ کرے۔ پروفیسر نکلسن نے کشف المحجوب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا' جس سے اس کتاب کی شہرت یورپ اور بلاد مغرب میں بہت زیادہ ہوئی۔

حضرت داتا صاحبؒ' سنت نبوی ﷺ کے مطابق بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ گھاس پھوس کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مسجد میں اسلامی تعلیمات کے مطابق لوگوں کی تربیت فرماتے تھے۔ مسجد کے قریب ہی انہوں نے خلقِ خدا کے لیے ایک کنواں بنوایا تھا۔ جس سے غریب اور مسافر لوگ اپنی پیاس بجھاتے۔ خدمت خلق ان کی زندگی کا امتیازی وصف تھا' جس میں وہ دن رات مشغول رہتے۔

حضرت کی گفتگو پرلطف ہوتی تھی۔ اخلاقی حکایات کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات راسخ فرماتے۔ ایک مرتبہ ترکستان کے ایک شہر مرو سے ایک نوجوان ان

کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شکل و صورت سے نہایت پریشان نظر آتا تھا' جیسے کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو۔ اس نے عرض کی: یا حضرت! میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں' جو مجھے سخت پریشان کرتے ہیں۔ میری مثال ایسی ہے جیسے ایک صراحی پتھروں کے درمیان پڑی ہو۔ کسی بھی لمحے یہ صراحی ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتی ہے۔ خدارا مجھے بتائیے' اس طرح دشمنوں میں گھر کر میں کیونکر زندگی بسر کروں؟

داتا صاحب نے اس کی یہ روداد سنی' تو فرمایا: عزیز نوجوان! افسوس' کہ تو زندگی کے راز نہیں جانتا۔ تجھے اس بات کی خبر ہی نہیں کہ زندگی کس ڈھنگ سے بسر کرنی چاہئے۔ دشمنوں کی بالکل پرواہ نہ کرو۔ تمہارے اندر جو طاقت سو رہی ہے' اسے جگاؤ۔ اگر پتھر خود یہ سمجھنے لگے کہ وہ شیشہ بن گیا' تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور ٹوٹ جائے گا۔ تو کب تک خود کو کمزور سمجھتا رہے گا۔ تیرے اندر جو شعلہ ہے' اس سے کام لے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی شکائتوں سے کیا فائدہ؟ جب تمہارا عزم مضبوط ہو گا' تو ساری دنیا بھی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔

اس حکایت کا ذکر علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب اسرار و رموز میں بھی کیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ یہ سبق جو حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ نے ترکستان کے نوجوان کو دیا ہے' ہم سب کے لیے ہے۔

ڈاکٹر نکلسن نے حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کا سن وصال 465ھ اور 469ھ کے درمیانی عرصہ میں بتایا ہے' لیکن اکثر مورخین کا 465ھ پر اتفاق ہے۔ (ملاحظہ ہوں خزینۃ الاصفیا۔ نفحات الانس۔ مآثر الکرام۔ حدائق الحنفیہ اور نزہتہ الخواطر)

آپ نے کئی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔ (1) منہاج الدین (2) دیوان شاعری (3) البیان لاہل العیان (4) اسرار الحرق (5) کشف الاسرار (6) الرعایت لحقوق اللہ (7) بحر القلوب (8) رسالہ حسین بن منصور (9) کشف المحجوب۔

امتداد زمانہ کے ہاتھوں صرف "کشف المحجوب" ہی محفوظ رہ سکی۔ آپ نعت گو شاعر بھی تھے۔ آپ نے اپنا کلام بھی جمع کیا' جسے کوئی شاعر پڑھنے کے بہانے آپ سے لے گیا اور واپس نہ کیا۔ بعض تذکروں میں آپ کی ایک غزل ملتی ہے۔ جس کا مطلع اور مقطع یہاں تبرکاً درج کیا جاتا ہے۔

اشتیاقت روز و شب دارم دلا
عشق تو دارم نہان و برملا
اے علی تو فرخی در شہر و کو
دہ ز عشق خویشتن ہر سو صلا
(آب کوثر۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام)

کشف المحجوب

سرزمین لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''کشف المحجوب'' کی تکمیل یہیں فرمائی۔ یہ کتاب آپ نے ایک دوست ابوسعید ہجویری کے بعض سوالات کے جواب میں تحریر فرمائی۔ اس کتاب کا آغاز آپ نے ''بھور'' میں کیا' جہاں آپ۔ اپنی خواہش کے خلاف قیام پر مجبور ہوئے۔ کتاب کے دیباچے میں آپ تحریر فرماتے ہیں: میری کتابیں غزنی میں ہیں اور میں ہند میں موضع ''بھور'' میں ہوں جو ملتان کے مضافات میں ہے یہاں میں ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔ گویا کشف المحجوب کا آغاز ''بھور'' میں اور تکمیل ''لاہور'' میں ہوئی۔

''کشف المحجوب'' کے مقدمے میں حضرت فرماتے ہیں: علی بن عثمان بن علی جلابی غزنوی ہجویری عرض کرتا ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور جو اغراض نفس میں تھیں' انہیں نکال باہر کیا اور ثابت قدم ہو کر اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔ میں نے اس کتاب کا نام ''کشف المحجوب'' اس لیے رکھا کہ پڑھنے والا نام ہی سے مقصد تالیف سمجھ لے۔ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہوں اور اس سے تکمیل کتاب کی توفیق چاہتا ہوں۔

پھر ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ یہ جو میں نے کہا کہ نفسانی اغراض سے دل کو پاک کر کے یہ کام شروع کیا ہے' تو اس کے اظہار سے غرض یہ ہے کہ جس کام میں نفسانی غرض آ جاتی ہے اس سے برکت اٹھ جاتی ہے اور دل راستی و دیانت سے ہٹ جاتا ہے اور یہ صورت دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو نفس کی غرض پوری ہو گی یا نہ ہو گی۔ نفسانی غرض پوری ہوئی تو اس میں تمام ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ اس لیے کہ جہنم کے دروازے کی کنجی مراد نفس کا حاصل ہونا ہے۔ اگر غرض نفس پوری نہ ہو تو چاہیے کہ پہلے ہی اسے دل سے نکال دیا جائے کہ اس میں نجات ہے اور دروازۂ بہشت کی کنجی اغراض نفسانی سے

مجتنب رہنا ہے' جیسا کہ حضرت رب العزت کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنی خواہش نفسانی کو روکا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔

چار چیزوں کا علم

"کشف المحجوب" میں علم کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: دنیا کے تمام علوم میں سے میں نے چار چیزوں کا علم حاصل کر لیا اور باقی علوم سے بے نیاز ہو گیا ہوں۔ اول یہ کہ رزق کی ایک مقدار لکھ دی گئی ہے' اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں اضافہ کی طلب گاری سے نجات پا گیا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے میرے اوپر جو حق ہیں' ان کی بجا آوری میرے اوپر فرض ہے۔ پس میں ان کی ادائیگی میں مشغول ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ موت میرے تعاقب میں ہے جس سے کسی طور بھی گریز ممکن نہیں۔ اس لیے میں اس سے ملنے کی تیاری میں لگا رہتا ہوں۔ اور چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ میرے حال کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس لیے اس سے شرم کرتا ہوں اور ممنوعات سے بچتا رہتا ہوں۔

علمائے غافل

ایک مقام پر "علمائے غافل" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔ "علمائے غافل وہ ہیں' جنہوں نے دنیا کو اپنا قبلہ دلی بنا لیا ہے اور شریعت مطہرہ سے حیلے بہانے تراش کر اپنے لیے آسانیاں گھڑلی ہیں۔ وہ اہل حکومت کے پجاری بن گئے ہیں۔ ظالموں کی چاپلوسی کرنا انہوں نے اپنا روزمرہ اور ان کی چوکھٹوں کا طواف مقصود بنا لیا ہے۔ وہ اپنے غرور و نخوت کو اپنی زیرکی و ہوشیاری جانتے ہیں اور اس پر فریفتہ ہیں۔ وہ ائمہ کرام کی شان میں اور اپنے استادوں کی قابلیت میں زبان طعن دراز کرتے ہیں اور بزرگان دین اور سلف صالحین کے مقابلے میں اپنی فوقیت علمی بگھارتے ہیں۔ اگر ان کے تفوق علمی کے مقابلے میں کونین کا وزن کیا جائے تو ان کی تعلّی کا وزن زیادہ ہو گا۔"

رسم پرست صوفیاء

ایک مقام پر "رسم پرست صوفیاء" کے بارے میں لکھتے ہیں: تصوف تو تمام کا تمام مجاہدہ ہے اس میں ہرگز لہو و لعب شامل نہیں کرنا چاہئے۔ اپنے آپ کو رسم پرست صوفیاء

سے بچاؤ۔ عوام الناس نے جب دیکھا کہ ناچ گانا' رقص و سرود اور بارگاہ سلاطین میں پہنچ کر ایک ایک لقمہ پر جھگڑنا اور ان کی بارگاہ میں شرف یاب ہونا کمال فقر بن گیا ہے تو وہ صوفیاء کرام سے بدعقیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ان صوفیاء کا یہی طغرائے امتیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے یہ سعادت عطا فرمائے کہ تجھ پر طریق تصوف کا حال منکشف ہو جائے اور تم ان لوگوں کو بتا سکو کہ تصوف کے انکار سے ان کی مراد کیا ہے؟ اگر یہ عین تصوف کے منکر ہیں تو یہ انکار تمام احکام شرعیہ اور انبیائے کرام کا ہے اور ان کے فضائل ستودہ کا انکار لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں وہ سعادت عطا فرمائے جس کے ساتھ اس نے اپنے ولیوں کو سعید بنایا۔

سیاہ پوشی

"کشف المجوب" میں "خرقہ پوشی" کے باب میں ایک دلچسپ حکایت بیان فرماتے ہیں کہ ایک بے علم مدعی فقر نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! آپ نے سیاہ پوشی کیوں اختیار فرمائی ہے۔ بزرگ نے جواب دیا: حضور ﷺ نے تین چیزیں چھوڑی تھیں۔ فقر' علم اور شمشیر۔ شمشیر سلاطین نے لے لی' مگر اسے درست جگہ پر استعمال نہ کیا۔ علم علماء نے اختیار کیا مگر اسے پڑھنے پڑھانے تک محدود رکھا' اس پر عمل نہ کیا اور فقر' فقراء نے اختیار کیا' مگر اسے آلہ غناء اور حصول مال کا ذریعہ بنا لیا۔ میں نے ان تینوں کے غم میں سیاہ پوشی اختیار کر لی ہے۔

سماع

سماع کے باب میں لکھتے ہیں: "میں عثمان جلابی کا بیٹا علی' اس کو دوست رکھتا ہوں' جو سماع میں نہ پڑے اور طبیعت کو پریشان نہ کرے۔ کیونکہ اس میں بڑے خطرے ہیں اور بڑی آفت یہ ہے کہ عورتیں کسی اونچے مقام سے سماع کے حال میں درویشوں کو دیکھتی ہیں اور نوجوان اور نوخاستہ ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس آفت سے مجھ پر جو گزرا ہے' گزرا ہے۔ (اب) استغفار پڑھتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے مدد مانگتا ہوں کہ میرے ظاہر اور باطن کو آفتوں سے بچائے رکھے۔" کشف المجوب سالکانِ ہدایت کے لیے بے مثل خضرِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صوفیاء

کرام اسے ہمیشہ مطالعہ میں رکھتے ہیں۔ ایک مقام پر ظاہری اور باطنی علوم میں فرق کو اس طرح بیان فرماتے ہیں: "علم ظاہر سے مراد معاملات کا علم ہے۔ علم باطن کا مقصد نیت کو صحیح کرنا ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ ان میں سے صرف ایک کو حاصل کرے تو وہ بالکل ناکام رہے گا کیونکہ ان دونوں کو حاصل کئے بغیر چارہ نہیں۔ اگر علم ظاہر حاصل کر لیا اور باطن کی پروا نہ کی، تو یہ منافقت ہو گی اور اگر علم باطن کے درپے ہوئے اور ظاہری علم سے بے نیاز رہا تو یہ الحاد و زندقہ ہو گا۔"

حضرتؒ کے بعض اقوال

(1) تصوف کی ضرورت حصول کرامت کے لیے نہیں، بلکہ تزکیہ نفس اور تعمیر اخلاق کے لیے ہے۔ اصل چیز توحید اور اتباع سنت ہے اور یہی تصوف کی روح ہے۔

(2) سب سے زیادہ اللہ کا عارف وہ ہے، جو سب سے زیادہ اللہ کے اوامر اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کی اتباع میں مجاہدہ کرے۔

(3) عقل کی آنکھیں نور ایمان کے ساتھ منور ہیں پس جس جگہ ایمان ہوتا ہے، وہاں یقین بھی ہوتا ہے اور جہاں یقین ہوتا ہے، وہاں تقویٰ بھی ہوتا ہے۔

(4) جو شخص ایسی باتوں کا قائل ہوتا ہے جو خلاف توحید ہوں اور خلاف تحقیق ہوں تو اس کا دین میں کچھ حصہ نہیں۔

(5) مجاہدوں میں سے مشکل ترین مجاہدہ یہ ہے کہ اپنے ظاہری آداب کی محافظت کی جائے۔

(6) زمانے کی آفتوں میں سے ایک آفت یہ بھی ہے کہ فکر کے مدعی جہالت کی وجہ سے علم کو چھوڑ دیں۔

حضرت عبداللہ المعروف شیخ ہندی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ تبلیغ اسلام کی غرض سے کفرزار لاہور میں تشریف لائے' تو ان کے اخلاق حسنہ' زہد و تقویٰ اور قوت ایمانی سے متاثر ہو کر جو شخص سب سے پہلے ان کے دست حق پرست پر ایمان لایا' وہ پنجاب کا نائب حاکم رائے راجو تھا۔ سید متین ہاشمی نے لکھا ہے کہ رائے راجو اس وقت سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا گورنر تھا۔ ("سید ہجویر" ص:188)

قبول اسلام سے قبل رائے راجو کا تعلق ہندوؤں کے راجپوت سورج بنسی خاندان سے تھا اور وہ حرب و ضرب میں ماہر ہونے کے علاوہ علم نجوم اور ریاضی میں بھی ممتاز مقام کا حامل تھا نیز مسلسل ریاضت و مشقت کے باعث اسے استدراجی قوت بھی حاصل تھی۔ ان خصوصیات کے باعث ہندوؤں میں اس کی بہت عزت تھی۔

قبول اسلام کے بعد تاریخ نے اسے یہ منفرد مقام عطا کیا کہ وہ حضرت داتا گنج بخش" کے دست حق پرست پر مسلمان ہونے والا پہلا ہندو تھا۔ اس بات کی تصدیق حضرت داتا صاحب" کے ہر تذکرہ نگار نے کی ہے۔ منشی فوق کے مطابق:

"ان ہزاروں بندگان خدا میں سے سب سے پہلے جو شخص مسلمان ہوا' وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا' بلکہ سلطان مودود والی کابل و غزنی کی طرف سے ولایت پنجاب کا نائب حاکم تھا۔ تحقیقات چشتی اور دیگر کتب میں اس کا نام "رائے راجو" لکھا ہے۔ چونکہ یہ پہلا ہندو بلکہ ہندوستانی تھا جو حضرت داتا صاحب" کے ہاتھ پر مسلمان ہوا' اس لیے حضرت نے اپنی دلی خواہش سے بطور یادگار اس کا نام "شیخ ہندی" رکھا۔ (سوانح حیات حضرت داتا گنج بخش": ص 60)

لیکن "شیخ ہندی" ان کا نام نہیں، بلکہ لقب یا خطاب تھا، جو مرشد کامل نے انہیں پیار سے عطا فرمایا۔ حضرت داتا صاحب نے قبول اسلام کے بعد رائے راجو کا نام عبداللہ رکھا۔ مرشد کامل نے پوری توجہ سے ان کی ظاہری و باطنی تربیت فرمائی۔ شیخ ہندی کا بھی یہ حال تھا، کہ ایک پل بھی حضرت سے جدا نہ ہوتے اور باقی تمام عمر مرشد کی خدمت و اطاعت میں گزاری۔

شیخ ہندی" نے تقریباً 120 سال عمر پائی۔ کسی تذکرہ میں آپ کا سنہ وفات درج نہیں۔ آپ کا مزار حضرت داتا گنج بخش" مرقد منور کے قریب ہی ہے، لیکن اب عورتوں کے لیے پردہ کی دیوار بن جانے سے آپ کا مزار اس حصہ میں آگیا ہے، جو زائرین عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

حضرت سید حسین زنجانی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 600ھ)

کفر زار لاہور میں جن نفوس قدسیہ کی بدولت اسلام کی روشنی پھیلی، ان میں حضرت سید اسماعیل محدث بخاری" ، حضرت سید علی ہجویری" (المعروف داتا گنج بخش لاہوری)، حضرت شاہ یوسف" (م 550ھ جن کے بارے میں حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ مبلغین لاہور میں ایک بلند پایہ بزرگ تھے۔ لیکن آج لاہور میں ان کی قبر کا نشان موجود نہیں)، حضرت حسین زنجانی لاہوری" ، حضرت سید احمد توختہ" اور سید یعقوب زنجانی " کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخرالذکر تینوں بزرگوں کے بارے میں حافظ شیرانی نے لکھا ہے کہ یہ قرن ششم ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔

"اولیائے لاہور" کے مصنف محمد لطیف ملک کے مطابق حضرت حسین زنجانی" 557ھ میں حضرت سید یعقوب زنجانی المعروف "صدر دیوان" کے ہمراہ زنجان سے لاہور تشریف لائے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید علی محمود تھا۔ جن کا شمار امرائے زنجان میں ہوتا تھا۔ سید علی محمود" متمول ہونے کے باوجود انتہائی مخیر اور خدا ترس بزرگ تھے۔ شریعت کی پابندی کو لازمی جانتے تھے۔ یہ انہی کی ذات بابرکات کا اثر تھا کہ ان کے گھر کا ماحول انتہائی پاکیزہ اور دینی تھا۔ حضرت حسین زنجانی" نے شعور کی آنکھ کھولی، تو وہ نماز روزہ کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ زبان پر ہر وقت اسمائے الٰہی کا ورد رہتا۔ آپ کا شجرۂ نسب سید الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

منشی محمد دین فوق مرحوم نے لاہور میں آپ کی آمد کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ 395ھ یا اس کے بعد یہاں تشریف لائے، اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ 395ھ تک لاہور راجہ جے پال کے بیٹے انند پال کے قبضہ میں رہا۔ اس لیے اس سے پہلے یہاں کسی

مسلمان مبلغ کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد منشی فوق لکھتے ہیں کہ 431ھ میں جس پر سب مورخین متفق ہیں' آپ کا وصال ہو گیا۔

منشی فوق صاحب کے بیان میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی یہ کہ حضرت زنجانیؒ لاہور میں 395ھ یا اس کے بعد تشریف لائے۔ گویا لاہور میں ان کی آمد کا صحیح سال وہ خود بھی متعین نہیں کر سکے اور 395ھ کا سنہ جو انہوں نے لکھا ہے' اس پر خود ان کا بھی اطمینان نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے حضرت کے وصال کے بارے میں لکھا ہے کہ 431ھ پر سب مورخ متفق ہیں۔ کاش وہ ان متفق مورخین میں سے دو تین نام بھی لکھ دیتے۔ جب کہ صورت حال یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں مل سکی' جس سے فوق صاحب کے اس بیان کی تائید ہو سکے۔ راقم الحروف کو تلاش بسیار کے بعد جو کتب دستیاب ہوئیں' ان میں بعض کتابوں میں تو حضرت کا ذکر تک نہیں ہے۔ امثلاً (1) سید محمد لطیف کی انگریزی تالیف "ہسٹری آف لاہور" (2) مفتی غلام سرور لاہوری کی "تاریخ مخزن پنجاب" (3) پیر غلام دستگیر نامی کی "بزرگان لاہور" (4) محمد دین کلیم کی "مدینتہ الاولیاء" (5) ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی "آب کوثر" (6) اعجاز الحق قدوسی کی "تذکرۂ صوفیائے پنجاب" وغیرہ ان تمام کتابوں میں لاہور میں مدفون دوسرے بزرگوں کا تذکرہ موجود ہے' لیکن حضرت میراں حسین زنجانیؒ کا ذکر خیر غالباً ان کتب کے مؤلفین نے اس لیے نہیں کیا کہ ان کی پیدائش' آمد لاہور اور وفات کی صحیح تاریخوں میں اختلاف ہے۔

"مآثر لاہور" کے مصنف سعید ہاشمی فرید آبادی نے حضرت سید یعقوب زنجانی کے حالات میں لکھا ہے کہ: "یہ سلطان بہرام کے عہد (512ھ تا 552ھ) یا چند سال بعد 557ھ میں ترکستان سے لاہور آئے۔ مقامی حاکم طغرل آپ کا معتقد اور کثرت سے لوگ مستفید ہوئے۔ ثمرات القدس اور بعض بعد کے تذکروں میں انہیں حسین زنجانی اور موسیٰ زنجانی کا بھائی بتایا گیا ہے۔ اس قوم سے حضرت حسین کے داتا صاحب کے پیر بھائی ہونے کی روایت کا ضعف بھی بالواسطہ ظاہر ہو گیا' کیونکہ "صدر دیوان" کا سال وفات 604ھ تحریر ہے۔"

فوائد الفواد کی روایت

حضرت حسین زنجانی کی لاہور آمد کے سال میں غلط فہمی "فوائد الفواد" میں درج اس روایت سے پیدا ہوئی جسے اہل تحقیق نے الحاقی قرار دیا ہے۔ "فوائد الفواد" میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات درج ہیں، جو ان کے نامور مرید حضرت امیر حسن طلاء سنجری ؒ نے قلم بند کئے ہیں، اس کتاب کے صفحہ 57 پر حضرت سلطان المشائخ ؒ کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ:

"شیخ حسین زنجانی و شیخ علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہا ہر دو مرید یک پیر بودہ اند و آن پیر قطب عہد بودہ است۔ شیخ حسین زنجانی از دیر باز ساکن لہاور بود، بعد از چند گاہ پیر الشان خواجہ علی ہجویری را فرمود کہ در لہاور رو و ساکن شو۔ شیخ علی ہجویری عرضداشت کرد کہ حسین زنجانی آنجاہست۔ پیر فرمود کہ تو برو، وچون علی ہجویری بحکم اشارت ایشاں در لہاور در آمد شب بود، بامداد آن جنازۂ شیخ حسین زنجانی را بیرون آور دند۔"

اردو ترجمہ

"شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اس عہد کے قطب تھے۔ شیخ حسین زنجانی کافی دیر سے لاہور میں سکونت پذیر تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویری سے کہا کہ لاہور جاؤ اور وہاں سکونت اختیار کرو۔ خواجہ علی ہجویری نے اپنے پیر سے عرض کیا کہ حسین زنجانی وہاں (موجود) ہیں۔ پیر نے فرمایا کہ تم جاؤ۔ جب علی ہجویری ان کے ارشاد کے مطابق لاہور پہنچے تو رات کا وقت تھا، دوسری صبح کو لوگ شیخ حسین زنجانی کے جنازے کو شہر سے باہر لے آئے۔"

اس روایت کے بارے میں رائے

پروفیسر محمد اسلم اپنی کتاب "ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت" میں "فوائد الفواد" کی اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بعض اہل علم نے اس روایت پر بڑی تحقیق کی ہے اور یہ روایت تاریخ کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ میرے ناقص خیال میں یہ الحاقی روایت ہے۔ پروفیسر نثار احمد

فاروقی صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی اپنی تصنیف "نقد ملفوظات" میں لکھتے ہیں کہ ملفوظات کے نسخوں میں بعد کو درگاہی لوگوں اور پیرزادوں نے اپنے مقاصد کے تحت کچھ تحریفیں بھی کر رکھی ہیں۔ (بحوالہ نقد ملفوظات لاہور 1989 ص 210)

پروفیسر موصوف مزید لکھتے ہیں:

"شیخ حالی نے سید العارفین حضرت خواجہ معین الدین اجمیری اور شیخ حسین زنجانی کو ہم عصر بتایا ہے۔ شاہجہاں نام کے مصنف محمد صالح کنبوہ نے بھی لاہور میں حضرت اجمیری اور شیخ زنجانی کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ دارا شکوہ نے بھی سفینۃ الاولیاء میں انہیں ہم عصر بتایا ہے۔ حضرت ہجویری کا سال وفات 1072ء بتایا جاتا ہے اور حسین زنجانی 1204ء میں فوت ہوئے تھے۔ ان حالات میں سید ہجویری ان کے جنازے میں کیسے شریک ہو گئے؟ حضرت علی ہجویری نے کشف المحجوب میں تحریر فرمایا ہے کہ ملک شام میں بانیا ندی کے کنارے موضع بیت الجن میں جب ان کے مرشد کا انتقال ہوا' تو اس وقت ان کا سر مبارک ان کے زانو پر تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مرشد نے انہیں اپنی زندگی میں لاہور نہیں بھیجا۔ اس لیے فوائد الفواد کی یہ روایت الحاقی معلوم ہوتی ہے۔"

پروفیسر محمد اسلم کے اس اقتباس سے ہمیں "اولیائے لاہور" کے مؤلف محمد لطیف ملک کی رائے جو ہم اوپر درج کر آئے ہیں' درست معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حسین زنجانی 557ھ میں حضرت سید یعقوب زنجانی المعروف "صدر دیوان" کے ہمراہ زنجان سے لاہور تشریف لائے۔ حدیقۃ الاولیاء اور بعض دوسرے تذکروں کے مطابق آپ کا شجرہ طریقت حضرت سیدنا جنید بغدادی کے ساتھ ملتا ہے۔

لاہور تشریف لانے کے بعد آپ نے سب سے پہلے یہاں کی مقامی زبان سیکھی' تاکہ مقامی لوگوں تک اللہ کا دین پہنچانے میں آسانی ہو۔ آپ کا طریقہ تھا کہ جمعہ کے روز شہر جا کر لوگوں کے سامنے وعظ و تلقین فرماتے۔ آپ کی محبت اور شفقت کی بدولت رفتہ رفتہ لوگوں کا اعتقاد آپ پر اس قدر بڑھ گیا کہ دور و نزدیک سے لوگ اپنے بیماروں کے

لیے پانی دم کروانے کی خاطر آنے لگے۔ اس طرح لوگوں کے ساتھ آپ کے میل جول کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔

حضرت میراں حسین زنجانیؒ اکابر صوفیہ کی طرح سنت نبوی ﷺ کا نمونہ تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ اول شب کسی قدر آرام فرماتے پھر اٹھ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ نماز تہجد ادا کرنے کے بعد اشراق تک نماز و وظائف میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز تک تبلیغ دین کے کاموں میں مصروف رہتے۔ کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ فرماتے اور پھر نماز عصر تک تلاوت قرآن کرتے۔ پھر چہل قدمی کے لیے دریا کی طرف تشریف لے جاتے' اس دوران بھی راستے میں جہاں موقعہ ملتا اللہ کے دین کی تبلیغ کے لیے مستعد رہتے۔

بعض تذکروں میں آپ کے اقوال و ارشادات بھی ملتے ہیں' جن سے ہم آج بھی اپنے سیرت و کردار میں رفعت و طہارت پیدا کر سکتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں:

(1) انسان کو ہمیشہ وہ دولت جمع کرنی چاہیے' جو موت کے وقت اس کے ساتھ جا سکے۔
(2) بے ادب ہمیشہ بے مراد رہتا ہے۔
(3) اصل درویش وہی ہے' جو اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کی خدمت اور حاجت روائی میں مشغول رہے۔
(4) جو شخص جوانی میں فرمان خداوندی ضائع کرتا ہے۔ اللہ اسے بڑھاپے میں ذلیل و خوار کرتا ہے۔
(5) حرص اور لالچ سے دور رہو' دنیا کی محبت انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔

وصال

"خزینۃ الاصفیاء" اور "خفتگان خاک لاہور" کے مؤلفین کے مطابق آپ کا وصال 600ھ میں ہوا اور تحقیقات چشتی (نور احمد چشتی)' اولیائے لاہور (محمد لطیف ملک) اور تاریخ لاہور (کنہیا لال) کے مطابق آپ کا وصال 604ھ میں ہوا۔ رحمتہ اللہ علیہ

آپ کا مزار مبارک علاقہ "چاہ میراں" لاہور میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ "چاہ میراں" کا دوسرا معروف نام "میراں دی کھوئی" ہے۔ اس کنوئیں کے بارے میں آپ کی

یہ کرامت بہت مشہور ہے' جسے آپ کے بعض تذکرہ نگاروں نے بھی بیان کیا ہے لاہور میں جہاں آپ کی رہائش تھی' وہاں آپ کے مریدوں نے ایک کنواں کھدوایا تاکہ خلق خدا مستفیض ہو' اس سے پہلے لوگوں کو پینے کے لیے دریا سے پانی لانا پڑتا تھا۔ کنواں کھودا گیا تو اس سے جو پانی نکلا' وہ کھاری تھا۔ حضرت کو جب معلوم ہوا تو آپ تشریف لائے اور کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہو کر پانی پر دم کیا۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے پانی میں ایسی حلاوت پیدا فرمائی کہ دور دور سے لوگ اس کنویں سے پانی لینے کے لیے آنے لگے۔

حضرت سید احمد توختہ رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 602ھ)

یہ چھٹی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ ترکستان میں ایک شیخ طریقت نے اپنے ایک مرید صادق کو طلب فرمایا۔ اتفاق سے اس وقت [redacted] خانقاہ میں موجود نہ تھے۔ کچھ دیر کے بعد آئے' تو انہیں معلوم ہوا کہ مرشد کامل نے انہیں طلب فرمایا' شام ہو چکی تھی' فوراً مرشد کے حجرۂ نورین کی طرف لپکے' لیکن دیکھا کہ حجرہ بند ہے۔ اندر جانا خلاف ادب جانا۔ وہیں کھڑے ہو گئے کہ مرشد طلب فرمائیں گے' تو میں خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ سخت سردی کا موسم تھا' تمام شب وہیں کھڑے رہے۔ صبح تہجد کے وقت مرشد نے دروازہ کھولا' تو دیکھا مرید صادق دروازے کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ بہت خوش ہوئے' دعائیں دیں اور فرمایا: تم توختہ ہو۔ توختہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں حاضرباش۔

مرشد کامل سے دعائیں لینے والے اس مرید صادق کا نام سید احمد تھا' جو اس خطاب کے بعد سید احمد توختہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ (بزرگان لاہور: غلام دستگیر نامی ص 222)

تکمیل تعلیم کے بعد سید احمد توختہ 560ھ میں تبلیغ اسلام کی غرض سے ترمذ (ترکستان) سے لاہور تشریف لائے۔ آپ کی دو صاحبزادیاں بی بی حاج اور بی بی تاج بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔ اس وقت خسرو غزنوی تاج الدولہ لاہور کا حکمران تھا۔ لاہور آتے ہوئے راستے میں آپ نے بے شمار بزرگان دین سے اکتساب فیض کیا۔ آپ کا سلسلہ طریقت جنیدیہ ہے۔ لاہور آتے ہوئے جب آپ کیچ مکران پہنچے' تو اپنی بڑی بیٹی بی بی حاج کی شادی شاہزادہ بہاؤالدین محمد ولد سلطان قطب الدین محمد والئی کیچ مکران سے کر دی' جو شیخ ابوالحسن ہکاری قریشیؒ کی اولاد و امجاد سے تھے۔

آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے شیر خدا حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ شجرہ نسب اس طرح ہے:

سید احمد توختہ بن سید علی ترمذی بن سید حسین مدنی بن سید ناصر مدنی بن سید موسیٰ بن سید علی بن علی اصغر بن امام زین العابدین بن سیدنا امام حسین بن اسد اللہ الغالب بن علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

لاہور میں آپ نے اندرون اکبری دروازہ میں قیام فرمایا اور سلسلہ درس و تدریس اور رشد و ہدایت' شروع فرمایا۔ آپ کے روحانی فیضان سے خلق خدا اس قدر فیض یاب ہوئی کہ آپ کو "مرشد پنجاب" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

لاہور تشریف لانے کے بعد آپ کے حقیقی برادر زادہ شاہ زید" بھی یہاں آگئے' جن سے آپ نے اپنی دوسری صاحبزادی بی بی تاج کا نکاح کر دیا اور شاہ زید" کو ہندوستان روانہ فرمایا' جہاں وہ جنگ سوانہ برہمن میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

حضرت سید توختہ" مسلسل بیالیس سال تک پنجاب میں رشد و ہدایت کا نور پھیلاتے رہے۔ آپ نے 602ھ میں سلطان قطب الدین ایبک کے عہد میں وفات پائی۔ جس مقام پر آپ نے وصال فرمایا' اسی جگہ آپ کو دفن کیا گیا۔ امرائے حکومت نے آپ کا شاندار مزار تعمیر کرایا' لیکن جب پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے مزار کا قیمتی سنگ مرمر اتار لیا' جس کے سبب کچھ عرصہ بعد یہ مقبرہ گر گیا۔ پھر رتہ پیراں کے غلام محی الدین شاہ نے گرد و نواح کے قبرستان کو مسمار کر کے اپنی حویلی بنا لی۔ اب آپ کا مزار آسمان کے سائے میں ایک مختصر سے قطعہ زمین پر ایک تنگ سی گلی (محلہ چلہ بیبیاں) میں موجود ہے۔

آج لاہور میں ہمارے کتنے ہی ایسے محسنین کے مزارات کسمپرسی کی حالت میں موجود ہیں جن کے عظیم احسانات سے ہم صرف نظر نہیں کر سکتے۔ آخر یہ احسان کیا کم ہے کہ اہل لاہور کو اسلام کی نعمت انہی بزرگوں کی کوشش سے حاصل ہوئی!

آپ کے لقب "مرشد پنجاب" ہی سے آپ کا سنہ وفات برآمد ہوتا ہے۔

بیبیاں پاک دامن

حضرت سید احمد توختہ کی چھ صاحبزادیاں (1) بی بی حاج (2) بی بی تاج (3)

بی بی حور (4) بی بی نور (5) بی بی گوہر (6) بی بی شہناز بھی بہت نیک اور عبادت گزار تھیں۔ حضرت توختہ کے فیض تربیت سے ان کا سارا گھرانہ زہد و تقویٰ کا نمونہ تھا۔ سید احمد توختہ مردوں میں اور ان کی پاک دامن بیٹیاں عورتوں میں رشد و ہدایت کا نور پھیلاتیں۔ اہل لاہور کے گھرانے دن رات سادات کے اس مرکز نور سے اسلام کی روشنی حاصل کرتے تھے۔ انہی بیبیوں کے باعث آپ کا محلّہ "چلہ بیبیاں" کے نام سے مشہور تھا اور آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ "بزرگان لاہور" میں ہے کہ حضرت سید احمد توختہؒ کی صاحبزادیوں میں سے بی بی حاج اور بی بی تاج تو بیاہی گئیں' لیکن باقی چار صاحبزادیاں جو نہایت عابدہ اور رابعہ عصر تھیں' ناکتخدا رہیں۔

516ھ مطابق 1298ء میں پنجاب پر تاتاریوں کے حملے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ لوگ آئے دن پنجاب اور سندھ پر یلغار کرتے اور لوٹ مار کا بازار گرم کرتے تھے۔ انہوں نے پنجاب کے کئی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ بقول کنہیا لال انہوں نے لاہور پر دس حملے کیے۔ سب سے بڑا حملہ جمادی الاول 639ھ / دسمبر 1241ء کو کیا۔ لاہور کے حاکم ملک اختیار الدین نے شہر کو بچانے کی کوشش کی' لیکن آخر مقابلے کی تاب نہ لا کر دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ تاتاریوں نے کئی ماہ تک لاہور کا محاصرہ جاری رکھا اور پھر ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر ڈالا۔ اب ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا اور کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

اس حملے سے کچھ عرصہ قبل حضرت احمد توختہ ترمذی کی بیٹیاں اپنی قیام گاہ "چلہ بیبیاں" (اندرون اکبری گیٹ) سے نکل کر شہر لاہور سے باہر قیام پذیر ہو گئیں اور لوگوں سے دور عبادت الٰہی میں مشغول رہنے لگیں۔ جب منگول وحشیوں نے لاہور میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو حضرت سید احمد توختہ رحمتہ اللہ علیہ کی یہ تمام بیٹیاں نہایت پریشان ہوئیں اور نامحرم وحشیوں کے ہاتھوں بے پردگی کے خوف سے انہوں نے بارگاہ الٰہی میں مل کر دعا کی:

"بار الٰہی! ہمیں ان ظالم وحشی منگولوں کے ہاتھوں بے پردہ ہونے سے بچا' اپنی زمین کو حکم دے کہ وہ ہمیں اپنے اندر سما لے۔" (بزرگان لاہور: ص 225)

خدا کی قدرت ایسا ہی ہوا' زمین جگہ جگہ سے پھٹ گئی وہ تمام بیبیاں اپنی خادماؤں سمیت زمین میں سما گئیں۔ جب امن و امان قائم ہوا تو ان پاکدامن بیبیوں کی اصل قیام

گاہ (محلّہ چلہ بیبیاں) کے مکینوں نے یہاں پہنچ کر قبریں بنادیں۔ آج ایمپریس روڈ لاہور کے علاقہ "بیبیاں پاک دامن" میں حضرت توختہ" کی ان بیٹیوں کے مزارات زیارت گاہ خلق ہیں۔

نور احمد چشتی کی روایت

حضرت سید احمد توختہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کی عبادت گزار اور پاک دامن صاحبزادیوں کے حالات طیبات سیرت و تذکرہ کی تمام اہم کتب میں موجود ہیں' لیکن حیرت ہے کہ "تحقیقات چشتی" کے مؤلف نور احمد چشتی نے بالکل الگ حالات بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ پاک دامن بی بیاں حادثہ کربلا کے بعد ہندوستان تشریف لائی تھیں۔ نور احمد چشتی کی بیان کردہ اس روایت کی تائید کسی سابقہ یا معاصر یا بعد میں لکھی گئی سیرت و تذکرہ کی کتاب سے نہیں ہوتی۔ نور احمد چشتی کی یہ "تحقیق" آپ کی خدمت میں من و عن پیش ہے۔ تاہم راقم کے مطابق صحیح حالات وہی ہیں' جو اوپر درج کر دیئے گئے ہیں:

"یہ چھ بیبیاں' ایک جناب مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ کی صاحبزادی ہمشیرہ جناب حضرت عباس ؓ کے موسوم باسم رقیہ المشہور بی بی حاج اور پانچ صاحبزادیاں حضرت عقیل رضؓ برادر حضرت علی المرتضٰی علیہ السلام کے جن کے نام یہ ہیں' حضرت بی بی تاج' حضرت بی بی حور' حضرت بی بی نور' حضرت بی بی گوہر' حضرت بی بی شہناز ہمشیرگان حضرت مسلمؓ۔

حضرت بی بی رقیہ المشہور بی بی حاج صاحبہ منکوحہ جناب مسلمؓ تھیں۔ کہتے ہیں کہ جب امام ہمام سید الانام' شاہ کربلا غریب پر جفا یعنی حضرت سید الکونین امام حسین رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے روانہ کوفہ حسب الطلب کوفیاں ہوئے تو یہ بیبیاں بھی ہمرکاب تھیں۔ نہم محرم الحرام کو جناب امام ہمام نے حسب ایماء باطنی جناب مرتضوی کے ان چھ بیبیاں کو ارشاد فرمایا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ انہوں نے عرض کی کہ یا اخی! ہم تم کو ایسے حال پر اختلال میں چھوڑ کر کہاں جاویں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر ایسا کریں تو بروز قیامت جناب بی بی فاطمہ ؓ کو کیا منہ دکھلاویں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اے نور چشماں میں مجبور ہوں۔ حکم مرتضوی ایسا ہی ہے۔ مراقبہ کر کے دیکھ لو۔ ناچار مجبور بیبیاں نے عرض کہ اچھا ہم تابعدار ہیں۔ جہاں حکم ہو چلے جاویں۔ آپ نے فرمایا کہ ہند جانے کا تم کو ارشاد ہے۔ پھر

انہوں نے عرض کی کہ ہمارے دونوں فرزند آپ کے پاس رہیں تاکہ آپ کے قدموں پر شہادت پائیں۔ بعد رد و کد حضرت نے قبول فرمایا۔

لاہور میں تشریف آوری

اور بیبیاں وہاں سے رفتہ رفتہ ہند ہوئیں۔ دوسرے روز واقعہ ہائلہ جاں گداز شہادت حضرت سید مظلوم کا سنا۔ بہت گھبرائیں مگر بخیال تعمیل حکم چلی آئیں حتیٰ کہ لاہور میں آ پہنچیں اور یہاں بمقام خانقاہ ایک وقت ایک ٹیلہ تھا اس پر آ ٹھہریں۔

اس زمانہ میں گرد و نواح اس مقام کے کوئی کوئی ٹھٹھی یعنی بستی راجوں کی تھی۔ جب یہ بیبیاں یہاں پہنچیں تو بمجرد برکت قدوم اہل بیت رسول کے ان راجوں کے آتش کدے سرد ہو گئے اور بتوں میں فتور اور خلل برپا ہوا تو انہوں نے جوتشیوں سے باعث اس تہلکہ کا پوچھا۔ سب نے بعد سوچ بچار کے کہا کہ یہاں کوئی عرب ترک اولاد رسول اللہ ﷺ آئے ہیں یہ ان کی برکت کا اثر ہے۔ انہوں نے بعد دریافت حال ان کی طلب کے واسطے ملازم بھیجے تاکہ ان کو بلا لائیں۔ اس امر سے یہ بیبیاں حیران ہوئیں کہ یا الٰہی ہم ستم رسیدہ ہیں۔ اول جدائی برادران اور واقعہ کربلا ہوا اور ملک بے گانہ۔ حتیٰ کہ کوئی ہماری بولی بھی نہیں سمجھتا۔ اس لئے آپ ان کے پاس تشریف نہ لے گئیں۔ جب یہ خبر راجوں کو پہنچی کہ وہ تشریف نہیں لائیں۔ تو ان کے سردار نے ولی عہد کو بھیجا اور کہا یا تو ان کو اپنے ہمراہ لانا یا اپنی قلمرو سے نکال آنا۔

اور نام اس راجہ کا برماستری تھا اور بعضوں کے نزدیک مہابرن اور اس کے بیٹے کا نام بکرما سہائے۔ راوی کہتا ہے کہ جب بی بی صاحبان یہاں تشریف لائی تھیں تو اس وقت سات سو چار آدمی ولی اللہ حافظ قرآن بزرگ ان کے ہمراہ تھے۔

جب وہ کنور حضرت کے پاس آیا اور حکم راجہ کہہ سنایا تو آپ نے پہلے منت سماجت کی۔ کہ بابا ہم غریب مسافر' ستم رسیدہ اور بے خانماں ظلم کشیدہ' ازحد بے کس ہیں۔ برائے خدا ہم کو تکلیف نہ دو۔ اگر تم ہمارے یہاں رہنے سے ناراض ہو تو ہم چلی جاتی ہیں اور ماسوا اس کے ہمارے مذہب میں ستر داری کا حکم بتاکید اکید جاری ہے۔ اس واسطے ہم راجہ تک نہیں جا سکتے۔ اس نے کہا کہ میں مجبور ہوں اور راجہ صاحب کی طرف سے آپ کو لے جانے پر مامور ہوں۔

آخر بی بی صاحبہ کلاں نے راجہ کے لڑکے کو اپنے پاس طلب کیا اور ایک نظر توجہ سے اس کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو رویا اور حضرت کے قدم مبارک پر گر کر درخواست تعلیم و تلقین دین اسلام کی کی اور صدق دل سے مسلمان ہوا۔

جب یہ خبر راجہ کو پہنچی تو وہ نہایت متردّد ہوا۔ تمام ہندوؤں نے بلوا کر شورش برپا کر دی۔ اس سے بی بی صاحبان بہت خائف ہوئیں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ یا اللہ! ابھی خوف حادثہ کربلا ہمارے دلوں سے نہیں گیا کہ یہ دوسرا حادثہ عظیم برپا ہوا ہے۔ ہم چاہتی ہیں کہ ہم پس پردہ ہو جائیں۔ یا الٰہی! زمین کو حکم دے کہ ہم کو امان دے۔ یہ دعا ان کی قبول ہوئی اور اسی وقت زمین بازتئین شگاف ہو گئی اور تمام بیبیاں اس میں سما گئیں اور پوشیدہ ہونے سے پہلے بہت سے اشخاص ہمراہیان کو آپ نے رخصت عنایت کی اور فرمایا کہ اپنے اپنے وطنوں کو چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اتباعاً للحکم چلے گئے اور صرف چار حافظ جن کے نام یہ ہیں۔ ابوالفتح' ابوالفضل' ابوالمکارم' عبداللہ۔ حضرات کی خدمت میں باقی رہے۔ اور قبریں ان کی قبر بیوی نوری کے غرب رویہ موجود ہیں اور وہ بھی آپ کے ساتھ ہی زمین میں سما گئے۔

جب اس کنور نے یہ کرامت ان کی دیکھی تو صدق دل سے فقیر ہو گیا اور مجاور ہو بیٹھا۔ اس وقت حضرت بیبیاں کے دوپٹوں کے پلے بروئے زمین نظر آتے تھے۔ اس نے ان ہی نشانوں پر قبور بنائیں۔ چند روز بعد وہ پلے نظر آتے رہے اور پھر وہ بھی ناپید ہو گئے۔" (تحقیقات چشتی از نور احمد چشتی ص 161)

نور احمد چشتی نے یہ دلچسپ روایت بغیر کسی سند اور حوالے کے تحریر کر دی ہے۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء نے یہی قصہ مختصراً درج کر کے لکھا ہے کہ یہ عام روایت لوگوں کی زبانی ہے (یعنی اس کی تاریخی حیثیت کوئی نہیں) ذرا غور فرمائیں کہ ان چھ بیبیوں کے اسمائے گرامی (بی بی حاج' بی بی تاج' بی بی نور' بی بی گوہر اور بی بی شہناز) جو بیان ہوئے ہیں' کیا یہ عربی نام ہیں۔ بی بی گوہر اور بی بی شہناز تو خالصتاً ایرانی نام ہیں۔ ان پر غور کرنے سے ہی چشتی صاحب کی روایت کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ چشتی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بی بی حاج کے نام سے مشہور تھیں لیکن اس کی تائید بھی تاریخ کی کسی کتاب سے نہیں ہوتی۔ سب اہل علم واقف ہیں کہ حضرت

سیدنا علی المرتضیٰؓ کی دوسری صاحبزادی سیدہ رقیہؓ صغریٰ زوجہ حضرت عبدالرحمنؓ بن عقیل کا مزار مقدس مصر میں ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔ ان کا ذکر پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف کی مطبوعہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد: 15 میں موجود ہے۔

منشی محمد دین فوق کی رائے

"بی بی پاک داماں کا ذکر تحقیقات چشتی کے حوالہ سے راقم نے اپنی تصنیف "یاد رفتگاں" 1904ء میں تفصیل سے لکھا تھا۔ اس وقت تک سب کا خیال تھا کہ ان بیبیوں میں جن کی تعداد چھ بتائی جاتی ہے۔ ایک بی بی حاج نام حضرت علیؓ کی بیٹی تھیں اور پانچ بی بیاں ان کے بھائی حضرت عقیل کی صاحبزادیاں تھیں۔ جو واقعہ کربلا کے بعد اپنی جان بچا کر لاہور آگئی تھیں اور لاہور میں چونکہ اس زمانہ میں ہندو راجگان کی حکومت تھی۔ اس لیے وہ ان کے خوف سے دعا کر کے زمین میں سما گئیں۔ راقم نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں صاحب تحقیقات (چشتی) کی اس تحقیقات کو ناقابل یقین سمجھ کر اس پر شبہ ظاہر کر دیا تھا۔ اب مزید تفصیلی حالات (مندرجہ تاریخ جلیلہ) سے ظاہر ہوا ہے کہ ان بیبیوں میں جن کے نام تاج' حاج' حور' نور' گوہر اور شہناز تھے نہ کوئی حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھی' نہ عقیل کی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت جب لاہور میں کوئی مسلمان ہی نہ تھا تو ان کو اپنے وطن سے ہزارہا میل دور یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی اور پھر وہ عورتیں اپنی تنہائی اور بے کسی کے عالم میں اتنی دور صحیح سلامت کس طرح پہنچ گئیں۔ لاہور کی نسبت کوفہ' شام یا حرمین الشریفین میں جا کر زیادہ محفوظ رہ سکتی تھیں۔ جو کربلا سے نزدیک تر مقامات تھے۔ لاہور میں تو ان کی کوئی زبان بھی نہ جانتا تھا۔ پھر تاج' گوہر اور شہناز وغیرہ نہ عربی نام ہیں نہ اس زمانہ کی عربی میں یہ نام مروج تھے۔" (مآثر لاہور: منشی محمد دین فوق شائع شدہ در نقوش لاہور نمبر صفحہ 158)

حضرت سید یعقوب زنجانی رحمتہ اللہ علیہ
المعروف "صدر دیوان رحمتہ اللہ علیہ"

(المتوفی 604ھ)

آپ کا اسم گرامی سید یعقوبؒ اور والد ماجد کا نام نامی سید علی حسینیؒ تھا۔ سولہ واسطوں سے سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم (م 186ھ) سے جاملتا ہے۔

آپ علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور صاحب حال و قال بزرگ تھے۔ سلسلہ جنیدیہ میں اپنے والد بزرگ سے بیعت تھے (حدیقۃ الاولیاء) آپ کا شمار لاہور کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ آپ ایک اشارۂ غیبی کے تحت ترکستان سے متحدہ ہندوستان میں تشریف لائے اور لاہور میں سکونت اختیار فرمائی۔ نزہتہ الخواطر (جلد اول) اور تاریخ لاہور (کنہیا لال) کے مطابق 535ھ مطابق 1140ء میں لاہور تشریف لائے اور رشد و ہدایت کا بازار گرم کیا۔ کئی کرامات آپ سے ظاہر ہوئیں۔ اس وقت بہرام شاہ غزنوی کی طرف طغرل پنجاب کا حاکم تھا' وہ آپ کا معتقد ہوا تو بے شمار خلقت آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئی۔ کئی علماء و مشائخ نے بھی آپ سے استفادہ کیا۔

آپ کے علم و فضل' زہد و اتقاء اور کرامات و خوارق کی شہرت لاہور سے باہر پورے پنجاب میں پھیل گئی تھی۔

بعض لوگ آپ کو حضرت سید علی ہجویریؒ کا پیر بھائی کہتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ تحقیقات چشتی کے مطابق آپ اور حضرت شاہ حسین زنجانیؒ ایک ہی قافلے میں ہندوستان پہنچے تھے۔ عجیب بات ہے کہ چشتی صاحب حضرت یعقوب زنجانیؒ اور شاہ حسین زنجانیؒ کے ایک ساتھ لاہور پہنچنے کی خبر بھی دیتے ہیں اور شاہ حسین زنجانی کے

431ھ میں وفات پانے کا حال بھی بتاتے ہیں۔ پھر طرفہ یہ کہ 535ھ میں دونوں اصحاب (حضرت یعقوب زنجانی اور حضرت حسین زنجانی) کے لاہور میں اکٹھے وارد ہونے کا بھی لکھتے ہیں۔ بہرحال چشتی صاحب کی یہ روایت کہ دونوں زنجانی حضرات ایک ساتھ لاہور پہنچے۔ درست روایت ہے جس کی دوسرے مورخین بھی تائید کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ زمانہ حضرت سید علی ہجویری" کے وصال سے کم از کم ایک سو سال بعد کا ہے۔

"بزرگان لاہور" کے مؤلف غلام دستگیر نامی کے مطابق جب حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری" لاہور تشریف لائے اور مخدوم سید علی ہجویری" کے مزار گوہربار پر اعتکاف کیا' تو ان کا حضرت سید یعقوب زنجانی" سے رابطہ محبت پیدا ہوا اور باہم صحبتیں رہیں۔ (نیز ملاحظہ ہوں تحقیقات چشتی' خزینۃ الاصفیاء)

آپ کا سال وصال جس پر تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ 16 رجب 604ھ (مطابق 6 فروری 1208ء) ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں آپ کی تاریخ وفات یوں منظوم کی ہے۔

چو زنجانی ازیں دنیا سفر کرد
بہ حُبّ ایزدی گر دید محبوب
"شہ مقبول زنجانی" رقم شد
وصالِ آں شہ دیں' شیخ مطلوب
بگو "مسعود مہدی"۔ "صدرِ دیواں"
دگر فرما "مقدس پیر یعقوب"

(604ھ)

آپ کا مزار پر انوار ہسپتال روڈ پر (نزد لیڈی ایچی سن ہسپتال) زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت سید عزیز الدین جنیدی المعروف پیر مکی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 612ھ/1215ء)

چھٹی صدی ہجری اپنا تین چوتھائی سفر مکمل کر چکی تھی۔ حرم کعبہ میں دن رات عبادت کرنے والے اللہ کے ایک بندے کو اشارۂ غیبی سے حکم ملا کہ تم اب تبلیغ اسلام کی غرض سے ہندوستان چلے جاؤ کیونکہ اس ظلمت کدۂ کفر میں شمع توحید روشن کرنے کی سعادت جن خوش قسمت اصحاب کے حصے میں آئی ہے' تم بھی انہی میں شامل ہو۔ یہ بزرگ جو گزشتہ بارہ سال سے حرم شریف میں عبادت میں مصروف تھے' یہ اشارۂ غیبی ظاہر کر رہا تھا کہ اب وہ زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مکمل و اکمل ہو چکے ہیں۔ وہ تمام مرحلے جو سیرت سازی کے لیے ضروری ہیں' انہوں نے طے کر لیے ہیں' اب ان سے تبلیغ دین کا عظیم کام لیا جائے گا۔ یہ اشارۂ غیبی ملتے ہی یہ بزرگ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ پہنچے۔ رسالت پناہ ﷺ کے حضور صلوٰۃ و سلام پیش کیا' یہاں سے بھی یہی حکم ہوا کہ تم اب ہندوستان روانہ ہو جاؤ اور کفر و ضلالت میں بھٹکتے ہوئے انسانوں کو ہدایت کا راستہ دکھاؤ۔

اللہ کے یہ ولی جن کو بطور خاص تبلیغ دین کے لیے ہندوستان جانے کا حکم ملا' حضرت سید عزیز الدین جنیدیؒ تھے' جو بارہ برس مکہ معظمہ میں مقیم رہے اور ریاضت و عبادت میں مشغول رہنے کی وجہ سے "پیر مکی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت سید عزیز الدینؒ کا سال ولادت ان کے کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا' لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سن ولادت کا شرف 535ھ سے 545ھ کے

درمیان کسی سال کو حاصل ہے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید عبداللہ تھا' جو بغداد کے ایک نواحی گاؤں میں کھانے پینے کی اجناس فروخت کرتے تھے۔ یہیں حضرت سید عزیز الدین ؒ کی ولادت ہوئی اور ابتدائی دینی تعلیم پائی۔ ہوش سنبھالا تو والد ماجد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے۔

کاروبار کے سلسلے میں آپ اکثر بغداد آتے جاتے رہتے تھے' یہیں ایک روز آپ کی ملاقات ایک بزرگ حضرت جنیدیؒ سے ہوئی' ان کا اسم گرامی بھی کسی تذکرہ میں نہیں ملتا' بس یہی لکھا ہے کہ یہ سلسلہ جنیدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا سلسلہ طریقت چند واسطوں سے حضرت جنید بغدادیؒ سے مل جاتا تھا' اس نسبت سے لوگ انہیں حضرت جنیدیؒ کے نام سے پکارتے تھے۔ حضرت سید عزیز الدینؒ کی حضرت جنیدیؒ سے ملاقات ہوئی تو وہ ان سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے مرید ہو گئے۔ حضرت جنیدیؒ نے فرمایا کہ انسان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی تلاش ہونا چاہیے۔ جس شخص کو اللہ مل جائے' سمجھو کہ اسے ہر شے مل گئی' کیونکہ اس کائنات کی ہر شے کا مالک وہی ہے۔

مالک ارض و سما بن جائے جس بندے کا دوست
پھر تو یہ سمجھو ہے اس کے تصرف میں یہ ساری کائنات

جواں سال سید عزیز الدین پر مرشد کامل کے ان الفاظ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ والدین سے اجازت لے کر بغداد سے حج کے لیے جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے اور 562ھ مطابق 1166ء میں منزل بہ منزل مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اس سال حج کیا اور پھر بارہ سال تک مکہ معظمہ ہی میں رہے۔ حرم شریف میں حاضر ہونے والے اہل اللہ سے استفادہ کرتے' حرم شریف میں جاروب کشی کرتے اور دن رات عبادت میں مشغول رہتے۔ حتیٰ کہ آپ کو ہندوستان جانے کا اشارہ ہوا اور آپ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے 575ھ مطابق 1197ء کو لاہور پہنچے۔ اس وقت لاہور کا حاکم خسرو ملک غزنوی تھا' جو خاندان غزنویہ کا آخری حکمران تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء)

یہ وہ دور تھا' جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے لاہور کا محاصرہ کر رکھا تھا اور وہ رات دن اس کو فتح کرنے کی فکر میں تھا' ہر طرف سیاسی افراتفری اور انتشار کا عالم تھا' حاکم لاہور خسرو ملک کو جب یہ معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ سے کوئی ولی کامل لاہور آئے ہیں' تو وہ دعا کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت پیر مکیؒ نے اسے تسلی دیتے

ہوئے فرمایا: فکر نہ کرو' اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں چھ سال تک کے لیے امان ہے' اس کے بعد اس اقلیم پر شاہان غوری کا قبضہ ہو جائے گا۔ حضرت کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ پورے ہوئے اور سلطان شہاب الدین اس سال لاہور سے ناکام واپس چلا گیا۔ چھ سال بعد وہ دوبارہ سیالکوٹ کے راستے حملہ آور ہوا۔ پہلے اس نے سیالکوٹ میں قلعہ تعمیر کیا اور پھر لاہور کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔

لاہور میں حضرت پیر مکی ؒ نے اس جگہ جہاں آج آپ کا مزار مبارک ہے۔ سجادۂ ہدایت بچھایا اور حسب القائے ربانی تبلیغ دین کا آغاز کیا۔ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں آتے اور ہدایت پاتے۔ آپ نے بے شمار مخلوق کو اسلام کی دولت سے مالا مال فرمایا۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء کے مطابق آپ کا وصال 612ھ مطابق 1215ء میں ہوا۔ آپ کو اسی حجرہ میں دفن کیا گیا جہاں آپ نے چھتیس برس تک خلق خدا کی ہدایت کا عظیم فریضہ انجام دیا تھا۔ اس وقت ہندوستان پر سلطان شمس الدین التمش حکمران تھا۔

خزینۃ الاصفیاء میں آپ کا یہ مادۂ تاریخ درج ہے۔

ز دنیا چو شد در بہشت معلّٰی
شہِ دین و شیخ زمن پیر مکی
وصالش بگو "آفتاب حسین"
بخواں نیز "پیر حسن پیر مکی" 612ھ

612ھ

آپ کے لوح مزار پر یہ شعر مرقوم ہے۔

جلوۂ نورِ خدا' سر چشمۂ صدق و صفا
پیرِ مکی' آں عزیز الدّیں چراغِ اولیاء

عوام میں یہ بات بالکل غلط مشہور ہے کہ حضرت پیر مکی ؒ حضرت داتا گنج بخش ؒ کے استاد تھے یا ان کے ہم عصر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت پیر مکی ؒ اور حضرت داتا گنج بخش ؒ کے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو سال کا بعد زمانی پایا جاتا ہے۔ حضرت داتا صاحب کا وصال 465ھ میں ہوا جبکہ حضرت پیر مکی کا وصال 612ھ میں ہوا۔

اس طرح عوام میں یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اجناس میں سے مکئی یا مکی کے ساتھ حضرت کا کوئی خصوصی تعلق ہے۔ اسی لیے مزار شریف پر حاضر ہونے والے اکثر لوگ

نذر کے طور پر مکئی کے دانے پلے کر آتے ہیں حالانکہ حضرت کو مکی محض مکہ معظمہ کی نسبت سے کہا جاتا ہے۔

رحمتیں برسیں لحد پر ان کی، عابدؔ بے شمار
جن کی ہر ہر سانس تھی وقفِ خدائے کردگار

حضرت پیر بلخی شہید رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 639ھ)

حضرت پیر بلخی کے تفصیلی حالات کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ "حدیقۃ الاولیاء" اور "تاریخ لاہور" وغیرہ کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے' لیکن کسی کتاب سے بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا اصل نام کیا تھا' وہ کب کس سنہ میں ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ البتہ یہ سب نے لکھا ہے کہ وہ بلخ سے تشریف لائے تھے۔ "مآثر لاہور" میں حضرت کے جو حالات درج ہیں' ان کی تلخیص درج ذیل ہے:

"صاحب "حدیقۃ الاولیاء" کی تحریر (ص 168) سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خان کے تصرف بلخ کے بعد آپ اپنا وطن ترک کر کے لاہور آ گئے۔ چونکہ بلخ شاہ خوارزم کے ماتحت تھا' اس لئے شاہ خوارزم بھی لاہور آ گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ چنگیز خان کی فوج میرا تعاقب کر رہی ہے' تو وہ لاہور سے دہلی چلا گیا۔ چنگیز خانیوں نے لاہور کا محاصرہ کر لیا اور اسی محاصرہ میں پیر بلخی اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ہمراہ کفار مغل و تاتار سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

لیکن تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ خوارزم کو لاہور آنے کا موقع ہی نہیں ملا' اور چونکہ وہ لاہور نہیں آیا' اس لئے تعاقب کنندگان بھی لاہور نہیں آئے۔ شاہ خوارزم کے ورود ہند کا واقعہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد (618ھ مطابق 1221ء) میں ہوا ہے۔ شاہ خوارزم جس کا نام سلطان جلال الدین تھا' چنگیز خان کے خوف سے' جس کا مذہب یہ تھا کہ شہروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دے اور جس کا ایمان یہ تھا کہ مفتوحہ ممالک کی نسل انسانی کو خاک و خون مین ملا دے۔ اپنا ملک تباہ و غارت کرا کے سندھ کی طرف نکل آیا۔ تاتاری اور مغل بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے ہی پہنچے۔

سلطان شمس الدین التمش کو خبر ہوئی تو اس نے طوفان چنگیز خانی سے' جو اپنے ہلاکت آفریں اثر کے لحاظ سے طوفان نوح سے کم نہ تھا' نجات حاصل کرنے کے لیے شاہ خوارزم کو کہلا بھیجا کہ اس ملک کی آب و ہوا آپ کے مزاج کے موافق نہیں۔ مطلب سمجھ گیا اور سیستان اور کیچ مکران کی راہ سے ہندوستان سے باہر چلا گیا اور مغلوں کی فوج بھی واپس چلی گئی۔ تاریخی واقعات کی رو سے شاہ خوارزم نہ لاہور آیا ہے' نہ لاہور سے دہلی گیا ہے' اور نہ چنگیز خاں نے لاہور کا محاصرہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیر بلخی درویش صفت بزرگ تھے' وہ سندھ سے لاہور چلے آئے اور خوارزم شاہ کے ساتھ نہیں گئے' جو چنگیز خاں کے خوف سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

مصنف "تاریخ لاہور" پیر بلخی کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ لاہور میں آکر مقیم ہو گئے اور جب چنگیز خاں کے پوتے قلی خاں نے لاہور پر حملہ کیا تو بادشاہ دہلی کی فوج میں شامل ہو کر جن مقامی لوگوں نے داد شجاعت دی' ان میں پیر بلخی بھی تھے' جو اس لڑائی میں درجہ شہادت کو پہنچے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ التمش کی وفات 21 شعبان 633ھ مطابق 1236ء کے بعد تاتاریوں اور مغلوں نے لاہور پر کب یورش کی۔ سلطان معزالدین بہرام شاہ اپنی بہن سلطانہ رضیہ کو پہلے گرفتار اور بعد میں قتل کرانے کے بعد 639ھ مطابق 1239ء میں بادشاہ ہوا۔ تاریخ ہندوستان میں اس بادشاہ کے عہد کا جو سب سے عظیم واقعہ درج ہے' وہ ترکوں کا حملہ لاہور ہے۔ اس زمانے میں بہرام شاہ کی طرف سے لاہور (یعنی صوبہ پنجاب) کا گورنر قراقش نامی ایک سردار تھا۔ چنگیز خانی مغلوں نے خراسان اور غزنی سے نکل کر لاہور کو گھیرے میں لیا اور کئی مہینے تک لاہور کا محاصرہ کئے رکھا۔ قراقش اپنی فوج کو لے کر کسی نہ کسی طرح نکل کر سیدھا دہلی چلا گیا۔ اس لئے 16 جمادی الآخر 639ھ کو مغلوں نے جو سب کے سب غیر مسلم تھے مسلمانوں اور عام باشندوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ گویا مغلوں نے التمش کے زمانہ (618ھ) میں نہیں بلکہ اس کے فرزند بہرام شاہ کے زمانے (639ھ) میں اکیس سال کے بعد لاہور کو غارت کیا ہے' اور چونکہ پیر بلخی 618ھ کے زمانہ ہی سے لاہور میں مقیم تھے۔ اس لئے اس عرصہ میں ان کی عبادت و ریاضت کی وجہ سے اکثر لوگ ان کے ارادت مند ہو چکے ہوں گے' انہوں نے بھی اس جنگ میں جو مغل کفار اور مسلمانوں کے درمیان تھی مرد غازی کی طرح شرکت کی اور درجہ شہادت کو

پہنچے۔

آپ کے مزار پر جو تختۂ چوبی آویزاں ہے' اس پر آپ کا سن وفات 1211ء لکھا ہوا ہے' لیکن لاہور میں وہ 1221ء میں بزمانہ التمش آتے ہیں اور 1239ء میں بزمانہ بہرام شاہ جنگ مغولاں میں شہید ہو جاتے ہیں اس لئے 1211ء کو ان کا سال شہادت قرار دینا قطعاً غلط ہے۔

جس جگہ آج ان کا مقبرہ ہے' اسی جگہ ان کا حجرہ تھا۔ یہیں ان کو دفن کیا گیا۔ اس واقعہ کے پانچ سو سال بعد نواب بھکاری خاں رستم جنگ امیر الامرائے لاہور نے جب میر معین الملک عرف میر منو کے زمانہ میں سنہری مسجد تعمیر کرائی اور اس کی زینت کے لیے بازار کو سیدھا کرنا چاہا تو یہ مزار سر راہ آگیا۔ مزار کا بہت سا حصہ تو گرا دیا گیا لیکن نواب نے حجرہ کو جس کے اندر پیر بلخی مدفون تھے' محرابی دروازہ بنا کر پختہ کمرہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ آپ کا مزار کشمیری بازار میں سرراہ واقع ہے اور دہلی دروازہ سے شہر جاتے ہوئے بائیں ہاتھ آتا ہے۔"

منشی فوق کے اس مضمون کے آخر میں محمد عبداللہ قریشی مرحوم نے ان سطور کا اضافہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس تحقیقی مضمون میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری خوش قسمتی سے لاہور عجائب گھر میں ایک عربی کتبہ موجود ہے' جس پر کوفی و نسخی خط میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے۔ یہ غالباً پیر بلخی کے مزار ہی کا پتھر ہے۔

"هذا مقبرة الشيد الشيخ ابو المحامد الحسن ابن محمد الحسين ابوبكر الذكرى البلخى رحمته الله وقد عاش ثمانيه وتسعين سنة وفات فى يوم الجمعة التاسع من ذى الحجه و هى يوم عرفه من ثلثة واربعين وستمائة۔"

ترجمہ: یعنی یہ مقبرہ شیخ ابوالحامد الحسن بن محمد الحسین ابوبکر الذکری البلخی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ تحقیق وہ سن 98 میں زندہ تھے اور 643ھ میں جمعہ کے روز 9 ذی الحجہ کو جو عرفہ کا دن تھا' شہید

ہوئے۔

اس کتبے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا اسم گرامی حسن تھا اور کنیت ابوالحامد۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام محمد الحسین ابوبکر تھا۔ آپ بلخ کے رہنے والے تھے۔ 598ھ میں لاہور تشریف لائے اور یہیں 643ھ میں جمعہ کے روز 9 ذی الحجہ کو شہید ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب لاہور میں سنہری مسجد تعمیر کی گئی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سڑک کو سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو مزار کو چھوٹا کیا گیا اور اسی شکست و ریخت میں کتبہ یہاں سے خردبرد ہو کر کسی طرح عجائب گھر میں پہنچ گیا' جہاں اب تک محفوظ ہے۔"

پروفیسر محمد اسلم مرحوم نے بھی "خفتگان خاک لاہور" میں پیر بلخی کے حالات لکھتے ہوئے یہی کتبہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کتبے سے پہلی بار پیر بلخی۔ کا نام اور ولدیت معلوم ہوئی ہے۔ پروفیسر محمد اسلم نے غالباً عبداللہ قریشی صاحب کی تحریر سے استفادہ کیا ہے۔

مصنف "الکمال" کا تبصرہ

کتاب "الکمال" کے مصنف سید خورشید حسین بخاری نے عبداللہ قریشی مرحوم کی مندرجہ بالا عبارت کو محض ظن و تخمین پر مبنی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے جس کتبے کو لاہور کے پیر بلخی کا کتبہ بتایا ہے وہ دراصل کیتھل (بھارت) کے شیخ صلاح الدین حسن کے مزار کا کتبہ ہے۔ اپنی کتاب میں عبداللہ قریشی مرحوم کی تمام عبارت درج کرنے کے بعد بخاری صاحب لکھتے ہیں:

"کتبے کے بارے میں محمد عبداللہ قریشی کا بیان محض ظن و تخمین پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتبہ کیتھل (بھارت) کے شیخ صلاح الدین حسن بلخیؒ کے مزار کا ہے' جسے محمد عبداللہ قریشی نے غلطی سے لاہور کے پیر بلخی سے منسوب کر دیا ہے۔ نزہتہ الخواطر میں شیخ صلاح الدین حسن بلخی کے حالات دیئے گئے ہیں' اس میں بھی شیخ صلاح الدین حسن بلخی کے کتبے کی اس عبارت کا ذکر موجود ہے جس کا تذکرہ محمد عبداللہ قریشی نے کیا ہے۔

"دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے ان شیخ بلخی کا مزار آٹھ ستونوں پر مشتمل تھا اور یہاں ایک عربی کتبہ نصب تھا' ان آٹھ ستونوں کی مناسبت سے لوگ شیخ بلخی کو "آٹھ تھمبا

پیر" بھی کہتے تھے۔ یہ کتبہ بہت پرانا ہونے کی وجہ سے گر گیا تھا' چنانچہ حکومت نے آثار قدیمہ کے تحت اسے لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منشی محمد دین فوق نے اپنی کتاب "مآثر لاہور" میں اس کتبہ مزار کا ذکر ضروری نہیں سمجھا۔ علاوہ ازیں "تاریخ لاہور" کے مصنف نے پیر بلخی کا سال وصال 639ھ تحریر کیا ہے اور محمد دین فوق نے اسی کو تسلیم کیا ہے جبکہ کیتھل کے شیخ بلخی کا سن وصال 643ھ ہے۔ ان شواہد کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ محمد عبداللہ قریشی نے جس کتبہ کو لاہور کے پیر بلخی سے منسوب کیا ہے' درحقیقت اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں' بلکہ وہ کیتھل (بھارت) کے شیخ صلاح الدین حسن بلخی کے مزار کا کتبہ ہے۔"

حضرت پیر بلخی شہید کا مزار مبارک کشمیری بازار میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت سید مٹھا لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 661ھ 1263ء)

آپ کا اصل نام سید معین الدین ابی غفار حسینی اور والد ماجد کا اسم گرامی سید جمال الدین تھا آپ اپنے وقت کے اکابر اولیاء و مشائخ میں سے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تک اس طرح پہنچتا ہے:

حضرت سید مٹھا بن جمال الدین بن محمد بن کریم الدین بن نور الدین بن آدم بن علی جعفر بن سید محمد بن یوسف بن محمود بن احمد بن عبداللہ اسقری بن جعفر بن محمد الجواد بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن حضرت امام حسین بن سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

سادات کا یہ خاندان خوارزم میں سکونت پذیر تھا۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں چنگیز خان کی قتل و غارت گری سے جب یہ علاقہ تباہ ہوا اور مسلمان بے دریغ گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے اور وہاں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی تو حضرت سید مٹھا کے والد ماجد سید جمال الدین خوارزم سے ہندوستان آئے اور لاہور میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت ہندوستان پر سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی۔ اہل لاہور جمال الدین کے علم و عمل اور زہد و تقویٰ سے بہت متاثر ہوئے اور جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہونے لگے۔ خوارزم سے ہجرت کے دوران سید جمال الدینؒ کے بیٹے سید مٹھا بھی ان کے ہمراہ تھے۔ حضرت سید مٹھا نے دینی علوم کی تکمیل یہیں لاہور میں کی۔

سید جمال الدینؒ کی وفات کے بعد سید مٹھا سجادہ شیخیت پر رونق افروز ہوئے۔ مٹھا کا لقب عوام نے آپ کی شیریں بیانی کی بدولت دیا۔ عوام و خواص سب آپ کو اسی لقب سے پکارتے تھے۔ جس محلہ میں آپ قیام پذیر تھے' وہ بھی محلہ سید مٹھا کے نام سے

معروف ہو گیا۔ آپ مستجاب الدعوات تھے' آپ کی دعا سے لوگوں کے مصائب ٹل جاتے۔

حضرت سید مٹھا نے 661ھ مطابق 1263ء میں وفات پائی۔ اس وقت ہندوستان میں سلطان ناصر الدین کی حکومت تھی اور لاہور کا صوبہ دار معظم خاں شیرواں تھا۔ مزار اندرون لوہاری گیٹ محلہ سید مٹھا میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کا شمار لاہور کے قدیم بزرگوں میں ہوتا ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں آپ کی تاریخ وفات اس طرح درج ہے۔

سید مٹھا' ولی باصفا
آنکہ شیریں بود نزدِ خاص و عام
ہست سالِ ارتحال آں جناب
صاحبِ نعمت دگر شیریں کلام

661ھ

حضرت پیر شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

(پیدائش 701ھ)

نام گرامی سراج الدین تھا۔ 701ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ ہسٹری آف لاہور کے مؤلف سید محمد لطیف کے مطابق 723ھ میں بمطابق 1323ء میں بعہد سلطان محمد تغلق اپنے مرشد کے ایماء پر بغرض تبلیغ لاہور میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر بائیس تئیس سال کے قریب تھی۔ بہت بڑے عالم اور عارف تھے۔ آپ کے درس و تدریس اور تلقین و ہدایت سے مستفیض ہونے کے لیے لوگ کثرت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ سلطان محمد تغلق نے آپ کے زہد و اتقاء اور علم و فضل کی شہرت سنی تو ایک موقع پر جب وہ لاہور آیا تو آپ کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ اس ملاقات میں سلطان آپ کی قابلیت اور علم سے بے حد متاثر ہوا اور آپ کو قاضی شہر کا عہدہ پیش کیا' لیکن آپ نے اس ملازمت کو اپنی آزاد روی کے خلاف جان کر سلطان سے معذرت چاہی اور کہا کہ مجھے اس کام میں مشغول رہنے دیجئے جس کے لیے میرے مرشد نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اس پر سلطان سخت ناراض ہوا اور دشمنی پر اتر آیا۔ مدینۃ الاولیاء کے مؤلف کے مطابق سلطان اس قدر غضب ناک ہوا کہ حکم دیا' انہیں قتل کر دیا جائے۔ یہ سن کر عمائدین سلطنت سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جان بخشی کے لیے عرض کی۔ یہ حال دیکھ کر آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ بند کر دیا اور تمام دنیوی امور سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ وفات کے بعد اسی حجرے میں دفن ہوئے' جہاں آپ گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بعد ہر وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔

آپ کا مزار مبارک لاہور میں اندرون شہر چوک متی کے قریب بازار جوڑے

موری میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ بعض تذکروں میں ہے کہ آپ کے آباء و اجداد کا تعلق شیراز (ایران) سے تھا' اس لئے عوام میں پیر شیرازی کے لقب سے مشہور ہوئے' لیکن محمد دین کلیم (مؤلف مدینۃ الاولیاء) نے لکھا ہے کہ سراج الدین نام کی وجہ سے "پیر سراجی" کے عرف سے معروف ہوئے' بعد میں یہی عرف "پیر شیرازی" کی صورت اختیار کر گیا۔ (واللہ اعلم)

حضرت خواجہ سید ضیاء الدین شیروانی چشتی المعروف ''سر ربانی'' رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 735ھ)

''تاریخ لاہور'' کے مؤلف کنہیا لال نے آپ کا اسم گرامی رکن الدین اور مدینۃ الاولیاء کے مؤلف مفتی غلام سرور لاہوری نے ''شاہ ضیاء الدین شیروانی'' لکھا ہے۔ آپ کا وطن شیروان تھا' اسی لئے شیروانی کہلاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم بھی شیروان ہی میں حاصل کی۔ تذکرہ نگاروں کے مطابق شیروان سے حیدر آباد دکن پہنچے۔ آپ کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ کنہیا لال کا کہنا ہے کہ آپ نے تمام ہندوستان (متحدہ ہند) کی سیر کی۔

''مدینۃ الاولیاء'' میں ''تذکرہ حضرت شاہ کاکو چشتیؒ'' کے حوالے سے آپ کا نام سلیم الدین بھی لکھا ہے لیکن یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ حضرت سر ربانیؒ حضرت مخدوم سید علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ (م 716ھ) کے خلیفہ تھے۔ ان کی صحبت بابرکت میں رہ کر آپ نے تکمیل پائی۔ ''سر ربانی'' کا خطاب آپ کو پیر روشن ضمیر ہی نے مرحمت فرمایا تھا۔ اسی لقب سے آپ مشہور ہوئے۔ (تاریخ لاہور کنہیا لال: ص 313)

حضرت ترک پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ کے دو خلفاء تھے۔ پہلے حضرت شیخ جلال الدینؒ کبیر الاولیاء اور دوسرے حضرت سر ربانی حضرت شاہ رکن الدین شاہ شیروانیؒ۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد آپ بغرض تبلیغ و ہدایت لاہور میں تشریف لائے اور تمام عمر رشد و ہدایت کے کام میں مشغول رہے۔ آپ صاحب وجد و حال بزرگ تھے۔ مفتی غلام سرور نے ''خزینۃ الاصفیاء'' میں لکھا ہے کہ حضرت سر ربانی از حد بزرگ اور صاحب

ذوق و وجد و سماع تھے۔ ان کے مزاج حق امتزاج پر جذب و استغراق و مدہوشی کا غلبہ رہتا تھا۔ پیر روشن ضمیر نے بعد عطائے خرقہ ان کو لاہور جانے کی اجازت دی۔ انہوں نے یہاں آ کر ہزاروں طالبان حق کو خدا رسیدہ کیا' تاحال ان کے سلسلہ عالیہ کے مرید لاہور میں موجود ہیں۔

آپ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے پہلے بزرگ ہیں' جو لاہور میں تشریف لائے اور تلقین و تبلیغ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کی کوششوں سے ہزاروں طالبان حق' خدا رسیدہ ہوئے۔

صاحب "حدیقۃ الاولیاء" کے مطابق آپ وفات کے وقت احمد آباد میں تھے۔ وصال سے قبل مریدوں کو وصیت فرمائی کہ میرا تابوت لاہور (پنجاب) میں لے جانا۔ مرید جنازہ کا تابوت لے کر لاہور پہنچے۔ اس وقت رات کا وقت تھا۔ اس لئے مرید شہر سے باہر ہی شب باش ہوئے۔ اگلی صبح جنازہ کا تابوت اٹھانا چاہا' تو وہ اٹھ نہ سکا۔ مریدوں نے اشارہ غیبی سمجھ کر وہیں دفن کر دیا۔

کنہیا لال نے آپ کی وفات کا سال 735ھ مطابق 1334ء تحریر کیا ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح نظم کی ہے:

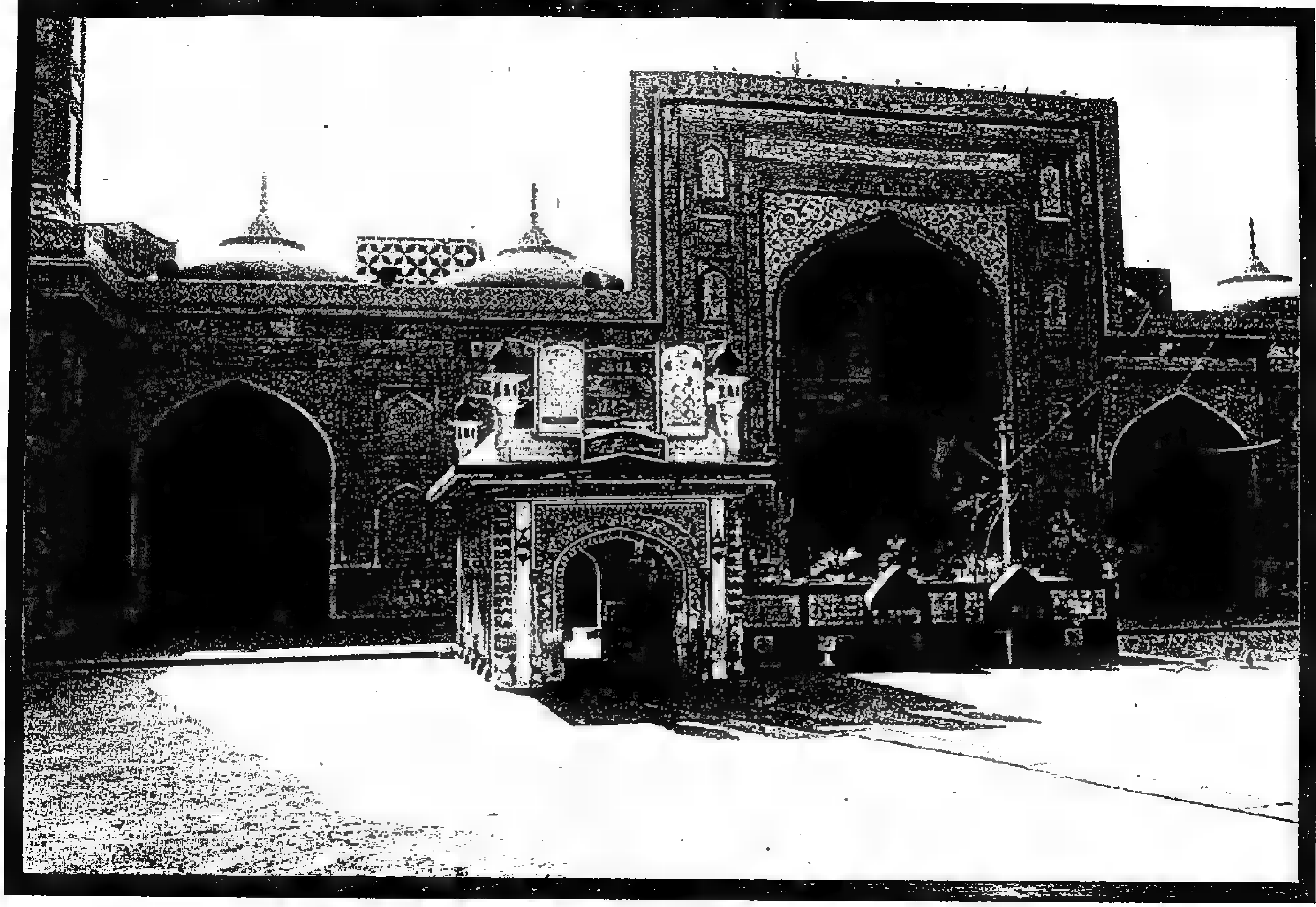
رونق و زینت چشتِ اہل بہشت
شیخ دیں' میر سر ربانی
سالِ وصلش چو از خود جُستم
شد عیاں: پیرِ سرّ ربانی
735ھ

کنہیا لال نے "تاریخ لاہور" میں آپ کے مقبرہ کی حالت' جو اس کے زمانے میں تھی' اس طرح بیان کی ہے:

"سکھوں کے وقت' یہ مقبرہ نہایت خراب حالت میں تھا' کیونکہ تمام عمارت و باغیچہ کا سامان سکھ اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ اس کے چاہ (یعنی کنواں) کی بھی آدھی اینٹیں اکھاڑلی گئی تھیں' مگر جب انگریزوں کی عمل داری ہوئی تو ایک شخص صاحب ریذیڈنٹ لاہور کے ہمراہ اس بزرگ کی اولاد میں سے لاہور آیا۔ اس نے دوبارہ مقبرے کی مرمت کی۔ سفیدی کرائی۔ برآمدہ نیا بنوایا۔ چاہ کی مرمت کر کے اسے جاری کرایا اور ایک کوٹھا بنا کر

اس میں ایک درویش بٹھا دیا۔ بہت سی زمین جو اس مقبرے سے متعلق تھی۔ اس میں درخت لگوائے' جس سے یہ مکان دوبارہ آباد ہو گیا۔ اب یہ مقبرہ پختہ بنا ہوا ہے۔ دروازہ شمال کی سمت کو ہے اور دروازے کے آگے ایک اور خوبصورت برآمدہ ہے اور فقیرو خادم مقبرے کا ہمیشہ حاضر رہتا ہے۔ (صفحہ 314)

آپ کا مزار مبارک مزنگ اڈہ کے قریب ـــ فین روڈ پر موجود ہے۔ سرہانے سنگ مرمر کی لوح پر یہ عبارت تحریر ہے: ”حضرت خواجہ سید ضیاء الدین۔ سرربانی چشتی صابری رحمتہ اللہ علیہ نمبر3 فین روڈ لاہور۔



مسجد وزیر خان کے صحن میں حضرت سید میراں بادشاہ" کا مزار

نیک آدمی برے فعل کا مرتکب ہو کر کبھی اپنی
نظروں میں ذلیل ہونا گوارا نہیں کرتا۔

(حضرت سید میراں بادشاہؒ)

حضرت سید اسحاق گازرونی
المعروف حضرت میراں بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 786ھ)

جن بزرگان دین کے قدموں کے طفیل اہل لاہور اسلام کی نعمت عظمیٰ سے مالا مال ہوئے اور اس سرزمین میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا' ان میں حضرت سید اسحاق گازرونیؒ کا نامِ نامی نمایاں ہے۔

آپ کا اسم گرامی سید اسحاق ہے۔ سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ ایران کے مشہور شہر گازرون میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اسی آبائی شہر میں حاصل کی اور حصول تعلیم کے بعد حضرت شیخ اوحد الدین اوحدی اصفہانیؒ (م 737ھ) سے سلسلہ سہروردیہ میں بیعت ہوئے۔ شجرۂ طریقت اس طرح ہے:

(1) حضرت سید اسحاق گازرونیؒ (2) حضرت شیخ اوحد الدین اوحدیؒ (3) حضرت شیخ اوحد الدین اوحد الکرمانیؒ (4) شیخ رکن الدین سجاسیؒ (5) شیخ قطب الدین ابو رشیدؒ (6) شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر السہروردیؒ (7) شیخ احمد غزالیؒ (8) شیخ ابو بکر نساجؒ (9) شیخ ابوالقاسم الجرجانیؒ (10) شیخ ابو عثمان المغربیؒ (11) شیخ ابو علی الکاتبؒ (12) شیخ ابو علی الرو باریؒ (13) شیخ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ (14) شیخ سری سقطیؒ (15) شیخ معروف کرخیؒ (16) امام موسیٰ رضا الکاظمؒ (17) حضرت امام جعفر صادقؒ (18) حضرت امام باقرؒ (19) حضرت امام زین العابدینؒ (20) سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ (21) سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ (22) خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ آپ ایک اشارۂ غیبی کے تحت لاہور میں تشریف لائے اور وفات تک ہدایت خلق میں مصروف رہے۔ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ اس وقت ہندوستان پر تغلق حکمران تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اپنی تصنیف "مسجد وزیر خاں" میں لکھتے ہیں: آپ مرشد کی اجازت سے گازرون سے تبلیغ اسلام کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ حضرت سید اسحاق گازرونی لاہوری "عظیم صوفی اور عظیم مبلغ تھے۔ آپ ایک طویل عرصہ تک لاہور میں تلقین و تبلیغ اور رشد و ہدایت میں مصروف رہے۔ لاہور کے جلیل القدر علماء و فضلاء اور سادات کی بڑی تعداد آپ کے حلقۂ درس و ارادت میں شامل ہو کر ظاہری و باطنی امور میں فیض یاب ہوئی۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے تحفۃ المومنین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ نے طویل عمر پائی' جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا' ہدایت یاب ہوتا۔

آپ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت سید اسحاق گازرونی نے لاہور میں ایک علمی اور تبلیغی مرکز قائم کیا' جس میں علماء اور طلباء قیام کرتے تھے۔ حضرت گازرونی ان کی پوری توجہ سے تربیت فرماتے اور پھر اشاعت اسلام اور فروغ دین کے لیے مختلف شہروں اور ممالک میں روانہ فرماتے۔ عوام اور مریدوں کی عبادات میں کوئی غلطی محسوس کرتے' تو فوراً اصلاح کرتے۔ بے شمار مخلوق آپ کی بدولت حلقہ اسلام میں داخل ہوئی۔ آپ انتہائی مشفق' مہربان' رحم دل اور حلیم الطبع بزرگ تھے۔ خزینۃ الاصفیاء میں آپ کی کئی کرامات مندرج ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ' جس سے آپ کے مزاج پر بخوبی روشنی پڑتی ہے' درج کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ مفتی غلام سرور تحفۃ الواصلین کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

لاہور کا متمول شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کچھ دیر مجلس میں بیٹھا رہا' لیکن حضرت نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اس پر وہ سیخ پا ہوا اور حضرت کے خلاف اول فول بکنے لگا۔ حضرت اس پر بھی خاموش رہے۔ جب اس کی بدتمیزی حد سے بڑھ گئی' تو حضرت نے ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ اس پر وہ شخص بے ہوش ہو کر گر پڑا' جب ہوش میں آیا' تو اٹھ کر حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور رو رو کر معافی چاہی۔ حضرت نے اسے معاف کر دیا اور اس کی درخواست پر حلقہ مریدین میں شامل فرما لیا۔ پھر فرمایا: اگر میں اس کے لیے بددعا کرتا تو یہ نتیجہ حاصل نہ ہوتا۔ انسان کو عفو و درگزر سے

کام لینا چاہئے اور اپنے اخلاق و کردار میں سنت نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام) کا نمونہ ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر تبلیغ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

آپ کا وصال 786ھ میں ہوا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے آپ کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ تحفۃ الواصلین میں یہ قطعہ بھی درج ہے۔

سید اسحاق ولی کریم
گشت چوں زیں دہر بجنت مقیم
سال وصل او عجب آمد ز دل
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

786ھ

آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا مزار خام بنایا گیا۔ عہد شاہجہانی میں جب نواب علیم الدین انصاری (نواب وزیر خاں) نے مسجد وزیر خاں تعمیر کرائی تو آپ کا مزار مبارک مسجد کے صحن میں آگیا۔ جو آج بھی ایک تہہ خانے میں سمت جنوب زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت سید سید صوف سہروردی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

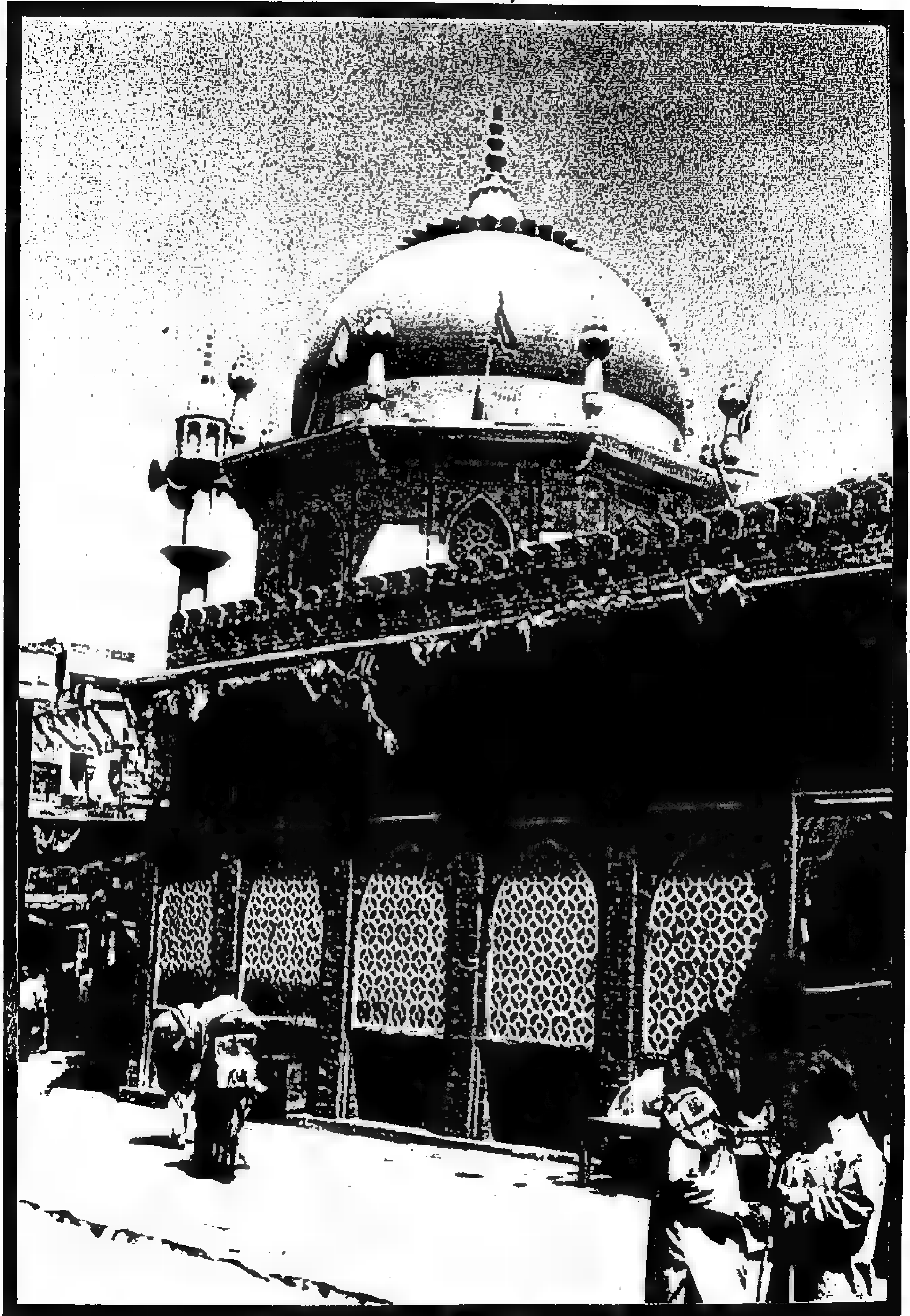
(المتوفی 786ھ)

اسم گرامی سیّد سید صوف۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے معروف بزرگ ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی اور ابتدائی حالات کسی مستند کتاب سے نہیں مل سکے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کو سید اسحاق گازرونیؒ کا ہم عہد، ہم مجلس اور بھائی لکھا ہے۔ غلام دستگیر نامی نے تحفۃ الواصلین کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ حضرت میراں بادشاہ سید اسحاق گازرونی (مدفون اندرون مسجد وزیر خاں) کے ہم عصر تھے۔ تحقیقات چشتی اور تاریخ لاہور کے مصنف نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت سید صوف، سید اسحاق گازرونیؒ عرف میراں بادشاہ کے ہم عصر اور ہم عہد تھے اور چونکہ دونوں کا زمانہ سلطان فیروز شاہ تغلق سے تعلق رکھتا ہے اور دونوں کا سال وفات بھی ایک ہی ہے، اس لیے ان کے ہم عہد و ہم جلیس ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

ان روایات پر اعتماد کرتے ہوئے میاں اخلاق احمد نے لکھا ہے کہ اگر تحفۃ الواصلین کی رائے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ امر مسلمہ ہے کہ آپ کی ولادت و وفات آٹھویں صدی ہجری میں ہوئی اور آپ فارس سے سیاسی بدامنی کے باعث بددل ہو کر نوجوانی میں وہاں سے نکلے اور فیروز شاہ تغلق کے پر امن دور میں حضرت سید اسحاق گازرونیؒ کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ (ملاحظہ ہو "لاہور کے دو قدیم صوفیہ")

"تذکرہ اولیائے لاہور" میں کسی مستند حوالے کے بغیر تحریر ہے کہ حضرت ملتان کے نواح کے رہنے والے تھے۔ وہیں 703ھ میں پیدا ہوئے، والد صفو کے نام سے مشہور تھے، لیکن کسی مستند حوالہ کے بغیر یہ بیان ناقابل قبول ہے۔ کسی بھی نئے یا پرانے



مزار حضرت سید سید صوف ؒ

"سید سید صوف" آٹھویں صدی ہجری کے معروف بزرگ، جنہوں نے تمام عمر تبلیغ دین میں گزاری اور میدان جنگ میں کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

سید سید صوف

تذکرے سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

آپ نے 786ھ میں شہادت پائی۔ آپ کی شہادت کا حال بیان کرتے ہوئے میاں اخلاق احمد مرحوم نے لکھا ہے: اہل لاہور ہمیشہ مغلوں کے حملوں سے ہراساں رہتے تھے۔ جب کبھی ان کی آمد کے بارے میں کوئی خبر پاتے تو ان کے جگر کانپنے لگ جاتے تھے کہ کون جانتا ہے اس ہول میں کون زندہ رہے گا' کون نہیں۔ لوگ حتمی طور پر بد دل اور مایوس ہو چکے تھے مگر اس دور میں علماء' فضلاء' صلحاء' اہل دل' اہل درد' اہل قلم اور اہل سیف بھی تھے۔ جب مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہوتی نظر آتی تو شامل جہاد ہو جاتے اور دین اسلام کی حرمت اور مسلمانوں کے جان و مال اور آبرو بچانے کا وقت آتا' تو اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہو جاتے اور جہاد بالسیف سے دریغ نہ کرتے۔

حضرت سید صوف لاہوریؒ نے' اس خطرناک موقع پر جس نے بلوہ کی صورت اختیار کرلی تھی' حق کی خاطر جام شہادت نوش فرمایا اور راہ خدا میں شہید ہوئے۔" (ملاحظہ ہو: "لاہور کے دو قدیم صوفیہ")

یہ زمانہ کس قدر پر آشوب تھا۔ منشی محمد دین فوق کی اس تحریر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اس زمانے میں مغل سرحد ہندوستان عبور کر کے پنجاب میں آ کر لُوٹ مار کیا کرتے تھے اور ان کی لوٹ مار اور غارتگری کا سلسلہ ایک سو سال قبل سے چلا آتا تھا۔ بلکہ دہلی اور لاہور میں اکثر مغل آباد بھی ہو گئے تھے۔ لاہور میں انہی کی وجہ سے محلہ مغل پورہ قائم ہوا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بھی بیرونی مغل برابر مار دھاڑ کرتے اور جو کچھ ملتا' لوٹ کھسوٹ کر پھر واپس چلے جاتے۔ سب سے زیادہ زور ان کا لاہور پر ہوتا تھا کہ یہ دولت مند شہر تھا اور دہلی کے عین راستے میں تھا۔

"حضرت سید صوف درویش اور صوفی منش بزرگ تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں لاہور آئے۔ اس زمانے کے صوفی اور علماء آج کل کے بظاہر خلوت نشین' مگر مریدوں کی گرداوری کرنے والے صوفیا کی طرح نہ تھے۔ وہ اہل دل بھی تھے اور اہل درد بھی۔ اہل قلم بھی تھے اور اہل سیف بھی۔ جب مسلمانوں پر مصیبت آ پڑتی تھی تو وہ شامل جہاد ہو جایا کرتے تھے۔ جب وہ مسند ارشاد پر متمکن ہوتے تو اپنے مواعظ حسنہ اور فیض صحبت سے لوگوں کے دلوں سے زنگ کدورت دور کرتے اور جب دین کی حرمت اور لوگوں کے جان و مال اور آبرو بچانے کا موقع آتا تو اپنا خون تک بہانے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ایسا ہی

ایک موقع جب سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں آیا تو حضرت سید صوف دشمن کو للکار کر اس کے سامنے آئے اور میدان جنگ میں خاک و خون سے لتھڑ کر مرتبہ شہادت کو پہنچ گئے۔ (مآثر لاہور بحوالہ نقوش لاہور نمبر ص 175)

مفتی غلام سرور لاہوری حدیقۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں: اکثر یہ بات مشہور ہے کہ کوئی شخص چالیس روز برابر اس مزار پر آنے نہیں پایا' سوائے اس شخص کے کہ جس کے دل کی مراد کا حاصل ہونا تقدیر ربانی میں ہو۔ ورنہ جو شخص محروم ازلی ہوتا ہے' اس کو چلے کے اندر ہی ایسی دہشت دکھائی دیتی ہے کہ پھر وہ اس مزار پر نہیں آتا۔" (صفحہ 249)

سکھوں کے عہد میں آپ کے مزار کے قریب چوک وزیر خاں کے گرد و نواح میں اکثر لوگوں نے نئے مکانات تعمیر کرا لئے جس کی وجہ سے خانقاہ حضرت سید صوف اور مسجد وزیر خاں کی خوبصورتی ماند پڑنے لگی۔ چنانچہ 1850ء میں چوک وزیر خاں کے اندرونی مکانات سرکاری حکم سے گرا دیئے گئے اور چوک کو پھر ایک وسیع میدان بنا دیا گیا۔ ان دنوں ضلع لاہور کا ڈپٹی کمشنر میجر میکریگر تھا جو مزار حضرت سید صوف کو چوک کی خوبصورتی میں حائل سمجھتا تھا' اس نے آپ کے مزار اقدس کو جو اس وقت ایک چبوترہ کی صورت میں تھا گرانا چاہا' لیکن جب اس ناپاک ارادے کو پورا کرنا چاہا تو اس قدر ہیبت زدہ ہوا کہ ہمت نہ پڑی۔ (لاہور کے دو قدیم صوفیاء ص 87)

بعد میں میاں محمد سلطان کاشمیری ٹھیکیدار (رئیسِ اعظم لاہور) نے میجر جارج میکریگر ڈپٹی کمشنر لاہور کی منظوری سے آپ کا عالی شان روضہ تعمیر کرا دیا۔ جس کی تائید روضہ کی شمالی دیوار پر نصب سنگ مرمر پر تحریر اس عبارت سے ہوتی ہے:

"بصوابدید صاحب عالی مناقب میجر جارج میکریگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور مقبرہ متبرکہ حضرت سید صوف قدس سرہ تعمیر کردہ شیخ سلطان ٹھیکیدار سرکار فیض آثار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہ سن 1854ء بکرمی 1908 مطابق 1268ھ بہ اتمام رسید۔"

حضرت سید صوف کے مزار اقدس پر جو لوح نصب ہے' اس پر یہ عبارت تحریر ہے: "روضہ اقدس سلطان العارفین زبدۃ الکاملین منظور بارگاہ ایزد حضرت سید سید صوف فیض بخش نور اللہ مرقدہ۔ در عہد بادشاہ ابوالمظفر فیروز شاہ تغلق۔"

اس کے بعد مندرجہ ذیل عبارت اور اشعار درج ہیں:۔

شیخ المشائخ حضرت پیر سخی سید سید صوف فیض بخش رحمتہ اللہ علیہ الحسنی سہروردی۔ سنہ وصال 786ھ۔

اشعار یہ ہیں:۔

کس دل زندہ کی ہے یہ تربت عظمت نشاں
خاک جس کی چومنے کو جھک رہا ہے آسماں
فیض بخشِ گنجِ وحدت، مرشدِ فرخ جبیں
صوفی صافی نہاد و رہبرِ دنیا و دیں
غازۂ رُوئے شہادت زینتِ قوم و وطن
سرفروش و غازی و شداد کُش، مرحب فگن
سرخرو ہو کر جہادِ فی سبیل اللہ سے
مردِ مومن لے رہا ہے خوابِ شیریں کے مزے

حضرت کے لوح مزار کی تحریر اگر تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے تو اس کے مطابق آپ حسنی سید ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ نیز آپ سلسلہ سہروردیہ سے منسلک تھے اور آپ نے 786ھ میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں شہادت پائی۔

حضرت پیر زکی شہید رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 790ھ)

حضرت پیر زکی شہید کے تفصیلی حالات کسی بھی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ محمد دین کلیم مرحوم نے تحفتہ الواصلین کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ سلاطین کے زمانہ کے بزرگ ہیں۔ جس وقت منگولوں نے لاہور پر حملہ کیا تو آپ نے نہایت پامردی اور جرات سے کفار کا مقابلہ کیا اس وقت آپ کی رہائش اسی دروازہ (یعنی یکی دروازہ) کے اندر تھی۔
(مدینۃ الاولیاء: ص 500)

"مآثر لاہور" میں منشی محمد دین فوق نے لکھا ہے:

"لاہور میں یہ روایت مشہور ہے کہ جب آپ کا جسم آپ کے سر سے علیحدہ ہو گیا' تو آپ کا جسم بے سر ہو کر بھی دشمنوں سے لڑتا رہا۔ آخر جہاں وہ تھک کے رہ گیا۔ وہیں آپ کے دھڑ یعنی جسم بے سر کی قبر بنی' جو ایک چاردیواری کے اندر یکی دروازہ سے شہر میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ آتی ہے اور آج بھی موجود ہے۔ سر چونکہ دروازہ کے باہر بلکہ دروازہ کے نیچے ہی (جہاں آپ کا قیام رہتا تھا) کٹ چکا تھا۔ اس لیے سر کی قبر دروازہ کے نیچے ہی بنا دی گئی۔

"ہندوستان پر کافر مغلوں کے حملے سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان علاؤالدین مسعود کے زمانہ 642ھ مطابق 1224ء سے شروع ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ 790ھ تک جاری رہتا ہے۔ پچاس سال کے اس عرصہ میں ہندوستان پر سلطان ناصر الدین محمود' سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی' سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان فیروز شاہ تغلق نے حکومت کی۔ گو ہر حملہ میں مغل پسپا ہوتے رہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی جانیں بھی گئیں' مگر یہ سخت جان حملہ آور شمالی ہند کو

پامال کر کے دہلی تک پہنچ جاتے تھے۔ لاہور ملتان اور نواح دہلی بالخصوص اور بعض دوسرے مقامات ہمیشہ ان کی جولانگاہ بنے رہے۔ اس لئے پیر زکی کی شہادت کا واقعہ انہی پچاس برس کے اندر سمجھنا چاہئے۔

"پیر زکی کہاں سے آئے' کب آئے؟ لاہور ہی کے رہنے والے تھے یا کسی اور مقام سے تشریف لائے؟ لاہور میں ان کے کیا مشاغل تھے؟ ان باتوں کے متعلق تاریخ لاہور بالکل خاموش ہے۔

"آپ کی قبر دو جگہ ہے اور دونوں جگہ عقیدت مند فاتحہ کے لیے جاتے ہیں۔ یکی دروازہ کے پہلو میں آپکے سر مبارک کا چھوٹا سا مزار ہے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شہر کے چاروں طرف پختہ اور گہری خندق کھدوائی تو ہر دروازے کے سامنے آمد و رفت کے لیے پل بھی بنوائے۔ آپ کی رہائش اور آپ کی آخری آرام گاہ ہونے کی وجہ سے اس دروازے کا نام زکی دروازہ تھا' جو بعد میں یکی دروازہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس لئے یکی دروازہ پر بھی پل بنایا گیا۔ جب انگریزی عہد آیا' تو یہ دروازہ بوسیدہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے چونکہ غیر مستحکم تھا' اس لیے گرا دیا گیا اور قبر بالکل علیحدہ نظر آنے لگی۔" (بحوالہ نقوش لاہور نمبر ص: 179)

حضرت شاہ کاکو چشتی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 882ھ)

حضرت کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ علاؤ الدین علاء الحق تھا۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے حدیقۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ آپ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد سے تھے اور چند واسطوں سے آپ کا نسب حضرت خواجہؒ سے مل جاتا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت خواجہ فریدؒ کے پڑپوتے تھے۔ کسی تذکرہ میں آپ کا سن پیدائش تحریر نہیں۔ آپ کی پیدائش ہنداوہ (بنگال) میں ہوئی۔ حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم آپ نے شیخ نور الدین نامی ایک بزرگ سے حاصل کی۔

آپ حضرت نور الدین قطب عالم بنگالیؒ (م 851ھ مدفون ہنداوہ) کے مرید تھے' انہی سے خلافت حاصل کی۔ پھر انہی کے حکم سے بنگال سے لاہور تشریف لائے۔ یہاں بھی حضرت شیخ پیر محمد چشتی لاہوریؒ سے فیض پایا اور سلسلہ چشتیہ میں خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ پھر تمام عمر لاہور ہی میں گزار دی۔ لاہور میں بے شمار لوگ آپ کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے۔ یہاں آپ کا قیام اس جگہ تھا' جہاں اب مسجد شہید گنج واقع ہے۔ وفات کے بعد وہیں آپ کا روضہ مبارک بنایا گیا ہے۔

آپ کا وصال 882ھ مطابق 1475ء سلطان بہلول لودھی کے عہد حکومت میں ہوا۔ وصیت کے مطابق آپ کی قبر پختہ نہ بنائی گئی۔

حضرت شاہ کاکوؒ کے فرزندوں میں شیخ اسحاقؒ بہت معروف اور صاحب حال و قال تھے۔ جنہوں نے اپنے والد کے سجادہ پر بیٹھ کر سلسلے کی ترقی و ترویج کے لیے انتھک محنت کی اور اشاعت و فروغ اسلام کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

حضرت شاہ کاکوؒ کے مزار کا حال بیان کرتے ہوئے صاحب "تاثر لاہور" لکھتے ہیں:

"حضرت میاں میرؒ کے زمانہ تک لوگ آپ کے مزار سے زیادہ واقف نہ تھے۔ ایک مرتبہ حضرت میاں میرؒ اس جگہ پر آئے اور فاتحہ پڑھ کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ یہ مزار ایک کامل بزرگ اور بہت بڑے ولی اللہ کا ہے۔ اس کے بعد عوام کی توجہ آپ کے مزار کی طرف مبذول ہوئی۔

"آپ کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد آپ کی لحد کے متصل ایک مسجد اعلیٰ پیمانے پر تعمیر ہوئی۔ دارا شکوہ بن شاہ جہاں کے زمانہ میں اسی کے نام پر محلہ دارا شکوہ بھی آباد ہوا جس کو چوک دارا شکوہ بھی کہتے تھے۔ جب مغل حکومت نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں کے بعد رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگی اور سکھوں نے رفتہ رفتہ بام عروج پر چڑھنا شروع کیا تو مسلمانوں کے مقبروں اور ان کی مسجدوں اور ان کی شاندار عمارتوں کی شامت آگئی۔ اس مسجد اور اس مقبرہ (حضرت شاہ کاکوؒ) پر بھی سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ جب سکھوں کی سب سے بڑی بے آئین حکومت یعنی سہ حاکمان لاہور کے بعد 1798ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تو اس نے بھی یہاں سکھوں کا قبضہ برقرار رکھا۔ 1849ء کے بعد جب پنجاب پر انگریزوں کا پرچم لہرایا' تو مسلمانوں کو داد فریاد کا موقع ملا۔ دیوانی دعوے بھی وقتاً فوقتاً ہوئے۔ 1935ء کی سخت گرمیوں میں جانی قربانیاں بھی ہوئیں' لیکن کچھ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے اور کچھ مسلمانوں کی خودغرض پارٹیوں کی بدولت ہر بار ناکامی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ سکھوں نے مسجد کو گوردوارہ بنا لیا اور حضرت شاہ کاکوؒ کی قبر کے چبوترے اور سرہانے کے قدیم بیری کے درخت کا نام و نشان تک نہ رہنے دیا۔ یہ المناک واقعہ جولائی 1935ء کے عشرہ اول میں سر ایمرسن کی گورنری اور سر سکندر حیات خان کی وفات کے ایام میں پیش آیا۔" (بحوالہ نقوش لاہور نمبر)

حضرت شیخ اسحاق کاکو چشتیؒ

آپ حضرت شاہ کاکوؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ ظاہری و باطنی علوم کی تکمیل والد ماجد سے کی۔ حضرت شیخ کاکوؒ کے وصال کے بعد آپ کی تمام عمر درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں گزری۔ اہل لاہور آپ کی ولایت کے بہت قائل تھے۔ طبقات اکبری میں ملا نظام الدین لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ اسحاق نہایت عالم اور متبحر فاضل تھے' بلکہ سرزمین ہند میں آپ کے پائے کے اشخاص بہت کم ہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی 955ھ مطابق 1548ء میں لاہور آکر آپ سے ملاقات کی تھی۔

انہوں نے "منتخب التواریخ" میں آپ کا حال قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے' یہ کتاب نایاب ہے اور حسن اتفاق سے راقم الحروف کی لائبریری میں موجود ہے' اس لئے حضرت اسحاق کاکو لاہوری رحمتہ اللہ علیہ کے حالات وہاں سے درج کئے جاتے ہیں' تاکہ محفوظ رہ سکیں:

"والد ماجد کا نام شیخ کاکو" تھا۔ تمام لاہور والے شیخ اسحاق کی ولایت کے معتقد ہیں۔ یہ بڑے صاحب علم' متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازے پر نہیں گئے۔ نہ کسی سے حاجت چاہی۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی اس وقت تک ازخود بات نہیں کرتے تھے۔

"ایک روز ایک نامعقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا مٹکا ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا کہ اس کو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تامل و انکار اسے سر پر اٹھا لیا اور بازار سے اس کو مکان تک لے جا کر پہنچا دیا۔ آپ نے اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ اسی دن سے اس شخص کے دل کا کھوٹ نکل گیا اور وہ دنیاداری کو چھوڑ کر آپ کے حلقہ درس میں شامل ہو گیا اور آخرکار عالم دین بن گیا۔

"میں نے 995ھ میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ ایک دن میں نے شیخ فیضی سے جسے انہی دنوں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا' مذکورہ بالا حکایت بیان کی۔ فیضی نے جیسا کہ اس کی عادت تھی کہ وہ ماضی و حال کے تمام علماء و مشائخ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا' حضرت کی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر میں صبر کر کے خاموش ہو رہا۔ اسی رات یا دوسری رات میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ ابوالفضل ایک جنگل میں ٹھہرا ہوا ہے اور ایک پرانے کھنڈر میں جس کی بس دو تین دیواریں کھڑی ہوئی تھیں' شیخ اسحاق ان تو پچیوں کی جماعت میں ہیں' جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوقیں سر کرتے ہیں۔ انہوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلا دی اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ یہ دیکھ کر میں خوف سے جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن میں شیخ کی خدمت میں نذر

لے کر گیا۔ جسے آپ نے قبول فرمالیا۔ میں نے اپنا یہ قصہ بیان کیا' تو کچھ نہ فرمایا' دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

حضرت شیخ لاہور کے کئی مشہور علماء کے استاد ہیں' جیسے شیخ سعد الدین اور شیخ منور وغیرہ جو اپنی زمانہ کے بے مثل عالم ہیں۔

جوانی میں حضرت شکار کے بڑے شوقین تھے' جب بھی سبق پڑھانے سے فارغ ہوتے۔ باز عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکار گاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔

آپ کی عمر سو سال سے زیادہ ہوئی۔ 996ھ میں انتقال فرمایا۔

قطب العالم حضرت عبدالجلیل
(المعروف چوہڑ شاہ بندگی رحمتہ اللہ علیہ)

نویں صدی ہجری کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن' سورج اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ طلوع ہو چکا ہے۔ دریائے راوی پر سکون انداز میں رواں دواں ہے۔ کنارے پر اللہ کے ایک ولی چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک ہندو عورت کشتی میں سوار لاہور شہر کی طرف آ رہی ہے۔ جب وہ کشتی سے اتری اور اللہ کے اس ولی کے قریب پہنچی' تو انہوں نے پوچھا: بیٹی! یہ تمہارے سر پر برتن میں کیا ہے' کیا بیچتی ہو؟ عورت نے جواب دیا: بابا جی! میں دہی فروخت کرنے لاہور جا رہی ہوں۔ ولی اللہ نے پوچھا: تمہارے اس برتن میں جس قدر دہی ہے' اس کے کیا دام لو گی؟ بزرگ نے اس کی منہ مانگی قیمت ادا کر دی اور فرمایا: اب دہی کے اس برتن کو زمین پر پٹخ دو۔ کچھ پس و پیش کے بعد عورت نے دہی کا برتن زمین پر پٹخ دیا۔ برتن ٹوٹ گیا' تو دہی سے ایک سیاہ مردہ ناگ برآمد ہوا۔ عورت بہت حیران ہوئی اور واپس اپنے گاؤں ہانڈو پہنچ کر تمام واقعہ اپنے خاوند راموں گوجر کو سنایا۔ راموں بہت حیران ہوا کہ کس طرح ایک ولی اللہ نے اپنے نور باطن سے یہ معلوم کر لیا کہ برتن میں دہی کے اندر ایک زہریلا سانپ موجود ہے۔ راموں لاہور میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ اللہ کے ولی نے راموں کا اسلامی نام شیخ جلال تجویز فرمایا' جو ان کی خدمت میں رہ کر خود بھی ولی اللہ بن گیا۔

اللہ کے یہ ولی جنہوں نے اپنے نور باطن سے یہ معلوم کر لیا کہ عورت کے سر پر رکھی ہوئی دہی انتہائی زہریلی ہے جو لوگوں کے لیے ہلاکت کا باعث بنے گی' قطب العالم

حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔

حضرت قطب العالم کے کسی تذکرہ نگار نے آپ کی تاریخ پیدائش تحریر نہیں کی۔ منشی محمد دین فوق نے "مآثر لاہور" میں لکھا ہے کہ سلطان حمید الدین حاکم (جن کو سلطان التارکین کہتے ہیں کہ انہوں نے بیس سال کی حکومت کے بعد دنیاوی عیش و آرام ترک کر کے فقر و درویشی کا لباس پہن لیا تھا) کے دو فرزند تھے۔ چھوٹے بیٹے شیخ تاج الدین کی اولاد بہاولپور اور بعض دوسرے مقامات میں آباد ہے جبکہ فرزند اول شیخ نور الدین کی اولاد تحصیل جھنگ، تحصیل شاہدرہ، تحصیل لاہور اور تحصیل چونیاں وغیرہ مقامات پنجاب میں آباد ہے۔ شیخ نور الدین کی پانچویں پشت میں شیخ عبدالجلیل پیدا ہوئے، جو اپنے علم و عمل کی بدولت قطب العالم چوہڑ شاہ بندگی کہلائے۔ (بحوالہ نقوش لاہور نمبر ص: 181)

"چوہڑ شاہ بندگی" کا مطلب

پیر غلام دستگیر نامی نے تاریخ جلیلہ (دوسرا ایڈیشن ص: 107) میں حضرت فرخ بخش کی کتاب "الجلیل" کے حوالہ سے لکھا ہے:

چوہڑ ریاست بہاولپور میں عام نام ہے۔ ہندی لغت میں اس کے معنی ہیں "شکار کو تدبیر سے قابو میں لانے والا" حضرت نے چونکہ اپنے نفس کو مجاہدہ و ریاضت سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے رام کر لیا تھا، اس لیے خلق خدا میں چوہڑ شاہ بندگی کے لقب سے معروف ہوئے۔ قطب العالم آپ کا خطاب ہے۔"

حضرت قطب العالم کی پیدائش "مو مبارک" (ریاست بہاولپور) میں ہوئی۔ علوم رسمیہ کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ ابوالفتح سے بیعت کی اور ان کی خدمت میں حاضر رہ کر فیوض باطنی حاصل کیے۔ انہوں نے محبت پدری کے باوجود آپ سے سخت ریاضتیں کرائیں، جن سے آپ مردانہ وار گزرے۔ بعد ازاں آپ نے مشائخ عالم کی زیارت کے لیے خراسان اور عراق کا سفر کیا اور بے شمار علماء و مشائخ سے مستفیض ہوئے۔ چند سالوں کی سیاحت کے بعد وطن مالوف پہنچے تو والد ماجد حضرت شیخ ابوالفتح کو سفر آخرت کی تیاریوں میں مصروف پایا، وہ آپ ہی کے انتظار میں تھے۔ ملتے ہی گلے سے لگایا اور خرقہ خلافت عطا فرمایا پھر چند وصیتیں کیں اور دار فانی سے عالم باقی کی طرف روانہ ہو گئے۔

شیخ کامل کے وصال کے بعد آپ اپنے جد امجد شیخ حمید الدین حاکم کے مزار پر معتکف ہوئے' جو "مو مبارک" (ریاست بہاولپور) میں ہے۔ وہاں القائے ربانی ہوا کہ لاہور جا کر ہدایت خلق کا فریضہ انجام دیں۔ آپ فوراً لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک رات خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ اجودھن میں ہمارے مزار سے ہوتے ہوئے جائیں اور اپنا حصہ جو ہمارے پاس بطور امانت رکھا ہے' وصول کریں۔ چنانچہ آپ اجودھن گئے اور سلسلۂ عالیہ چشتیہ کی طرف سے خلافت کا خلعتِ فاخرہ حاصل کیا۔

لاہور آکر آپ کوٹ کروڑ میں منزل گزیں ہوئے (اس وقت یہ علاقہ موجودہ لاہور اسٹیشن اور لکشمی چوک کے درمیان واقع تھا) یہاں سجادۂ رشد و ہدایت بچھایا اور فریضۂ تبلیغ و اشاعت دین میں مشغول ہوئے۔

غلام دستگیر نامی کی تحقیق کے مطابق حضرت 880ھ مطابق 1475ء کے قریب لاہور تشریف لائے۔ یہ سلطان بہلول لودھی کا زمانہ تھا۔ سلطان کو ان دنوں راجہ سین پال سلہریہ کی بغاوت نے فکر مند کر رکھا تھا۔ سلہریہ ریاست اس وقت اس رقبہ پر تھی' جس میں اب پسرور' ظفروال' نارووال' پٹھان کوٹ' شکر گڑھ اور جموں وغیرہ واقع ہیں۔

راجہ سین پال نے خراج دینا بند کیا' تو سلطان نے اس کی سرکوبی کے لیے لشکر بھیجا' جس نے پہلے راجہ کو سلطان کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ خراج ادا کرے یا مسلمان ہو جائے۔ راجہ نے لڑنے کو ترجیح دی' لیکن جلد ہی شکست کھا کر بھاگ نکلا' اور جموں کے پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔

ان پہاڑوں میں اس کی ملاقات جے پال نامی ایک جوگی سے ہوئی' جس کے بارے میں مشہور تھا کہ استدراج میں کوئی ہندو جوگی اس کا ہمسر نہیں۔ استدراج اس خارق العادت عمل کو کہتے ہیں' جو کسی غیر مسلم سے سرزد ہو۔ راجہ سین پال اس جوگی کے پاس گیا اور اپنی تمام رام کہانی اسے سنائی اور پھر منت کی وہ کوئی ایسا عمل پڑھے جس سے مجھ پر آئی ہوئی یہ بلا ٹل جائے۔

جے پال جوگی نے اسے تسلی دی اور وعدہ کیا کہ میں تمہارا یہ کام کر دوں گا اور تمہاری سلطنت بھی تمہیں واپس دلا دوں گا۔ اس کے بعد وہ سیدھا لاہور پہنچا اور سلطان بہلول لودھی کی خدمت میں باریاب ہو کر عرض کی کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اس

نے اپنے بندوں کو بادشاہوں کے قبضہ میں اس لئے دیا ہے کہ وہ ان میں انصاف کریں۔ اگر جہاں پناہ اس حقیر کی گزارش پر غور کا وعدہ فرمائیں' تو میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں؟

سلطان کو جوگی کا یہ انداز پسند آیا اور فرمایا: تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو' بلا خوف کہو۔ جے پال نے عرض کی: اگر جہاں پناہ اپنی رعایا کو ان کی رضا و رغبت سے دائرۂ اسلام میں لانا چاہتے ہیں' تو کسی مسلمان عالم کو میرے سامنے پیش کریں' تاکہ وہ مجھ سے مناظرہ کرے اور حق و باطل میں امتیاز ہو سکے۔ اگر مسلمان عالم مجھ پر غالب آگیا تو میں تمام قوم سلہریہ کے ساتھ اسلام قبول کرلوں گا' ورنہ مجھ سے وعدہ فرمائیں کہ آپ آئندہ راجہ سین پال سے مزاحمت نہیں فرمائیں گے۔

سلطان نے جوگی کی یہ بات مان لی اور اپنے وزیر دولت خاں سے کہا کہ کوئی صاحب حال تلاش کرو' جو اس جوگی کو لاجواب کر سکے۔ دولت خاں حضرت شاہ کاکو رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام واقعہ عرض کیا۔ لاہور اسٹیشن کے قریب ہی جہاں آج کل مسجد شہید گنج ہے' حضرت شاہ کاکوؒ کی خانقاہ تھی۔ حضرت نے فرمایا: میں اب بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں۔ تم قطب عالم شیخ عبدالجلیل چوہڑ بندگی کی خدمت میں جاؤ' وہ لاہور میں تشریف لا چکے ہیں۔ حضور سرور عالم ﷺ کی طرف سے یہ ولایت اب ان کے سپرد ہو چکی ہے۔ دولت خاں سیدھا حضرت قطب العالم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: سلطان سے کہو کہ وہ خاطر جمع رکھیں' انشاء اللہ تمام ریاست جے پال جوگی سمیت مسلمان ہو جائے گی۔

اگلے روز دربار آراستہ ہوا۔ حضرت قطب العالم تشریف لائے۔ سارا شہر حق و باطل کے اس معرکے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ پہلے جوگی نے اسلام پر کچھ اعتراضات کیے' جن کا جواب دینے کے لیے حضرت نے مدلل تقریر فرمائی اور ہر اعتراض کا ایسا مسکت جواب ارشاد فرمایا کہ جوگی کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔ آخر اس نے کہا: آؤ' ظاہر کو چھوڑ کر باطن کی طرف رجوع کریں۔

اب دونوں مراقبے میں چلے گئے۔ جوگی نے تمام روئے زمین کی سیر کرائی پھر حضرت سے کہا کہ اب آپ میں کوئی باطنی کمال ہے" تو وہ دکھائیں۔ قطب العالم نے ارشاد فرمایا: آنکھیں بند کرو۔ پھر آپ جوگی کو آسمانوں اور عالم لاہوت کا مشاہدہ کراتے ہوئے

جنت الماویٰ کے دروازے پر لے آئے۔ عالم لامکاں کی تجلیات نے جے پال کو دم بخود کر دیا تھا۔ اب اس کی روح جنت الماویٰ میں داخل ہونے کے لیے بڑھی' تو دروازہ بند ہو گیا۔ قطب العالم نے فرمایا: اگر تو کلمہ شہادت پڑھ لے' تو جنت کی سیر بھی کر سکتا ہے۔ اس پر جوگی نے باآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا' جسے تمام اہل دربار اور وہاں موجود لوگوں نے سنا۔

مراقبے سے سر اٹھاتے ہی جے پال جوگی اپنی قوم سے مخاطب ہوا اور کہا: "عزیزو! مذہب اسلام سچا اور برحق ہے۔ میں تو اس سچے دین میں داخل ہو چکا ہوں' جو مجھ سے ارادت رکھتا ہے' ▪ بھی کلمہ شہادت پڑھ لے اور اپنے تاریک سینے کو اسلام کے نور سے منور کر لے۔" یہ کہہ کر اس نے دوبارہ سب حاضرین کے سامنے کلمہ شہادت پڑھا۔ جسے سنتے ہی تمام قوم سلہریہ اور راجہ سین پال نے بھی کلمہ شہادت پڑھ لیا اور مسلمان ہو گئے۔ (اذکار قلندریہ صفحہ 131 بحوالہ "شاہ رکن عالم ملتانی" از نور احمد فریدی ص: 317)

شیر شاہ سوری کو بشارت

894ھ کو سلطان بہلول لودھی کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کا بڑا بیٹا بایزید خاں سکندر لودھی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اسے بھی حضرت قطب العالم سے بڑی عقیدت تھی' اکثر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتا اور دعاؤں سے فیض یاب ہوتا۔ ایک روز عجیب واقعہ پیش آیا۔ سلطان سکندر لودھی اپنے وزیر اعظم اور امرائے سلطنت کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے سلطان کو مسند پر اپنے پہلو میں جگہ دی۔ کچھ ہی دیر بعد حسن خاں نامی ایک غلام' جو سلطان کے ملازموں میں سے تھا۔ اپنے بیٹے فرید خاں کو مرید کرانے کی غرض سے حاضر ہوا۔ حضرت نے فرید خاں کو سلطان سے بھی بہتر جگہ عنایت فرمائی۔ اس پر حاضرین کو بڑا تعجب ہوا۔ سلطان نے بھی اس بات کو محسوس کیا۔ وزیر اعظم دولت خاں غیرت سلطانی سے واقف تھا۔ اس نے قطب العالم کی خدمت میں عرض کیا: یا قطب العالم! اللہ تعالیٰ نے بھی عوام اور خواص میں فرق رکھا ہے۔ اس لئے مردان خدا کو بھی ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبہ کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ سلطان کی مسند پر جو ظل اللہ بھی ہے' کسی غلام کو بٹھانا آداب شاہی کے منافی ہے۔ سرور عالم ﷺ کا بھی ارشاد ہے کہ خلیفہ وقت کی عزت کرو کیونکہ وہ میرا جانشین ہے۔"

دولت خاں کی یہ بات سن کر حضرت مسکرائے اور فرمایا: دولت خاں! یہ کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے۔ سنو' جب سلطنت تمہارے خاندان سے چلی جائے گی' تو یہی نوجوان دشمنوں کو شکست دے کر ہندوستان کا تاج و تخت دوبارہ تمہارے خاندان میں لے آئے گا اور افغانوں کے نام کو روشن کرے گا۔ پھر یہ شعر پڑھا:

قادرا قدرت تو داری ہر چہ خواہی آں کنی
ہر گدائے را کہ خواہی در دمے سلطاں کنی

"شاہ رکن عالم ملتانیؒ " کے مصنف نور احمد خاں فریدی نے لکھا ہے کہ یہ وہی نوجوان فرید خاں تھا' جس نے ہمایوں سے ہندوستان کی سلطنت قوت بازو سے حاصل کی اور شیر شاہ سوری کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔

"بزرگان لاہور" کے مؤلف غلام دستگیر نامی نے لکھا ہے کہ حضرت قطب العالم کتاب "دلائل الخیرات" (مؤلفہ ابو عبداللہ سلیمان الجزولیؒ) کا بڑے ذوق و شوق سے ورد رکھتے تھے اور اسے ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام ختم کرتے تھے اور جس مرید پر زیادہ مہربان ہوتے اسے بھی "دلائل الخیرات" پڑھنے کی تلقین فرماتے۔ اس کی بدولت اس کی تمام مشکلیں بہ طریق احسن حل ہو جاتیں۔

"مدینۃ الاولیاء" کے مؤلف محمد دین کلیم نے لکھا ہے کہ آپ اکثر حضرت بی بی پاکدامناں کے مزار اقدس پر حاضر ہو کر ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے حالات میں ہے کہ آپ اپنی روزی خود محنت سے کما کر کھاتے تھے۔ ضرورت کے مطابق غلہ خود پیتے اور اس کے لیے کسی مرید سے مشقت نہ لیتے تھے۔

حضرت نے بروز یک شنبہ یکم رجب 910ھ (مطابق 8 دسمبر 1504ء) کو لاہور میں وفات پائی۔ کتاب "بزرگانِ لاہور" میں ہے کہ ایک روز آپ کی پر انوار مجلس میں شیخ یونس' شیخ جلال' شیخ مولا نجار' شیخ مٹھہ سیاہ پوش' شیخ موسیٰ آہن گر' شیخ زین العابدین' ملا قرن اور دوسرے نامدار خلفاء و اولیائے کبار حاضر تھے کہ اچانک قطب العالمؒ نے سجدہ میں سر رکھ دیا اور جان' جان آفریں کے سپرد کر دی۔ سلطان سکندر لودھی اس وقت لاہور میں موجود تھا' وہ آپ کے غسل اور تدفین میں شریک ہوا۔

لاہور میں بے شمار خلق خدا نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا' شیخ ابوبکرؒ نے (جو آپ کے بھائی اور خلیفہ تھے) آپ کی تاریخ وفات لفظ "شیخ" سے نکالی۔

آپ کا شمار لاہور کے قدیم ترین سہروردی بزرگوں میں ہوتا ہے۔ مزار مبارک میکلوڈ روڈ پر حضرت موسیٰ آہن گر کے روضہ کے قریب ایک گلی میں واقع ہے۔ راقم الحروف اپنے بچپن میں جب یہاں حاضری دیتا تھا' تو اس کے اردگرد میدان تھا اور کافی جگہ خالی تھی۔ لیکن اب لوگوں نے وہاں مکانات تعمیر کر لیے ہیں' جس کی وجہ سے مزار اقدس تک پہنچنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔

حضرت سید عثمان المعروف شاہ جھولہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 912ھ/1506ء)

حضرت سید محمد اوچی کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاریؒ تک اس طرح پہنچتا ہے:

(1) سید عثمانؒ (2) سید محمودؒ (3) سید بہاؤ الدینؒ (4) سید حامدؒ (5) سید محمد شاہؒ (6) سید رکن الدین الخاطب ابوالفتح بخاریؒ (7) سید حامدؒ (8) سید ناصرالدینؒ (9) سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ

حضرت سید عثمان بخاریؒ کے شجرۂ نسب کی طرح ان کا سلسلہ طریقت بھی حضرت مخدوم جہانیاںؒ تک یہی ہے۔ یہ سب حضرات سلسلہ عالیہ سہروردیہ میں اپنے اپنے والد بزرگوار سے بیعت تھے اور انہی سے خلافت پائی تھی۔

"شاہ جھولہ" لقب کا سبب تذکرہ نگاروں نے یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ اوچ سے اونٹ پر سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے تو اونٹ کو تیز چلانے کے باعث آپ کا بازو تیزی کے ساتھ حرکت کرتا تھا۔ اس دوران آپ نے اپنے بازو کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یہ حرکت کیوں ہے؟ شاید تجھے جھولہ "رعشہ" ہو گیا ہے۔ اسی دوران آپ کے بازو میں رعشہ پیدا ہو گیا' جو آخر دم تک رہا۔ جھولہ پنجابی میں رعشہ کو کہتے ہیں۔

حضرت کی وفات 18 ربیع الاول 912ھ مطابق 1506ء میں سلطان سکندر لودھی کے عہد میں ہوئی۔ آپ کا مزار مبارک شاہی قلعہ لاہور کے اندر تہہ خانہ میں ہے' جو عوام میں مزار شیخ حسینی اور پنج پیر کے نام سے مشہور ہے۔ قلعہ اکبری کی تعمیر سے قبل یہ علاقہ جس میں آپ کا مزار ہے' شہر لاہور کی آبادی کے اندر تھا۔

آپ انتہائی ذوق و شوق اور جذب استغراق والے بزرگ تھے۔ لاہور میں آپ

نے ایک خلق کثیر کو اپنی ارادت سے سرفراز فرمایا۔ آپ کی روشن ضمیری کے باعث عوام اور خواص سب آپ کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ آپ کے مرتبہ علمی اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے علمائے وقت بھی آپ کے بے حد معتقد تھے۔ خزینۃ الاصفیاء میں آپ کا قطعہ تاریخ اس طرح درج ہے:

میر عثماں چو گشت راہی خلد
یافت از حق بباغ خلد مکاں
گو وصالش امیر عثماں' نیز
معدن جود' سید عثماں

912ھ

سید شاہ محمدؒ

حضرت سید عثمان جھولہؒ کے وصال کے وقت آپ کے صاحبزادے سید شاہ محمد اوچ میں تھے۔ والد بزرگ کی وفات کی خبر سن کر لاہور پہنچے اور ان کی مسند رشد و ہدایت پر جلوہ افروز ہوئے۔ نور احمد خاں فریدی مرحوم نے اپنی کتاب "شاہ رکن عالم ملتانیؒ" میں حضرت شاہ محمدؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ بڑے باکرامت بزرگ تھے۔ ایک دفعہ کلانور جا رہے تھے۔ ایک اجتماع کثیر آپ کے ہمراہ تھا۔ جب "چک سردا" میں پہنچے تو خدام کو حکم دیا کہ جانوروں کو پانی پلاؤ۔ وہ جانوروں کو ہندو زمیندار سارنگ کے کنویں پر لے گئے۔ سارنگ کو خبر ہوئی تو وہ باہر نکل آیا اور خدام کو پانی پلانے سے منع کر دیا' خدام چپ چاپ جانور واپس لے آئے۔ آپ کو علم ہوا تو آپ نے نیزہ زمین پر مارا' فوراً چشمہ جاری ہو گیا اور سارنگ کا کنواں بالکل خشک ہو گیا۔ سارنگ یہ کرامت دیکھ کر خدمت میں حاضر ہوا اور سچے دل سے کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

سید شاہ محمدؒ نے طویل عمر پائی اور 11 ربیع الثانی 1011ھ کو وصال فرمایا۔ مزار موضع ہلکہ (ضلع لاہور) میں ہے۔ آپ کے پانچ صاحبزادے تھے (1) سید عماد الملک (المتوفیٰ 1039ھ) (2) سید بہاؤالدین جھولن شاہ' جو گھوڑے شاہ کے لقب سے مشہور ہیں ان کا حال آگے آئے گا (3) شاہ عالم (4) بہاون شاہ (5) سید محمود المعروف نورنگ (المتوفیٰ 1053ھ) مزار محمود بوٹی میں ہے' یہ علاقہ انہی کے نام پر مشہور ہے۔

حضرت شیخ موسیٰ آہن گر رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 962ھ/1555ء)

حضرت شیخؒ کی کئی کرامات مشہور ہیں' پیشہ کے اعتبار سے آپ ''آہن گر'' یعنی لوہار تھے۔ ایک روز دکان میں بھٹی کے آگے بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ایک خوبصورت ہندو عورت چرخے کا تکلا سیدھا کرانے کے لیے آئی' آپ نے تکلا لے کر بھٹی میں رکھا' اس دوران جونہی عورت کے چہرے پر نظر پڑی تو اس میں محو ہو گئے۔ ہندو عورت نے اعتراض کیا' کہ بابا جی! آپ میرے چہرے کو کیوں دیکھتے ہیں؟ شیخ نے فرمایا: ''میں تجھے نہیں' تجھے بنانے والے کو دیکھتا ہوں۔'' ہندو عورت بولی: یہ تو کہنے کی باتیں ہیں۔ آپ نے فرمایا: لے یہ دیکھ' یہ کہہ کر آپ نے بھٹی سے سرخ تکلا نکال کر سرمہ سلائی کی طرح دونوں آنکھوں میں پھیر لیا اور فرمایا: ہم نے بری نظر سے تمہیں دیکھا ہو' تو ہماری آنکھیں جل جائیں۔ عورت نے شیخ کی آنکھوں کی طرف دیکھا' تو وہ بالکل ٹھیک تھیں' عورت ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی اور عرض کی' یا حضرت! مجھے مسلمان بنا دیں' میں آپ کا سچا مذہب قبول کرتی ہوں۔ بعد میں اس عورت کے گھر والوں کو اس کرامت کا علم ہوا تو وہ بھی صدق دل سے مسلمان ہو گئے۔ بعد میں یہ عورت حضرت کی تربیت سے بلند مقام پر پہنچی۔ (خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص: 81)

(اس عفیفہ کا مزار حضرت شیخ موسیٰ آہن گر کے مقبرہ کے شمال مشرقی گوشے میں ایک حجرہ کے اندر ہے)

حضرت شیخ موسیٰ آہن گرؒ 28 رجب 841ھ مطابق 1437ء میں نواح ملتان میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام سلطان عرب اور والدہ کا نام نامی عائشہ بی بی تھا۔ دونوں نہایت نیک اور پارسا تھے۔ حضرت شیخ کا سلسلہ نسب حضرت امام تقیؒ کے ذریعے حضرت

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

حضرت شیخ موسیٰ نے صغر سنی ہی میں سلوک کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد وہ حجاز گئے اور تقریباً دس برس حرمین شریفین میں اقامت پذیر رہے اور یہاں تفسیر و حدیث کا درس دیتے رہے۔ آخر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر ہندوستان کا رخ کیا۔ سب سے پہلے ٹھٹھہ اور ملتان کے درمیان ایک گاؤں میں قیام کیا۔ اسی گاؤں کے سردار شیخ زکریا کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔

آپ نے شیخ شہر اللہ بن یوسف (سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی ؒ) سے بیعت کی۔ جب ان کا وقت آخر آیا تو حضرت شیخ موسیٰؒ نے عرض کی: یا حضرت! میری تکمیل کا کام تو ابھی باقی ہے۔ مجھے آپ کس کے سپرد کرتے ہیں؟ فرمایا: تمہاری تکمیل قطب العالم حضرت عبدالجلیل سہروردی کے ہاتھوں ہو گی۔ میری وفات کے بعد تم لاہور میں ان کے پاس چلے جانا۔

شیخ نے ایسا ہی کیا اور لاہور میں حضرت شیخ عبدالجلیلؒ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر باہر فقراء میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت شیخ عبدالجلیلؒ نے نور باطن سے شیخ موسیٰؒ کا حال جان لیا اور ایک خادم سے فرمایا: باہر جاؤ' ملتان سے ایک طالب حق شیخ موسیٰ آئے ہیں' انہیں میرے پاس لے آؤ۔ یوں حضرت قطب عالمؒ کی خدمت میں ان کی حاضری ہوئی۔ اس کے بعد آپ حضرت قطب عالم کی وفات تک ان کی خدمت میں حاضر رہے اور درجہ تکمیل تک پہنچے۔

حضرت قطب العالمؒ کے وصال کے بعد آپ نے رشد و ہدایت کا سجادہ بچھایا اور بے شمار خلق خدا کو حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ آپ کی خدمت میں علماء و فضلاء بھی حاضر ہوتے اور اپنے علمی اشکال حل کراتے۔

قوتِ لایموت کے لیے آپ بھی اپنے مرشد کامل حضرت شیخ عبدالجلیل قطب عالمؒ کی طرح اپنی روزی اپنی محنت سے حاصل کرتے تھے اور اس غرض سے آہن گری کا پیشہ اختیار فرمایا تھا۔

آپ کے سنہ وصال میں اختلاف ہے۔ جمال اللہ بن شاہ جیون مصنف مناقب موسوی کے مطابق آپ نصیر الدین ہمایوں کے دور میں بروز جمعرات 18 صفر 962ھ مطابق 1555ء فوت ہوئے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے "تاریخ مخزن پنجاب" میں

آپ کا سنہ وفات 925ھ اور کنہیا لعل نے 952ھ تحریر کیا ہے۔ پروفیسر شجاع الدین مرحوم نے آپ کے سنہ وفات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: شیخ عبدالجلیل سے کسب فیض کے بعد شیخ موسیٰ آہن گر کا سال وفات خزینۃ الاصفیاء وغیرہ تذکروں میں 1519ء مرقوم ہے۔

آئین اکبری اور ملا نظام الدین کی کتاب "طبقات اکبری" میں آپ کی تاریخ وفات دور اکبری کا ابتدائی زمانہ بیان کی جاتی ہے۔ اکبر 1556ء میں سریر آرائے ہندوستان ہوا۔ اس لحاظ سے شیخ کا سال وفات کم از کم 964ھ مطابق 1557ء یا 965ھ مطابق 1558ء سمجھنا چاہئے۔ بظاہر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے شیخ کے بعد پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہے ہوں' لیکن ابوالفضل اور نظام الدین احمد جیسے مقتدر اور ثقہ ہم عصر مورخین کا متفقہ بیان ایسا بھی نہیں کہ اسے رد کر دیا جائے۔ پس اگر شیخ عبدالجلیل" کی وفات کے وقت آپ کی عمر تیس بتیس سال کی ہو' تو آپ کا اسی پچاسی سال کی عمر پا کر دور اکبری کے آغاز میں فوت ہونا خلاف حقیقت معلوم نہیں ہوتا۔ (بحوالہ نقوش لاہور نمبر ص: 188)

پیر غلام دستگیر نامی کی تحقیق کے مطابق آپ کا وصال 18 صفر 962ھ کو ہوا۔ (بحوالہ کتاب۔ شاہ رکن عالم ملتانی" : از نور احمد خاں فریدی)

آپ نے اپنا مقبرہ خود تعمیر کرایا۔ اس سلسلے میں آپ کی یہ کرامت بھی بہت مشہور ہے۔ کتاب "شاہ رکن عالم ملتانی" میں خزینۃ الاصفیاء مؤلفہ مفتی غلام سرور کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ جب حضرت قطب العالم عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی نے شیخ موسیٰ کو زمین مرحمت کی تو آپ نے اس میں مقبرہ بنوانا شروع کیا۔ اتفاق سے ان معماروں میں چند ہندو بھی تھے۔ ان ایام میں دریائے گنگا میں اشنان کرنے کا تہوار آ گیا۔ ہندو معماروں نے اجازت چاہی۔ چونکہ کام میں حرج واقع ہوتا تھا اس لئے حضرت نے رخصت دینے سے انکار فرمایا لیکن جب ہندوؤں کی الحاح و زاری حد سے بڑھ گئی' تو آپ نے فرمایا: جب اشنان کا دن آئے' تو مجھے اطلاع کرنا میں تمہیں گنگا پر بھجوا دوں گا اور اشنان بھی کروا دوں گا۔

معمار اگرچہ ہندو تھے' لیکن درویشوں سے عقیدت رکھتے تھے اور ایسی باتوں کو فقر و ولایت سے بعید نہیں جانتے تھے۔ وہ چپ ہو رہے۔ جب اشنان کا دن آیا تو انہوں نے

حضرت کی خدمت میں وعدہ ایفائی کے لیے عرض کی۔ آپ نے فرمایا کہ میرے کنویں کے حوض میں جا کر ڈبکی لگاؤ' انشاء اللہ گنگا پہنچ جاؤ گے۔ ہندو معمار خاموشی سے اٹھے اور مل کر انہوں نے حوض میں غوطہ لگایا۔ سر نکالا تو دریائے گنگا میں تھے۔ بہت خوش ہوئے اور اپنے دھرم کے مطابق انہوں نے تمام رسوم ادا کیں۔ جب اشنان اور پوجاپاٹ سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے پھر دریا میں ڈبکی لگائی۔ سر نکالا تو اپنے آپ کو شیخ کے حوض میں پایا۔ (ص: 331)

لودھی حکمرانوں کے بعد سوری بادشاہوں کے عہد میں بھی حضرت شیخ موسیٰ آہن گر" کا نہایت درجہ احترام کیا جاتا تھا۔ سلاطین آپ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے باعث آپ کی خدمت میں حاضری دینے کو سعادت سمجھتے تھے۔ ملی حالات پر بھی حضرت شیخ کی نظر رہتی تھی۔

"خفتگان خاک لاہور" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ "حضرت موسیٰ آہن گر ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ سوری حکمران اسلام شاہ (1552ء) کی وفات کے بعد جب ملک کے سیاسی حالات خراب ہوئے تو انہوں نے اپنے فرزند (شیخ احمد) کو کابل بھیجا اور اس نے ہمایوں سے ملاقات کی اور اسے برصغیر پاک و ہند پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ہمایوں کی ملاقات حضرت موسیٰ آہن گر سے ثابت ہے۔ حضرت بادشاہ کی زبان نہیں جانتے تھے اس لیے ہندوی زبان میں بادشاہ سے ہمکلام ہوئے۔"

آپ کی اہلیہ بی بی ملکی' شیخ زکریا کی دختر نیک اختر تھیں۔ جن کے بطن سے آپ کے چار فرزند پیدا ہوئے (1) شیخ یعقوب (2) شیخ اسحاق (3) شیخ اسماعیل (4) شیخ احمد (جن کا ذکر ابھی آیا ہے کہ وہ والد کے حکم کے مطابق شہنشاہ ہمایوں سے ملنے کابل گئے تھے' وہ کابل میں ہی تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا وہیں انہیں ایک گاؤں "دیہہ یعقوب" میں دفن کیا گیا)۔

آپ کا روضہ میکلوڈ روڈ (نزد قلعہ گوجر سنگھ) اسی زمین پر واقع ہے' جو آپ کے پیر و مرشد نے آپ کو عطا فرمائی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ کی خانقاہ تھی اور اس کے ایک حصہ میں آپ کی آہن گری کی دکان تھی۔ آپ کا روضہ مبارک مغل بادشاہ ہمایوں اور اکبر کے وزیر میر ہاشم نے بنوایا۔ جو آپ کا نہایت درجہ عقیدت مند تھا۔

معروف صحافی امین راحت چغتائی نے اپنی کتاب "دلائل" میں لکھا ہے کہ:

انگریزوں کے دور میں جب میکلوڈ روڈ کی تعمیر کے وقت ریلوے اسٹیشن تک سیدھا راستہ نکالنے میں حضرت شیخ موسیٰ آہن گر" کا مقبرہ حائل ہوا تو انگریز حاکم نے مقبرہ کے انہدام کا حکم دے دیا' لیکن انہدام کے وقت کوئی نہ کوئی بات آڑے آ جاتی۔ آخر انگریز حاکم خود گھوڑے پر سوار ہو کر سروے کے لیے نکلا تو مزار کے نزدیک اس کا گھوڑا ایک گڑھے میں پھنس گیا۔ آدمی دانش مند تھا فوراً معاملہ بھانپ گیا۔ انہدام روک دیا اور مغربی دیوار جو گرائی جا رہی تھی' از سر نو تعمیر کرا دی اور سڑک سیدھا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (صفحہ: 365)

حضرت شیخ موسیٰ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کا مزار اقدس سینکڑوں سال گزرنے کے باوجود آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت سیّد بہاول شاہ گیلانی (المعروف بہاول شیر) رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 973ھ / 1565ء)

اسم گرامی سید بہاول شاہ' والد ماجد کا نام نامی سید محی الدین بن سید شمس الدین بن حاجی بہاوٗ الدین بن سید اسماعیل گیلانی ہے۔

آپ کے حالات "تحقیقات چشتی" کے علاوہ کسی قدیم کتاب سے نہیں مل سکے۔ البتہ "مدینۃ الاولیاء" کے مؤلف نے چند سطریں لکھی ہیں' لیکن وہ بھی حضرت کے حالات کے بجائے مزار شریف کے حدود کے بارے میں ہیں۔

"تحقیقات چشتی" کے مؤلف نور احمد چشتی نے جو کچھ آپ کے بارے میں تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"حضرت بہاول شیر" حضرت شاہ محمد مقیم (حجرہ والا) کے جد امجد تھے۔ آپ بڑے اہل کمال اور صاحب حال و قال بزرگ تھے۔ مولد آپ کا شہر بغداد شریف ہے۔ آپ اپنے والد ماجد کے ہمراہ بغداد سے بغرض سیاحت ہندوستان آئے اور شہر بداؤں میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت بہاول شیر بہت چھوٹے تھے۔ والد ماجد نے بداؤں میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

والد کی وفات کے بعد آپ نے اپنی پھوپھی جان سے ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کی جو اپنے وقت کی رابعہ تھیں۔

حضرت بہاول شیر نے طویل عمر پائی۔ آپ جہاں اعتکاف فرماتے' وہاں مدت اعتکاف بارہ برس سے کم نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ستر سال علاقہ کوہستان میں ایک پتھر سے تکیہ لگا کر معتکف رہے' جس سے پشت مبارک چھل گئی' یہ داغ پشت مبارک پر ہمیشہ رہے۔ جب وہاں سے اٹھے تو بمقام حجرہ شاہ محمد مقیم (جو اس وقت پنڈ ڈھولاں کے نام سے

مشہور تھا) تشریف لائے۔"

غالباً عمر کے آخری سالوں میں لاہور تشریف لائے۔ خلق خدا ان کی خدمت میں جوق در جوق حاضر ہوتی اور ان کی دعاؤں سے فیض یاب ہوتی۔ آپ کی وفات 973ھ مطابق 1565ء میں ہوئی۔ اس وقت شہنشاہ اکبر کا عہد حکومت تھا اور لاہور کا گورنر خان اعظم میرزا محمد انگہ خاں تھا۔"

آپ کا مزار پر انوار قبرستان میانی صاحب کے قریب لٹن روڈ پر مسجد قصاباں کے عقب میں ہے۔

حضرت شیخ ابو اسحاق قادری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 985ھ/1577ء)

شیخ ابو اسحاق بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کو سادات بخارا میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ دینی علوم کی تکمیل بخارا میں کی۔ پھر تلاش مرشد میں وطن سے نکلے اور مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے شیر گڑھ (پاکستان) میں حضرت سید داؤد بندگی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان کے زہد و ورع اور علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر بیعت ہوئے۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے اپنے شیخ کی خدمت میں رہ کر ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ (مدینتہ الاولیاء ص: 89)

حضرت شاہ ابو المعالی لاہوری" آپ کے پیر بھائی تھے اور دونوں میں مخلصانہ مراسم و تعلقات اس حد تک تھے کہ اکٹھے عبادتوں اور ریاضتوں میں مشغول رہتے تھے۔ جب حضرت شاہ ابو المعالی" کو ان کے شیخ حضرت داؤد بندگی" نے خرقہ خلافت پہنا کر لاہور بھیجا تو حضرت شیخ ابو اسحاق" نے بھی مرشد گرامی کی خدمت میں عرض کی کہ وہ اپنے حبیب حضرت شاہ ابو المعالی" کے بغیر تنہائی سی محسوس کرتے ہیں' یہ سن کر مرشد گرامی نے انہیں بھی لاہور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ لاہور تشریف لا کر انہوں نے مزنگ میں سکونت اختیار کی اور وہیں ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے جہاں بے شمار طالبان حق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایت حاصل کرتے۔ آپ کے قیام کی بدولت بعد میں یہ علاقہ "محلہ ابو اسحاق" کے نام سے معروف ہوا۔ حدیقۃ الاولیاء میں ہے کہ صدہا لوگوں نے آپ سے علوم فقہ و حدیث و تفسیر کی تعلیم پائی۔

نزہتہ الخواطر میں ہے کہ شیخ ابو اسحاق بہت بڑے عالم اور تفسیر قرآن کریم کے ماہر تھے۔ تفسیر قرآن کریم میں ان کو اس قدر تبحر تھا کہ اس فن کے لوگ مشکل مسائل میں

دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ فقر و قناعت کے انتہائی مقام پر فائز تھے اور باوجود اس کے کہ صاحب خلافت و مجاز تھے' انہوں نے احتراماً اپنے شیخ کی زندگی میں کسی سے بیعت نہیں لی۔ (جلد چہارم ص 8'7)

صاحب خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور نے شیخ ابو اسحاق کے محامد و محاسن کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"شیخ ابو اسحاق قادری لاہوری" از اعظم خلفائے شیخ داؤد کرمانی چونی والی ست' جامع بو دمیان علوم ظاہر و باطن' و زہد و ورع و تقویٰ و سخاوت و ریاضت و مجاہدات صیام دوام و قیام مدام داشت' و خوارق و کرامت بے اختیار از وے بسر بر منیزد۔"

(یعنی حضرت شیخ ابو اسحاق قادری لاہوری حضرت شیخ داؤد کرمانی کے بلند مرتبہ خلفاء میں سے تھے۔ وہ علوم ظاہر و باطن' زہد و ورع' تقویٰ و سخاوت اور ریاضت و مجاہدات کے جامع تھے۔ ان کے دن روزہ میں اور راتیں قیام میں گزرتیں۔ خوارق و کرامات ان سے بے اختیار ظاہر ہوتے تھے۔)

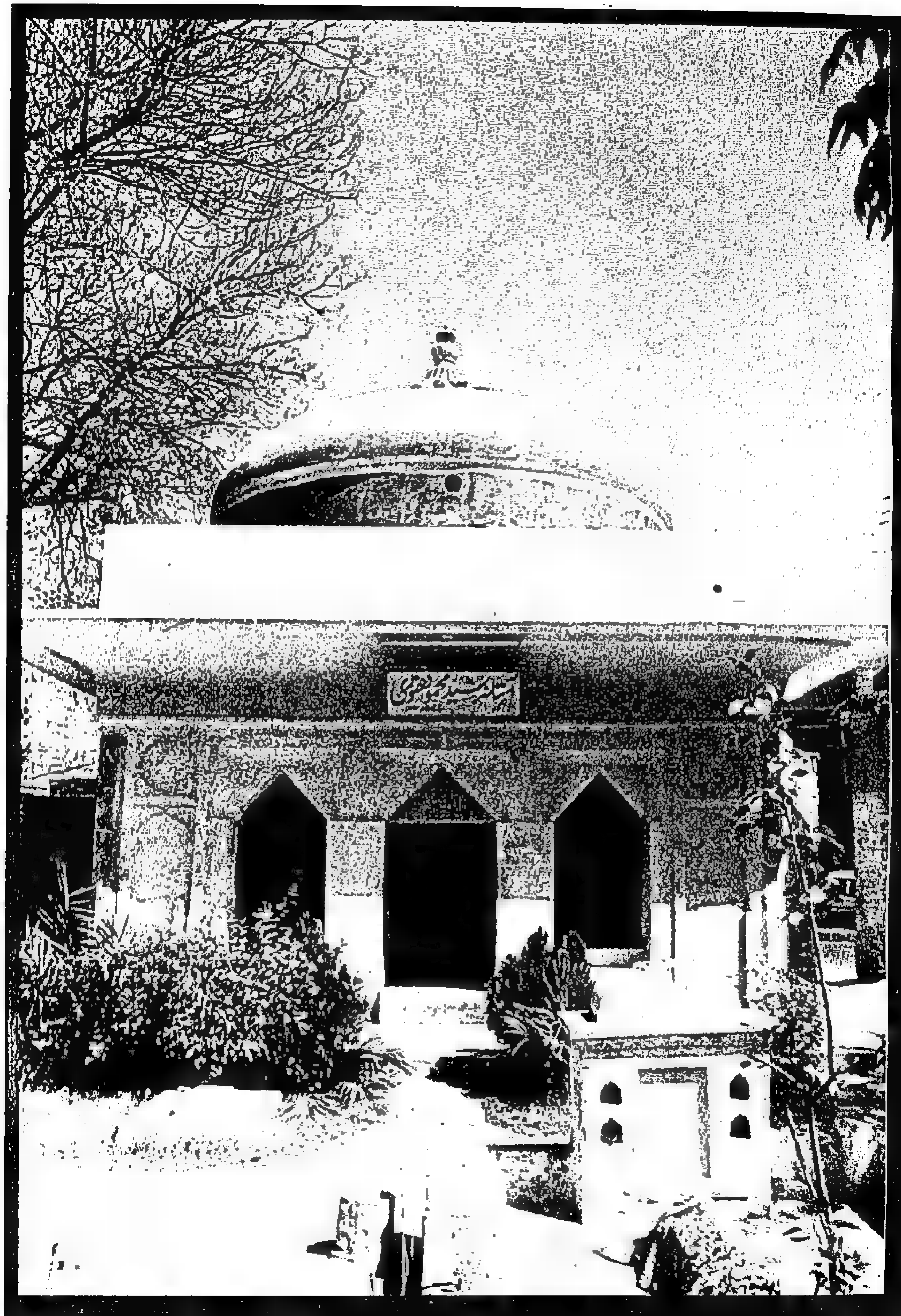
آپ کا وصال 5 محرم الحرام 985ھ مطابق 25 مارچ 1577ء کو شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ہوا۔ اس وقت لاہور کا صوبہ دار شاہ قلی خاں تھا۔ آپ اس جگہ مدفون ہوئے جہاں ایک عرصہ تک خلق خدا کو رشد و ہدایت اور علمی و روحانی فیوض و برکات سے نوازتے رہے۔ مقبرہ آپ کے ایک مخلص مرید عبداللہ بن عبدالقادر نے تعمیر کرایا' جو لکھنؤ کا بہت بڑا تاجر تھا۔

مزار اقدس زیارت گاہ خلائق ہے۔ جج محمد لطیف نے تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ روضہ کے ساتھ ایک بڑی مسجد ہے اور روضہ کی دیواروں پر سورۂ یٰسین اور سورۂ ملک نہایت خوبصورت خط میں مرقوم ہیں۔ مغربی دروازے پر یہ اشعار تحریر ہیں

حضرت شیخ شاہ ابو اسحاق
بود چوں از خدا خدا طلبش
سوئے حق رفت از سرِ تحقیق
کہ ہمیں وعدہ بود از ازلش
جست تاریخ فوتِ او برہان
یافت "سلطان عارفاں" لقبش

آپ کے خلفاء میں حضرت سید شمس الدین قاری قادری" بہت مشہور ہیں۔ پروفیسر محمد اسلم نے "خفتگان خاک لاہور" میں لکھا ہے۔ آپ کی ایک تصنیف "رسالہ ناطقہ" کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور (بھارت) میں محفوظ ہے۔ اردو زبان کی ترویج میں علماء اور صوفیاء کے کردار کے بارے میں اس "رسالہ ناطقہ" میں بڑی اہم باتیں ملتی ہیں۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ آپ کے تین صاحبزادوں (محمد حسین، ملک حسین اور یار حسین) کے مزارات بھی آپ کے روضہ کے قریب ہی ایک گنبد کے اندر ہیں۔



آستانہ حضرت سید محمود حضوریؒ

متکبروں کے پاس جا کر اپنی انسانیت کا خون نہ کرو۔

(حضرت سید محمود حضوریؒ)

حضرت سید محمود حضوری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 997ھ)

اسم گرامی سید محمود' لقب حضوری' والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ شمس الدین المعروف شمس العارفین' سلسلہ عالیہ قادریہ میں آپ نے اپنے والد ماجد سے بیعت کی' جو علوم ظاہری و باطنی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور تصوف و عرفان کی اعلیٰ منازل پر فائز تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا امام موسیٰ کاظمؒ کے ذریعے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ علاقہ غور (ایران) کے رہنے والے تھے۔ سید محمود اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد غور سے ہندوستان آئے اور چند روز اوچ میں قیام کرنے کے بعد لاہور آ گئے۔ لاہور میں آپ کا قیام محلہ حاجی سرائے میں تھا۔ یہ علاقہ اب گڑھی شاہو کہلاتا ہے۔

آپ کی ذات گرامی جامع علوم و فنون تھی۔ لاہور میں چند ہی روز قیام کے بعد آپ کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ ''خزینۃ الاصفیاء'' میں ہے کہ ایک خلق کثیر نے آپ کے علمی و روحانی کمالات سے اخذ فیض کیا۔ آپ عوام میں ''حضوری'' کے لقب سے معروف ہوئے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا' وہ اسی روز خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت سے مشرف ہوتا۔

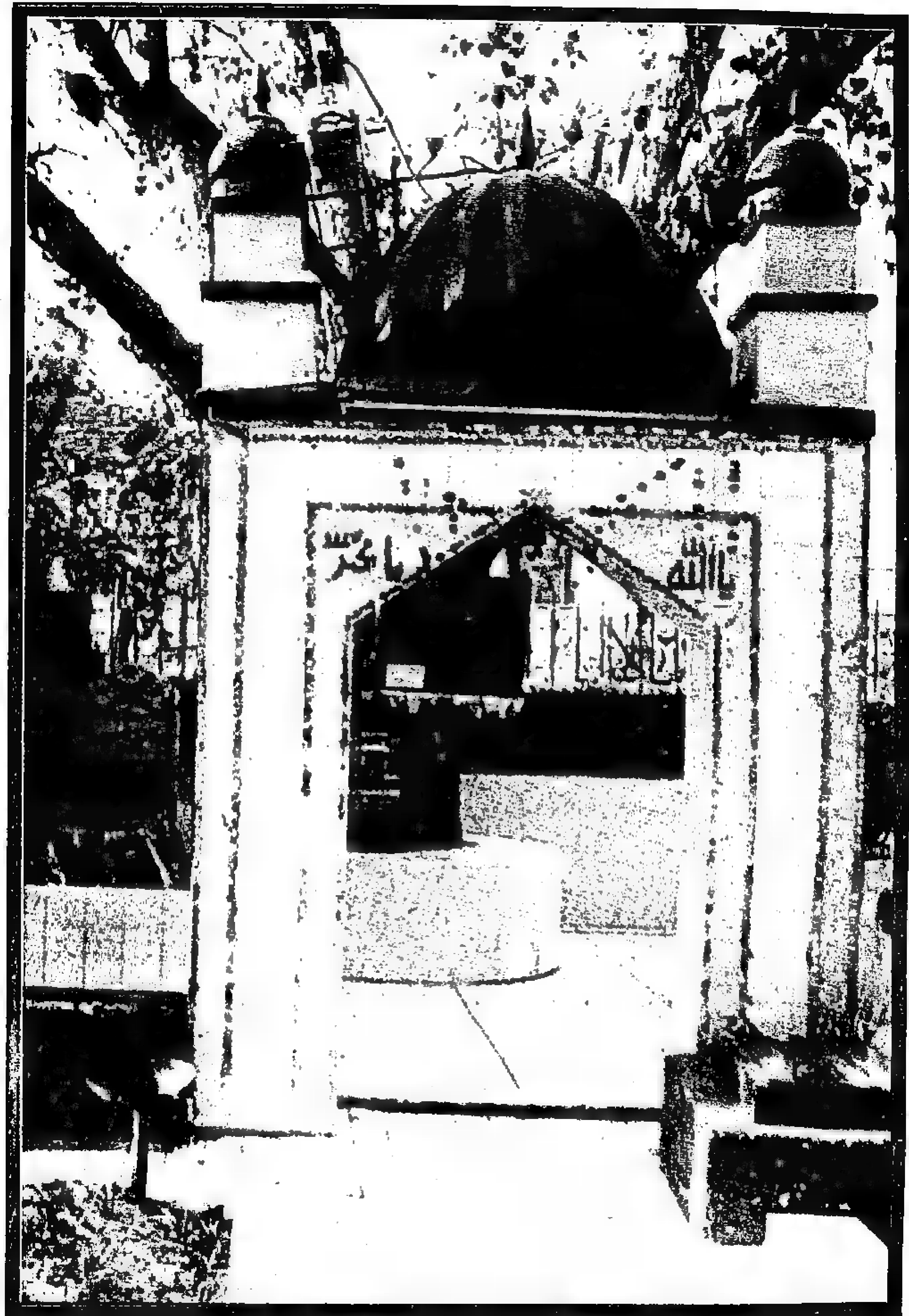
آپ کا شجرۂ طریقت حضرت سیدنا غوث الاعظمؒ تک اس طرح منتہی ہوتا ہے: (1) سید محمود حضوری (2) سید شمس الدین (3) سید یعقوب (4) عبدالقادر (5) سید علی (6) سید مسعود (7) سید احمد (8) سید اصغر (9) ابوالفرح (10) سید عبدالوہاب (11) حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

آپ نے 17 ربیع الثانی 942ھ مطابق 1535ء میں بعد سلطان نصیر الدین ہمایوں وفات پائی۔ اس وقت لاہور کا گورنر مرزا کامران تھا۔

آپ کا مزار مبارک علامہ اقبال روڈ (بالمقابل مین بازار گڑھی شاہو) پر آپ کے پوتے حضرت سید جان محمد حضوری کے مقبرہ کے قریب زیارت گاہ خلائق ہے۔ آپ کے مزار کے ساتھ دوسری قبر آپ کے صاحبزادے حضرت سید شاہ نور حضوری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہے۔

حضرت شاہ نور حضوری

آپ نے ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد حضرت سید محمود حضوری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے حاصل کی۔ ان کے وصال کے بعد سجادہ کو رونق بخشی اور بے شمار گم کردہ راہ خلق خدا کو ہدایت کی روشنی دکھائی اور صراط مستقیم پر گامزن فرمایا۔ "مدینتہ الاولیاء" میں "گنج تاریخ" کے حوالہ سے درج ہے کہ آپ کی وفات 997ھ مطابق 1588ء میں ہوئی۔ اس وقت ہندوستان پر جلال الدین اکبر حکمران تھا اور لاہور کا گورنر راجہ بھگونت داس تھا۔



مزار حضرت سید بہاؤالدین جھولن شاہ بخاریؒ

بچپن ہی میں آپ کی ولایت کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی۔

سید بہاؤالدین چھولن شاہؒ

حضرت سید بہاؤ الدین جھولن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ
(المعروف حضرت گھوڑے شاہؒ)

(المتوفی 1003ھ/1594ء)

نام نامی سید بہاؤ الدین' والد ماجد کا اسم گرامی سید شاہ محمد بن سید عثمان شاہ جھولہ بخاری آپ کے آباء کی نسبت حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ تک پہنچتی ہے (یہ شجرۂ نسب آپ حضرت سید عثمان شاہ جھولہ بخاری کے حالات میں پڑھ چکے ہیں)

آپ مادر زاد ولی تھے۔ پانچ سال ہی کی عمر میں آپ سے کرامات و برکات ظاہر ہونے لگی تھیں۔ بچوں کا یہ زمانہ کھلونوں کے ساتھ لطف اندوز ہونے میں گزرتا ہے۔ سید بہاؤ الدینؒ کو گھوڑوں کے کھلونے بہت پسند تھے۔ جو ضرورت مند مٹی کا گھوڑا لے کر آپ کی خدمت میں آتا۔ آپ اس کے لیے دعائے خیر فرماتے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مراد پوری فرما دیتا۔ اس طرح آپ کی ولایت کی شہرت دور دور تک پہنچی اور لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ جب آپ کے والد ماجد حضرت سید شاہ محمدؒ کو یہ معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ یا اللہ یہ بچہ تیرے اسرار ظاہر کرنے کا سبب بنا ہے۔ اس کا دنیا سے اٹھ جانا ہی بہتر ہے۔ دعا کا یہ تیر نشانے پر لگا اور حضرت سید بہاؤ الدین جھولن شاہ بخاریؒ اسی وقت (11 ربیع الاول 1003ھ بمطابق 14 نومبر 1594ء میں) وفات پا گئے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک دس برس تھی۔ یہ زمانہ ہندوستان میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی حکمرانی کا تھا۔

آپؒ کا مزار لاہور کے مشہور ترین مزارات میں سے ہے۔ جس سڑک پر آپ کا مزار مبارک ہے وہ "حضرت گھوڑے شاہ روڈ" کے نام سے موسوم ہے۔

خزینۃ الاصفیاء میں آپ کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے:

شاہ جھولن چوں ز دنیا رخت بست
سالِ وصلِ آں ولیِّ بحر و بر
عالمِ "اسرار جھولن شاہ داں"
نیز جھولن شاہ "شاہ نامور"

1003ھ

حضرت سید کامل شاہ قادری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

(المتوفیٰ 1005ھ)

آپ کا تعلق سادات بخارا سے ہے۔ وہیں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ پھر شیخ اللہ داد بداری کے دست حق پرست پر بیعت کی اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں خرقہ خلافت و فقر حاصل کیا۔

آپ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد حکومت میں بخارا سے بغرض تبلیغ لاہور تشریف لائے اور شہر لاہور سے باہر علاقہ "بابو سابو" کے قریب قیام فرمایا۔ "بزرگان لاہور" میں ہے کہ آپ اسم بامسمّٰی اور شیخ کامل تھے۔

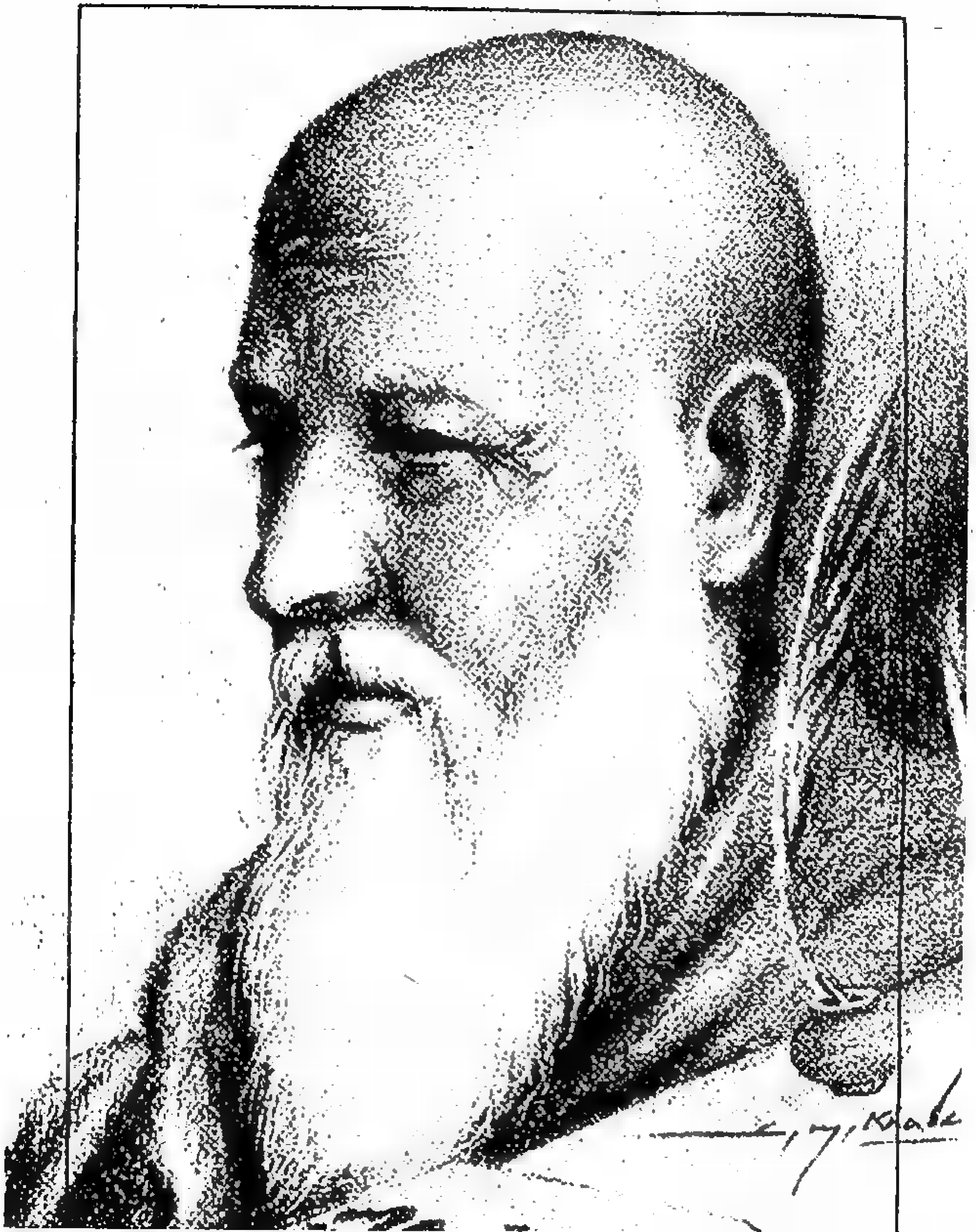
"خزینتہ الاصفیاء" کے مطابق علوم ظاہری و باطنی میں ممتاز تھے۔ عبادت و مجاہدہ' زہد و ورع اور شجاعت و توکل میں راسخ القدم تھے۔ لوگوں میں دیوان کامل کے نام سے مشہور تھے۔

لاہور میں بے شمار لوگ گناہوں سے تائب ہو کر آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ عوام و خواص سب کی محبت کا مرکز تھے۔

7 صفر 1005ھ مطابق 20 ستمبر 1596ء کو فوت ہوئے۔ وفات کے بعد آپ کو "بابو سابو" میں اسی جگہ دفن کیا گیا' جہاں بیٹھ کر آپ ہدایت خلق کا کام کرتے تھے۔ آپ کے ایک مرید عبدالرحیم نے (جو شاہی سپردار تھے) آپ کے مزار پر گنبد بنانا چاہا تو آپ نے خواب میں اسے اس ارادہ سے منع کر دیا اور فرمایا: میرے لیے یہ کچا مزار ہی بہت بہتر ہے۔

خزینتہ الاصفیاء میں مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کا یہ قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے:

جنابِ شیخ کامل صدرِ دیواں
بعلمِ عشقِ کامل، قطبِ عالم
ندا شد بہر سالِ انتقالش
کہ شاہنشاہ کامل قطبِ عالم
1005ھ



حضرت شاہ حسینؒ لاہوری

حضرت شاہ حسین لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1008ھ/1599ء)

سولھویں صدی عیسوی اپنا نصف سفر پورا کر چکی تھی۔

اللہ کے ایک ولی بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے دوران مشہد (ایران) میں حضرت سیدنا امام رضاؒ کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ وہ مراقبے میں تھے کہ حکم ملا وہ اپنی سیاحت کا سلسلہ ختم کر کے فوراً لاہور جائیں' اور وہاں ایک نوجوان کو (جو ان کا منتظر ہے) اپنی خصوصی توجہ سے نوازیں۔ حکم پاتے ہی وہ بزرگ لاہور روانہ ہو گئے اور یہاں پہنچ کر دریائے راوی کے قریب ایک مسجد شیخ ابوبکر میں قیام فرمایا۔ اتفاق سے اس وقت مسجد میں پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ بزرگ نے اس سے کہا: میاں صاحبزادے! ذرا جاؤ اور مجھے وضو کے لیے لوٹے میں پانی لا دو۔ لڑکا لپک کر گیا اور دریائے راوی سے پانی کا ایک لوٹا بھر لایا۔ بزرگ نے وضو کرے نماز ادا کی اور ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ لڑکے نے ان سے درخواست کی: یا حضرت! مجھے اپنا مرید بنا لیجئے۔ بزرگ سمجھ گئے کہ ▪ اسی کی خاطر طویل سفر کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ انہوں نے لڑکے کو تازہ وضو کرنے کی ہدایت فرمائی اور پھر اسے سلسلہ قادریہ میں بیعت کر لیا۔

سلسلہ قادریہ میں بیعت لینے والے اللہ کے یہ ولی حضرت بہلول دریائیؒ تھے اور مرید ہونے والے نوجوان حضرت شاہ حسینؒ تھے' جو بعد میں بڑے ولی بنے اور جن کی لکھی ہوئی پنجابی کافیوں کی آج ہر طرف دھوم ہے۔

شاہ حسینؒ 945ھ مطابق 1538ء میں لاہور کے علاقہ اندرون ٹکسالی گیٹ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد ▪ نام نامی عثمان تھا' جو بہت نیک بزرگ تھے اور رزق حلال کی خاطر پارچہ بافی کا کام کرتے تھے۔ شاہ حسین کے دادا کلس رائے نے' جو راجپوت خاندان سے

تعلق رکھتے تھے' فیروز شاہ تغلق کے عہد میں برضا و رغبت اسلام قبول کیا تھا۔

شاہ حسینؒ نے دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ پھر مسجد میں دینی تعلیم حاصل کی' جہاں مولانا محمد اکبر سے تفسیر' حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ لڑکپن ہی میں انہوں نے اپنی ظاہری تعلیم مکمل کر لی' اور پھر ایک اشارۂ غیبی کے تحت ایک درویش حضرت بہلول دریائی کے مرید ہو گئے' جو حضرت امام بری شاہ لطیفؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ (حضرت بہلولؒ کا مزار چنیوٹ ضلع جھنگ میں زیارت گاہ خلائق ہے)۔

کچھ دنوں کے بعد شیخ بہلولؒ لاہور سے روانہ ہونے لگے' تو شاہ حسینؒ کو آستانہ سید علی ہجویریؒ پر چھوڑ گئے اور ہدایت فرمائی کہ اب یہیں بیٹھ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہیں۔ چنانچہ شاہ حسین بارہ برس تک آستانہ عالیہ حضرت شیخ علی ہجویری (المعروف گنج بخشؒ) پر حاضر رہ کر ذکر و وظائف اور تلاوت و اعتکاف میں مشغول رہے۔

چھتیس برس کی عمر میں انہوں نے تفسیر مدارک پڑھنے کے لیے شیخ سعد اللہ کی شاگردی اختیار کی' جن کے علم و فضل کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ اسی تفسیر کے درس کے دوران ایک روز یہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ شہزادہ دارا شکوہ اپنی تصنیف "شطحیات" میں لکھتا ہے کہ شاہ حسینؒ جب تفسیر پڑھتے ہوئے آیت ما الحیوۃ الدنیا الا لھو و لعب (یعنی دنیا کی زندگی تو محض لہو و لعب ہے) پر پہنچے' تو انہوں نے استاد کی خدمت میں عرض کی کہ وہ انہیں اس آیت کے باطنی معنی بتائیں۔ استاد نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی' لیکن شاہ حسین مطمئن نہ ہو سکے' وہ وارفتگی کے عالم میں اٹھے اور اپنی تمام کتابیں مسجد کے کنوئیں میں ڈال دیں۔ بعد ازاں انہوں نے سرخ پیراہن پہن لیا' اور ان پر مجذوبیت کی کیفیت طاری رہنے لگی۔

"کلام شاہ حسینؒ" کے مرتب ڈاکٹر سید نذیر احمد کا کہنا ہے کہ شاہ حسینؒ نے یہ وضع اپنے آپ کو شہنشاہ اکبر کی گرفت سے بچانے کے لیے اختیار کی تھی' کیونکہ شاہ حسین پر اکبر کے مشہور باغی دلا بھٹی کے حلیف ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ اس کی تائید صاحب خزینۃ الاصفیاء کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس روز لاہور کے کوتوال نے دلا بھٹی کو سرعام پھانسی پر لٹکایا' اسی روز شاہ حسین بھی کوتوال کے پاس حراست میں تھے۔

دور مجذوبیت میں بھی عوام و خواص انہیں خدا رسیدہ ولی سمجھتے تھے۔ شاہی امراء نیاز مندی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرتے اور نذریں پیش

کرتے تھے۔ مدینۃ الاولیاء کے مؤلف (محمد دین کلیم) کے مطابق عبدالرحیم خانخاناں کو جب شہنشاہ اکبر نے ٹھٹھہ کی تسخیر کے لیے ایک لشکر جرار دے کر بھیجا' تو اس نے خاص طور پر فتح کے لیے شاہ حسینؒ سے دعا کی درخواست کی' چنانچہ ٹھٹھہ آپ کی دعا سے فتح ہوا۔

ایک روایت کے مطابق جب آپ کے مرشد شیخ بہلول دریائیؒ کو آپؒ کی اس مجذوبیت کا حال معلوم ہوا' تو وہ خاص طور پر لاہور آئے اور پھر یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے کہ شاہ حسینؒ کی باطنی حالت انتہائی اچھی ہے۔ مولوی عمر خاں کی تالیف "حسنات العارفین" میں ہے کہ شاہ حسین کے بے شمار مریدین تھے۔ "حقیقت الفقراء" کے مؤلف نے آپ کو خلفاء و مریدین کی تعداد نو ہزار سے زیادہ لکھی ہے۔ آپ کے اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ فاضل اجل ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی ایک بار آپ سے مرید ہونے کی درخواست کی' لیکن شاہ حسینؒ نے انہیں ہاتھ جوڑ کر یہ کہتے ہوئے ٹال دیا کہ مولانا! کیوں مجھے شہر میں خوار کرنا چاہتے ہیں!

شہزادہ سلیم (جو اکبر کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے نام سے تخت نشین ہوا) شاہ حسین کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مغلیہ حکومت کے ایک افسر اعلیٰ بہار خاں کو خاص اس مقصد کے لیے لاہور بھیجا کہ وہ دن بھر شاہ حسینؒ کے ساتھ حاضر رہے اور ان کی گفتگو (ملفوظات) قلم بند کرتا رہے۔ اس کی کتاب "بہاریہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔

عوام و خواص کی طرف سے اس قدر عزت و تکریم کے باوجود شاہ حسینؒ کی خاکساری اور فروتنی کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کوئی پوچھتا کہ تم کون ہو؟ تو وہ جواب دیتے۔

فقیر حسین جلایا' نہ اس مول' نہ لاہا
نہ گھر باری' تو مسافر' جو آہا سو آہا

یہ بے نفسی اور فروتنی ان کا خاص مسلک تھا' چنانچہ ایک کافی میں فرماتے ہیں۔

ہور بھی نیواں ہو' او فقیرا' ہور بھی نیواں ہو
پاویں گا دیدار صحب دا' ہور بھی نیواں ہو

لیکن اس عجز و انکسار کے باوجود وہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے نہ دبتے تھے۔ ایک تاریخی روایت کے مطابق ان کے زمانے میں مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری

کا بڑا شہرہ اور دبدبہ تھا۔ دربار شاہی میں انہیں شرع اسلامی کا ستون سمجھا جاتا تھا۔ کتنے ہی انسانوں کی گردنیں وہ رافضی ہونے کا الزام لگا کر کٹوا چکے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان مخدوم الملک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے شہنشاہ اکبر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ملک میں جو بدعقیدہ لوگ ہیں' ان کا استحصال کیا جائے۔ چنانچہ عام دار و گیر شروع ہوئی اور بہت سے لوگ ان کے ایماء پر قتل اور قید کئے گئے۔ یہی مخدوم الملک ایک بار لاہور آئے تو شاہ حسین نے سر راہ ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی' اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم کب تک اللہ کی مخلوق کے سر کٹواتے رہو گے' اللہ سے ڈرو۔ تم جس کو چاہتے ہو' فاسق کہہ کر مروا دیتے ہو' حالانکہ تم خود بھی کم فاسق نہیں ہو۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ تم دو ارکان اسلام کے تارک ہو۔ تم استطاعت رکھنے کے باوجود فریضہ حج ادا نہیں کرتے' اور نہ ہی تم نے اس قدر مال اور دولت رکھنے کے باوجود کبھی زکوٰۃ دی ہے۔ (یہ تاریخی واقعہ "مفتاح العارفین" میں حضرت شیخ معصوم سرہندی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔)

ڈاکٹر سید نذیر احمد لکھتے ہیں کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے آخری ایام میں اس جذب و سرمستی سے دوبارہ سلوک کی طرف لوٹ آئے تھے' اور انہوں نے شریعت کی اس پابندی کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا' جس کو ایک عرصہ تک انہوں نے عوام سے پوشیدہ رکھا تھا۔

شاہ حسین کا انتقال 1008ھ مطابق 1599ء میں بعمر تریسٹھ سال لاہور میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے نومسلم مرید اور محبوب خلیفہ حضرت مادھو لال ان کے جانشین ہوئے۔

مادھو لال

مادھو رام' حضرت شاہ حسینؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہونے کے بعد مادھو لال حسین کے نام سے مشہور ہوئے۔ قبولِ اسلام سے قبل ان کا تعلق ہندوؤں کے برہمن خاندان سے تھا۔ ان کو عمر سترہ برس کی تھی' جب وہ شاہ حسینؒ سے بیعت ہوئے۔ شاہ حسینؒ نے مادھو رام کا اسلامی نام "محبوب الحق" رکھا۔

مادھو اپنے مرشد سے انتہائی درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے اور ایک لمحہ کے لیے

بھی ان سے جدا نہ ہوتے تھے۔ اسی طرح شاہ حسینؒ بھی اپنے اس محبوب مرید کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ (ان کے تفصیلی حالات آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے)۔

شاہ حسینؒ کی تعلیمات

شاہ حسین نے صوفیانہ عقائد و تعلیمات کے فروغ کے لیے شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ انہیں سماع سے بہت شغف تھا۔ وہ پہلے صوفی شاعر ہیں جنھوں نے پنجابی زبان میں کافیاں لکھیں اور ان کی بنیاد باقاعدہ راگ راگنیوں پر رکھی۔ وہ راگ راگنیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کافیاں ہر سننے والے کو متاثر کرتی ہیں۔ اپنی کافیاں وہ لاہور کے گلی کوچوں میں خود گاتے تھے اور لوگوں کو خودشناسی اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا درس دیتے تھے۔ صوفیانہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے وہ اخلاص عمل پر بہت زور دیتے تھے۔ انہوں نے بگڑے ہوئے معاشرے کی معاشی' سماجی اور اخلاقی اصلاح کے لیے نچلی سطح کے عوام سے لے کر بلند و بالا محلوں میں رہنے والوں کو یاد دلایا کہ انہوں نے ہمیشہ اس دنیا میں نہیں رہنا۔ ان کو اس اگلے جہاں کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ جہاں انہوں نے ابدالآباد تک رہنا ہے۔ وہ امیروں سے خاص طور پر یہ کہتے کہ وہ اپنی دولت سے غریبوں کو ضرور حصہ دیں۔ وہ ظاہر اور باطن دونوں کی بالیدگی اور پاکیزگی پر زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ریاکاری سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کو چاہیے وہ جیسا اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے' ویسا ہی اسے اندر سے بھی ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں۔

عاشق ہوویں تاں عشق کماویں
راہ عشق دا سوئی دا نکا۔ دھاگہ ہوویں تاں ہی جاویں
باہر پاک' اندر آلودہ۔ کیا توں شیخ کہاویں
کہے حسین۔ جے فارغ تھیویں' تاں خاص مراتبہ پاویں

وہ انسان کو بتاتے ہیں کہ وہ فانی ہے۔ جس مال و دولت کے حصول کے لیے وہ دن رات سرگرداں ہے وہ سب کچھ جلد ہی یہاں چھوڑ کر اسے آگے چلے جانا ہے۔ ایک کافی میں کہتے ہیں۔

پیارے لال! کیا بھرواسا دم دا
اڈیا بھور' تھیا پردیسی' اگے راہ اگم دا

کوڑی دنیا، کوڑ بسارا، جیوں موتی شبنم دا
جنہاں میرا شوہ رجھایا، تینہاں نوں بھو، جم دا
کہے حسین فقیر سائیں دا، چھوڑ سریر بھسم دا

شاہ حسینؒ جس طرح انسان کو باطن کی اصلاح اور نیک عمل کرنے کا درس دیتے ہیں اور ظاہر پرست اور ریاکار لوگوں کو موت اور حشر کے عذاب سے ڈراتے ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دوستی رکھنے والوں کو آخرت میں کسی قسم کا کوئی خوف اور اندیشہ نہ ہو گا۔

غم تینہاں کیہا اڑیا، سائیں جنہاں دے ول
موہنی صورت دلبر والی، رہی اکھیں وچ گل
اک پل سجن جدا نہ تھیوے، بیٹھا اندر مل
کہے حسین فقیر سائیں دا، چلنا اج کہ کل

وہ کہتے ہیں کہ آخرت میں (جو ضرور واقع ہو کر رہے گی) نجات کا دارومدار صرف اعمال پر ہو گا۔ وہاں نہ ذات پات کام آئے گی، نہ دنیاوی مال و دولت اور نہ عزت و جاہ۔

عملاں اپر ہوگ نبیڑا، کیا صوفی کیا بھنگی
جو رب بھاوے سو ای تھیسی، سو ای بات ہے چنگی
آپے ایک انیک کہاوے، آپے ہے بہہ رنگی
کہے حسین، سہاگن سو ای، شوہ دے رنگ جو رنگی

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے شاہ حسین کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کی صوفیانہ شاعری میں پنجاب کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ مغل شاہزادوں کے مقرب ہوتے ہوئے بھی اپنے عوام کے سچے نمائندہ تھے۔ حضرت شاہ حسین رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ بازاروں اور گلیوں میں گھوم پھر کر اپنی شیریں آواز میں یہی ایک پیغام انسانوں تک پہنچاتے تھے کہ

نی تینوں رب نہ بھلی، دعا فقیراں دی ایہا
رب نہ بھلی، ہور سبھ کجھ بھلی، رب نہ بھلن جیہا



مزار حضرت موج دریا بخاریؒ

محبت سخت سے سخت دل کو بھی جیت سکتی ہے۔

(حضرت موج دریا بخاریؒ)

حضرت میراں محمد شاہ المعروف موج دریا بخاری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1013ھ/ 1604ء)

975ھ کا زمانہ ہے۔

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر چتوڑ کی فتح کے لیے ایک لشکر جرار کے ساتھ وہاں پہنچا۔ راجپوتوں نے ایسی شدید مزاحمت کی چتوڑ کا قلعہ مسلسل پانچ ماہ کی زبردست جنگ کے باوجود فتح نہ ہو سکا۔ اکبر سخت پریشان تھا' اسی موقع پر اسے کسی نے مشورہ دیا کہ اوچ شریف میں ایک مستجاب الدعوات بزرگ رہتے ہیں۔ قلعہ چتوڑ کی فتح کے لیے ان سے دعا کرانی چاہیے۔ یقین ہے ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد فرمائے گا۔ اکبر نے فوراً چند قابل اعتماد امراء اوچ شریف روانہ کئے اور ان کی وساطت سے بزرگ کی خدمت میں دعا کی درخواست کی۔ بزرگ نے بادشاہ کا یہ پیغام سن کر شاہی امراء سے فرمایا: تم واپس جاؤ۔ میں بہت جلد خود چتوڑ پہنچ جاؤں گا۔ امراء نے عرض کی: یا حضرت! شاہی لشکر میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ آپ وہاں تشریف لائے ہیں۔ فرمایا: ایک رات نہایت تیز آندھی آئے گی' جس سے تمام خیمے اکھڑ جائیں گے۔ قناتیں گر پڑیں گی۔ آگ کے الاؤ' مشعلیں اور چراغ سب بجھ جائیں گے۔ ہر طرف تاریکی چھا جائے گی۔ اس وقت صرف ایک خیمے میں چراغ جل رہا ہو گا۔ یہی خیمہ ہماری قیام گاہ ہو گا۔

محترم بزرگ کا یہ ارشاد سن کر شاہی امراء واپس چلے گئے۔ جس دن وہ چتوڑ پہنچے اور بادشاہ کو آپ کا پیغام سنایا۔ اسی شب ہولناک آندھی آئی۔ تمام شامیانے اور خیمے گر گئے۔ شمعیں اور چراغ گل ہو گئے۔ تاہم میدان جنگ سے کچھ دور ایک خیمے میں چراغ جل رہا تھا۔ بادشاہ اور فوجی سردار اس خیمے کی طرف لپکے۔ قریب جا کر بادشاہ نے سرداروں کو خیمے کے باہر روکا اور خود ننگے پاؤں ادب سے بزرگ کی خدمت میں حاضر

ہوئے تھے۔ اس وقت بزرگ سب اطراف میں محو دعا تھے۔ [illegible] شہنشاہ [illegible]
[illegible] قلعہ کی فتح [illegible] قلعہ فتح ہو
جائے گا۔ بزرگ خود قلعہ کے قریب تشریف لے گئے اور زبان مبارک سے فتح یا
[illegible]
دے کر جمعہ کے روز شہنشاہ اکبر نے قلعہ پر ایک زوردار حملہ کیا اور اسے فتح
کر لیا۔

یہ شعبان 975ھ کا ایک دن تھا جب ایک بزرگ کی دعا سے پانچ ماہ انیس دن کے محاصرے کے بعد بلند و بالا ناقابل تسخیر قلعہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔

چتوڑ کی فتح کے بعد شہنشاہ اکبر نے بزرگ محترم کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ ان کے ساتھ شاہی محل میں قیام فرما کر اس کی سرپرستی فرمائیں، لیکن بزرگ نے فرمایا: میں فقیر آدمی ہوں، شاہی محلوں سے میرا کیا تعلق؟ شہنشاہ نے نوراج نگر (گورداسپور) میں بزرگ محترم کو جاگیریں پیش کیں اور خطیر رقم نقد بطور نذرانہ پیش کی۔ لیکن حضرت نے فرمایا: مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ جب بادشاہ نے بہت اصرار کیا تو آپ نے یہ نذر قبول فرمائی۔

پھر بادشاہ نے درخواست کی کہ آپ دہلی یا لاہور جہاں رہنا چاہیں، رہیں۔ مجھے اس سے خوشی ہوگی، اس پر آپ نے لاہور رہنا قبول فرمایا۔

قلعہ چتوڑ کے لیے فتح و نصرت کی دعا کرنے والے جلیل القدر بزرگ حضرت سید میراں محمد شاہ تھے۔ جنہیں آج ہم سب حضرت موج دریا بخاریؒ کے نام سے جانتے ہیں۔

حضرت سید موج دریا بخاریؒ 940ھ (مطابق 1533ء) کو اوچ شریف میں پیدا ہوئے۔ متحدہ پاک و ہند پر اس وقت مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں حکومت کرتا تھا۔

حضرت صحیح النسب سید تھے۔ آپ کے اجداد میں سب سے پہلے حضرت سید جلال الدین سرخ بخارا سے ہجرت کر کے متحدہ پاک و ہند تشریف لائے۔ کچھ عرصہ بھکر (سندھ) میں قیام فرمایا۔ پھر کئی سال اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کی خدمت میں ملتان رہے۔ مرشد کی وفات کے بعد اوچ شریف چلے گئے اور وہیں اقامت اختیار فرمائی۔ حتیٰ کہ 975ھ میں حضرت موج دریا بخاریؒ اوچ سے نقل مکانی کر کے لاہور تشریف

لائے اور مستقل طور پر یہیں رہائش اختیار کی۔

حضرت انتہائی سخی اور دریا دل تھے' اسی باعث وہ خلقت میں موج دریا کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ نے اپنی جاگیر کی ساری آمدنی (جو شہنشاہ اکبر نے دی تھی) خلق خدا کی بہبود کے لیے وقف کر دی۔ لاہور' موضع خاں فتا (متصل پھالیہ) اور موضع پسیانوالہ (نواح بٹالہ ضلع گورداسپور) میں آپ نے تین لنگر خانے تعمیر کیے جہاں دن رات غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا جاتا۔ مسافر اور مقامی لوگ بھی اس سے مستفید ہوتے۔ لاہور کے وسیع لنگر خانے کے ساتھ آپ نے ایک درسگاہ بھی قائم کی' علماء و فقراء کے لیے مکانات بھی بنوائے اور درویشوں اور مسافروں کے لیے مہمان خانے بھی تعمیر کرائے۔ کئی کنویں کھدوائے۔ یہ سب عمارات ایک مربع میل کے احاطے میں اس جگہ موجود تھیں' جہاں آج کل آپ کا مزار مبارک ہے۔

تذکرہ موج دریا بخاری" میں طالب ہاشمی نے آپ کی بعض کرامات تحریر کی ہیں' جو یہاں درج کی جاتی ہیں:

(1) ایک روز ایک بدعقیدہ شخص حضرت موج دریا کی مجلس میں آیا اور کہا کہ پنجابی کا مقولہ ہے "سید سنی نہیں' کاٹھ دی کنی نہیں" یعنی سید سنی نہیں ہوتا اور دیگچی لکڑی کی نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی کہا کہ سیدوں کا آگ میں بال تک نہیں جلتا۔ اب ایسے سید کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

یہ سنتے ہی حضرت موج دریا بخاری" جلال میں آ گئے۔ لکڑی کی ایک ہنڈیا منگوائی اور اپنے دونوں پاؤں کا چولہا بنا کر اس میں آگ جلوائی۔ پھر ہنڈیا آگ پر رکھ کر اس میں چاول پکائے اور اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا: دیکھ' یہ سید سنی ہے اور ہنڈیا لکڑی کی اور آگ نے سید کے پاؤں نہیں جلائے۔

وہ شخص یہ کرامت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ آپ کے قدموں میں گر پڑا اور سچے دل سے توبہ کی۔

(2) ایک روز حضرت موج دریا بخاری" اپنی درسگاہ پر بیٹھے تعلیم دے رہے تھے کہ زمینداروں کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا حضرت! ہمارے علاقہ مزنگ اور گرد و نواح کے کنوؤں کا پانی بہت کھاری اور نمکین ہے' جس سے ہماری فصلیں برباد ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے لیے دعا فرمائیں کہ یہ پانی شیریں ہو جائے۔

حضرت نہایت رحم دل اور کریم النفس تھے۔ فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ کے حضور دعا مانگی کہ بار الہا! مزنگ کے کنوؤں کا پانی میٹھا فرما دے۔ اللہ کی قدرت سے اس علاقے کے تمام کنوؤں کا پانی میٹھا ہو گیا اور آج تک میٹھا ہے۔

(3) ایک روز لنگر خانے کا مہتمم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی لگاتار بارشوں کی وجہ سے چاولوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں لنگر خانہ تک نہیں پہنچ سکیں اور خلقت کھانے کے لیے بے تاب ہے۔

حضرت نے فرمایا: لنگر خانے میں کس قدر چاول موجود ہیں؟

عرض کی: بس ایک دیگ پک سکتی ہے' جبکہ کھانے والے بے شمار ہیں۔

فرمایا: کوئی مضائقہ نہیں' ایک دیگ چولہے پر چڑھا دو' اور اس میں ہم وزن چاول' گھی اور گوشت ڈال کر پکاؤ۔

اس ارشاد کی تعمیل کی گئی۔ آپ نے دیگ لنگر خانے میں رکھوا دی اور اس پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ پھر فرمایا: اب جس قدر ضرورت ہو' اس دیگ سے چاول نکالتے جاؤ۔ لنگر خانے کے ملازموں نے ایسا ہی کیا۔ ہزاروں لوگوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور گھروں کو بھی لے گئے۔ دیگ کے چاول ختم ہونے میں نہ آتے۔ یہ کیفیت سات یوم تک رہی۔ اس دوران میں جب بھی چاول نکالے جاتے' وہ اس قدر گرم ہوتے جیسے دیگ ابھی ابھی چولہے سے اتاری گئی ہے۔ اس اثناء میں بارشیں تھم گئیں اور کافی مقدار میں چاول لنگر خانے میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد حسب سابق لنگر کا انتظام جاری ہو گیا۔

وصال

رشد و ہدایت' شریعت و طریقت' جود و سخا' فقر و استغنا' زہد و اتقا اور علم و عمل کا یہ آفتاب جو پورے تہتر برس تک خطہ پنجاب پر ضیاء بار رہا' 17 ربیع الثانی 1013ھ (مطابق 1604ء) کو غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وصال کے وقت حضرت بٹالہ (بھارت) سے تین کوس دور اپنی جاگیر میں رونق افروز تھے۔ وہیں آپ کو غسل دیا گیا اور کفن پہنایا گیا۔ وہاں سے آپ کی وصیت کے مطابق میت مبارک کو لاہور لایا گیا اور موجودہ مقبرہ میں دفن کیا گیا۔

رائے بہادر کنہیا لال نے "تاریخ لاہور" میں لکھا ہے کہ موجودہ مقبرہ جہاں حضرت مدفون ہیں شہنشاہ جلال الدین اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔

حضرت سید شمس الدین قاری قادری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1021ھ)

حضرت سید شمس الدین قاری قادری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے کسی تذکرہ نگار نے آپ کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید علم الدین ابو ہاشم بدخشانی ہے۔ شجرۂ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

آپ کی پیدائش سے قبل آپ کے خاندان میں لڑکوں کی تعداد کم تھی۔ والد ماجد سید علم الدین اکثر اس وجہ سے فکر مند رہتے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ کو ان کے ہاں لڑکے کی پیدائش منظور نہیں۔ اس غم میں ایک رات سوئے تو خواب میں حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے فرمایا۔ "علم الدین! غم نہ کرو' اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا' اس کا نام شمس الدین رکھنا۔" صبح آپ نے اس خواب کا ذکر اپنی نیک اور عبادت گزار اہلیہ حضرت سیدہ بی بی صالحہ سے کیا' تو وہ سجدۂ شکر بجا لائیں۔

آپ چار سال کے ہوئے تو آپ کو مقامی مدرسہ میں داخل کیا گیا جہاں آپ نے بہت کم وقت میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ پھر ابتدائی دینی کتابیں پڑھیں۔ ان دنوں کشمیر کے فاضل جلیل حضرت سید کمال الدین کاشمیری کا بڑا شہرہ تھا۔ آپ کے والد ماجد آپ کو ساتھ لے کر کشمیر میں ان کی خدمت میں پہنچے اور سید کمال الدین کی خدمت میں درخواست کی کہ میرے بیٹے سید شمس الدین کو اپنی شاگردی میں قبول فرمائیں۔ بزرگ استاد نے اس کو بخوشی منظور فرمایا۔ آپ پندرہ سال تک کشمیر میں حضرت سید کمال الدین کی خدمت میں رہے اور مختلف علوم پر دسترس حاصل کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد استاد نے انہیں تجارت کی طرف راغب فرمایا اور اس مقصد کے لیے کچھ رقم بھی انہیں اپنے پاس سے دی۔ جس سے آپ نے کشمیر سے کچھ مال خریدا اور بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔

بغداد شریف میں اولیائے کبار کے مزارات مقدسہ کی زیارت کے بعد آپ مکہ مکرمہ گئے اور کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد دس سال تک روضہ رسول مقبول ﷺ پر قیام کیا۔ یہاں آپ ہر وقت عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔

آپ کی آواز بڑی شیریں تھی' ایک رات آپ مسجد نبوی میں نہایت خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کلام پاک میں مشغول تھے کہ مسجد نبوی کے امام کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ کی آواز سے متاثر ہو کر وہ آپ کے پاس آئے۔ جب آپ سے گفتگو کی تو آپ کے علم و فضل سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے آپ سے کہا کہ اس جمعہ کو وعظ اور خطبہ کا فریضہ آپ انجام دیں۔ آپ نے بہت معذرت کی اور کہا کہ میں اس لائق نہیں ہوں' لیکن امام مسجد نبوی نے فرمایا کہ میرا حکم ہے۔ یہ سن کر آپ مان گئے۔ لیکن امام مسجد نبوی کے جاتے ہی آپ نے سر سجدہ میں رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگے کہ یا اللہ! میں عجمی' کیونکر منبر رسول ﷺ پر وعظ کہوں گا۔ اسی حالت میں اونگھ آئی' دیکھا کہ دربار رسالت ﷺ میں حاضر ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی وہاں موجود ہیں اور حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر رہے ہیں کہ میں اپنے خاندان کے ایک فرد شمس الدین کو آپ کی خدمت اقدس میں پیش کرتا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ہم نے شمس الدین کو قبول کیا۔ پھر آپ (شمس الدین) کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آنحضور ﷺ نے اپنا لعاب دہن آپ کے منہ میں ڈالا' اسی دوران بے شمار لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کو "قاری' قاری" کہہ کر پکارنے لگے۔ جب آنکھ کھلی تو اس نعمت غیر مترقبہ پر بے حد مسرور تھے۔ جمعہ کے روز آپ نے مسجد نبوی میں وعظ فرمایا تو خلق خدا پر اس قدر اثر ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔

مدینہ منورہ میں ایک رات خواب میں آپ کو حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ "شمس الدین! اب آپ لاہور جائیں اور وہاں فروغ اسلام کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری سنبھالیں۔ وہاں آپ کی ضرورت ہے۔"

آپ لاہور تشریف لائے تو سب سے پہلے حضرت سید علی ہجویری" (داتا گنج بخش)

کے مزار اقدس پر حاضر ہوئے۔ یہیں آپ کی ملاقات حضرت سید ابو اسحاق بخاریؒ سے ہوئی۔ انہوں نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا: شمس الدین! آؤ' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے آپ کو سلسلہ قادریہ میں بیعت فرمایا۔ آپ پندرہ سال تک مزنگ کے محلّہ پیر عزیز میں اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہے۔ حضرت ابو اسحاق بخاریؒ' حضرت سید داؤد بندگی کرمانیؒ کے خلیفہ تھے۔ دادا مرشد کی طرف سے آپ کو شمس الآفاق کا خطاب عطا ہوا۔

حضرت سید شمس الدین قاری قادریؒ کو ان کے مرشد نے خلافت عطا فرمائی تو آپ نے ان کے حکم کے مطابق شہر لاہور کے باہر جنوب مشرقی علاقے میں اس جگہ ڈیرہ لگایا' جہاں آج کل جی او آر I میں آپ کا مزار مبارک ہے۔ اس وقت یہاں ایک وسیع میدان تھا۔

لاہور میں اس جگہ بیٹھ کر حضرت نے فروغ اسلام کے سلسلے کا آغاز فرمایا' جس کی کرنوں سے پورا برصغیر منور ہوا۔ پس شاہجہاں ایام شہزادگی میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپ نے اسے شہنشاہ ہونے کی خوشخبری دی (خزینۃ الاولیاء)

شہنشاہ جہانگیر بھی آپ کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ "بزرگان لاہور" کے مؤلف کے مطابق جہانگیر آپ کا اس قدر معتقد تھا کہ آپ کے حکم سے کبھی انحراف نہ کرتا۔ آپ جب کبھی کسی عاجز' بے وسیلہ کا وسیلہ جمیلہ بن کر سفارش فرماتے تو بادشاہ خوشی سے اس کی حاجت پوری کرتا۔

حضرت امراء اور حکمرانوں سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے' اپنے آپ کو ہمیشہ ان سے دور رکھتے تھے۔ غریبوں میں بیٹھ کر خوش ہوتے اور فرماتے کہ ان میں قبول حق کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کے پاس ہر وقت حاجت مندوں اور دعا کرانے والوں کا ایک جم غفیر جمع رہتا۔ ایک روز سلطان خسرو اپنی فتح کے لیے دعا کرانے کی خاطر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جونہی آپ کو اس کی آمد کی خبر ملی۔ آپ اپنے حُجرہ مبارک میں چلے گئے۔ لوگوں نے بہت تلاش کیا۔ لیکن آپ حجرہ میں کہیں نظر نہ آئے۔ آخر سلطان خسرو کافی دیر بیٹھ کر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خدام نے دیکھا کہ آپ حجرہ کے اندر ہی موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: خسرو کو شکست ہو گی اور اس کے لیے سزائے موت تجویز ہو گی۔ آخر یہی ہوا' سلطان خسرو کو شکست کے بعد لاہور کے ایک باغ

میں پھانسی دے دی گئی۔

آپ ہر وقت یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ آپ کے خلفاء کی تعداد تین سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ جن میں حضرت کرم الدین قادری'' ' حضرت عبداللہ قادری'' اور سید شاہ بہاول قادری'' بہت معروف ہیں۔

حضرت کا وصال 11 رجب 1021ھ (مطابق 28 اگست 1612ء) بروز پیر ہوا۔ اس وقت نواب مرتضیٰ خاں شہنشاہ جہانگیر کی طرف سے لاہور کا گورنر تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کی ہدایت کے مطابق ولی عہد شاہزادہ شاہجہاں نے آپ کا روضہ مبارک بنوایا' جس کے چاروں گوشوں میں چار بلند مینار تھے۔ اس کے ساتھ ایک وسیع باغ تعمیر کرایا جس کا نام شمس باغ رکھا۔ گردش ایام سے اب اس باغ کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ روضہ مبارک کے مینار بھی اب باقی نہیں رہے۔

"اولیائے لاہور" میں ہے کہ یہ عالی شان باغ عہد محمد شاہی تک آباد رہا۔ بعد ازاں سکھوں کے عہد حکومت میں یہ تباہ و برباد ہوگیا۔ سکھ اس باغ کے تمام قیمتی پتھر اتار کر لے گئے۔

حضرت شاہ ابوالمعالیؒ رحمتہ اللہ علیہ

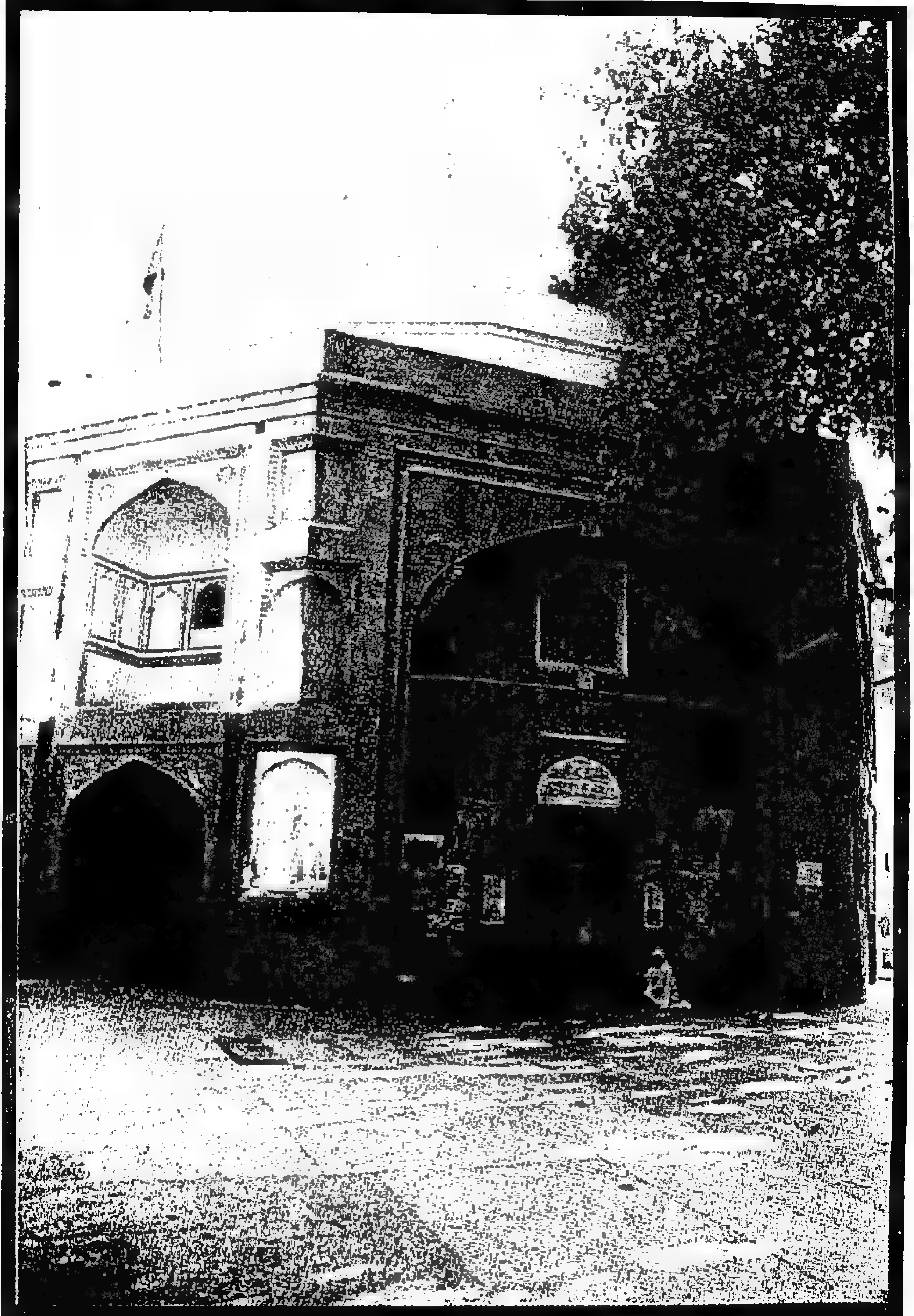
(المتوفی 1024ھ)

لاہور میں جی ٹی روڈ پر انجینئرنگ یونیورسٹی کے سامنے ایک جگہ ہے' جسے بدھو کا آوا کہتے ہیں۔ آوا اردو زبان میں کمہار کی بھٹی کو کہتے ہیں' جس میں وہ کچے برتن پکاتے ہیں۔ آوا اترنا (یعنی برتنوں کا پک کر بھٹی سے باہر نکلنا) آوا بگڑنا (یعنی برتنوں کا خراب ہو جانا) اور آوا چڑھنا (یعنی کچے برتنوں کو پکانے کے لیے بھٹی میں رکھنا) اردو کے مشہور محاورے ہیں۔

خیر' جی ٹی روڈ (لاہور) کے جس آوے کا ہم ذکر کر رہے ہیں' اس کے مالک کا نام محمد تھا۔ یہ بڑا نیک سیرت کمہار تھا۔ آوے کو آگ لگانے سے پہلے یہ غریبوں کو کھانا کھلاتا' اور پھر برتنوں کو پکانے کے لیے آوے میں آگ لگاتا۔ اتفاق سے ایک روز جب یہ آوا چڑھنا تھا' ایک اللہ والے اس راستے سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے جو لوگوں کی بھیڑ دیکھی' تو دریافت کیا' کیا ماجرا ہے؟ جواب ملا آج محمد کے آوے کو آگ لگنی ہے۔ اللہ والے بزرگ بولے: محمدؐ کے آوے کو تو آگ نہ لگے گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا رستہ لیا۔

ادھر صبح سے شام ہو گئی' لیکن آوا تھا کہ اسے آگ ہی نہ لگتی تھی۔ اگلے روز اسے پھر آگ لگانے کی کوششیں شروع ہوئیں' لیکن سب بیکار۔ سب حیران کہ کیا ہوا۔ آخر کچھ لوگوں نے بتایا کہ کل ادھر سے ایک بزرگ گزرے تھے' وہ جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ محمدؐ کے آوے کو تو آگ نہ لگے گی۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ جس بزرگ نے یہ الفاظ کہے تھے' وہ لاہور میں قلعہ گوجر سنگھ کے قریب رہتے ہیں۔

کمہار' ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ حضرت دعا فرمائیں آوا



مزار حضرت شاہ ابو المعالیؒ

عقل محض اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ ہم یہ جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کی اطاعت کیسے کرنی ہے۔

حضرت شاہ ابوالمعالیؒ

آگ پکڑے' میں بہت پریشان ہوں۔ بزرگ نے پوچھا' تمہارا نام کیا ہے؟ بولا: محمد۔ فرمایا: محمدؐ کے آوے کو تو آگ نہ لگے گی۔ یہ سن کر کمہار رونے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایک شخص نے اس کے کان میں کہا: تم بات کو کیوں نہیں سمجھتے' اب جب یہ بزرگ تمہارا نام پوچھیں' تو کہنا' حضرت! میرا نام بدھو ہے۔

کمہار دوبارہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا' اور روتے روتے ان سے دعا کی درخواست کی۔ بزرگ نے پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کی: یا حضرت! میں بدھو ہوں۔ فرمایا: بدھو کے آوے کو آگ لگے گی۔

کمہار خوش خوش گھر آیا' آوے کو آگ لگائی۔ تو فوراً آگ لگ گئی' جب سے اس آوے کا نام "بدھو کا آوا" مشہور ہو گیا۔

یہ اللہ والے بزرگ' جن کی زبانِ مبارک سے جذب کی حالت میں یہ الفاظ نکلے تھے کہ محمد ﷺ کے آوے (امت) کو آگ نہ لگے گی۔ حضرت سید شاہ ابوالمعالی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی 17 نومبر 1552ء (بمطابق 10 ذو الحجہ 960ھ) کو شیر گڑھ (تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ) میں پیدا ہوئے (جج عبداللطیف نے ہسٹری آف لاہور میں اور دوسرے کئی مورخین نے آپ کی جائے پیدائش بھیرہ ضلع شاہ پور لکھی ہے' جو بالکل غلط ہے)۔ آپ کا اسم مبارک خیر الدین تھا۔ ابوالمعالی کا خطاب آپ کے مرشد حضرت داؤد بندگی کرمانیؒ نے عطا فرمایا' اس نام سے آپ اس قدر مشہور ہوئے کہ لوگ اصل نام بھول گئے۔ اس کا ذکر آپ نے اس مصرعہ میں کیا ہے۔

پیر ما نامم ابوالمعالی کرد

والد ماجد کا نام نامی سید رحمت اللہ تھا' جو اپنے زمانے کے جید عالم اور باکمال بزرگ تھے۔ شجرۂ نسب اٹھائیس واسطوں سے سید السادات سید موسیٰ بن امام محمد تقیؒ سے جا ملتا ہے۔ 796ھ میں آپ کے دادا کے دادا سید فیض اللہ اپنے صاحبزادے سید مبارک کرمانی کو لے کر ہندوستان آئے۔ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ نے علوم متداولہ والد ماجد سے حاصل کئے۔ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد آپ کو علوم باطنی کا شوق ہوا۔ حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ سے آپ کو عشق تھا' ان سے اویسی نسبت حاصل تھی۔

ایک روز جذب کے عالم میں شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئے اور کئی سال عبادت و

ریاضت میں مشغول رہے۔ اسی عالم میں ایک روز دہلی کی ایک سرائے میں کسی مجذوب سے ملاقات ہوئی' وہ آپ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا: لوگ سلوک و طریقت کے حصول کے لیے شیخ داؤد کے دروازے پر جاتے ہیں' لیکن تم یہ نعمت جو' گھر میں موجود ہے' چھوڑ کر جنگلوں کی خاک چھان رہے ہو۔

یہ الفاظ سنناتھے کہ حضرت شاہ ابو المعالیؒ بے قرار ہو گئے اور دیوانہ وار شیر گڑھ کی طرف روانہ ہوئے۔ گھر پہنچے تو حضرت شیخ داؤد بندگی کرمانیؒ نے (جو آپ کے حقیقی چچا تھے) دیکھتے ہی پوچھا: میاں! دہلی کے اس مجذوب نے تم سے کیا کہا؟

پھر فرمایا:

"میرے پاس آؤ اور ہمیشہ میرے پاس رہو تاکہ تم کو وہ سب کچھ حاصل ہو' جو کسی دوسری جگہ سے تم ساری عمر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔"

یہ 980ھ کا واقعہ ہے۔ آپ نے حضرت داؤد بندگیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور ان کے زیرِ سایہ روحانیت کی منزلیں طے کرنا شروع کیں۔ مرشدِ کامل نے آپ کو اپنے ایک مرید خاص شیخ عبدالوہاب کے سپرد کیا تاکہ وہ ان کو سلوک و طریقت کے آداب سکھائیں۔ اب آپ کا حال یہ تھا کہ دن بھر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ کئی کئی دن مسلسل روزے رکھتے۔ افطار کے لیے جنگل کی طرف نکل جاتے اور نیلوفر کے سبز پتوں سے افطار کرتے۔ اس سخت ریاضت کی بدولت آپ نے بہت جلد اپنے مرشد کی نظروں میں مقبولیت حاصل کرلی۔ جنہوں نے آپ کو خلعت خلافت سے نوازا۔

جمادی الاول 982ھ کو آپ کے مرشد گرامی نے جو آپ کے چچا اور سسر بھی تھے' رحلت فرمائی تو آپ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ 29 برس تک آپ شیر گڑھ میں مسند داؤدیہ قادریہ کے سجادہ نشین رہے' پھر 1011ھ میں بعہد جلال الدین اکبر بادشاہ مرشد کامل کے روحانی اشارے کے مطابق لاہور آگئے اور موجودہ مقام (نزد قلعہ گوجر سنگھ) پر قیام فرمایا۔ یہاں ایک مسجد تعمیر کی اور خلق خدا کی ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک 51 سال تھی۔

لاہور میں بے شمار گم کردہ راہ انسانوں نے آپ کی بدولت راہِ ہدایت پائی۔ آپ کے بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جو شخص سلسلۂ قادریہ میں آپ سے بیعت کرتا' اسے اسی رات خواب میں حضور غوث الاعظمؒ کی زیارت ہوتی۔ سید ولایت علی شاہ نے

کتاب "تذکرہ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ" میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس سے آپ کی مہمان نوازی کا حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "تمباکو" روحانیت کی راہ میں کس قدر رکاوٹ ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں: "حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کو ہر رات حضرت میراں محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی زیارت ہوتی تھی اور آپ ان سے دینی و دنیوی امور میں رہنمائی حاصل کرتے تھے' لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ آپ کو چند روز کے لیے یہ زیارت ہونا بند ہو گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک روز ایک مہمان آپ کے ہاں آ کر ٹھہرا' وہ حقہ پیتا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے حقہ پینے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ حقہ نہ پیتے تھے' لیکن مہمان کی خاطر آپ نے کسی دوسرے گھر سے حقہ منگوایا اور مہمان کو پیش کیا۔ مہمان نے حقہ پینا شروع کیا تو شکایت کی کہ یہ چلتا نہیں۔ اس پر آپ نے اسے چلانے کے لیے خود ایک دو کش لگائے اور پھر مہمان کو پیش کیا۔ اس رات آپ حضرت غوث الاعظمؒ کی زیارت سے محروم رہے۔ سخت پریشان ہوئے' راتوں کو روتے اور فراق میں کئی غزلیں لکھیں۔ آخر دوبارہ کرم ہوا اور وہ سلسلہ بحال ہوا۔ آپ نے عرض کیا: حضور' اس گنہگار سے کیا خطا ہوئی' جو اس قدر سخت سزا دی گئی۔ حضرت غوث الاعظمؒ نے فرمایا: ابوالمعالی! میں نے تمہاری طرف بہت رجوع کیا' لیکن جب آتا' تمباکو کی بو مجھے سخت پریشان کرتی۔

حضرت شاہ ابوالمعالی عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ غربتی اور معالی تخلص فرماتے۔ تذکرہ حضرت شاہ ابوالمعالی کے مرتب نے آپ کی مندرجہ ذیل تصنیفات کی فہرست لکھی ہے۔ (1) تحفتہ القادریہ (2) رسالہ شوقیہ (3) مونس جاں (4) زعفران زار (5) گلدستہ باغ ارم (6) روضتہ الدوارد (7) اصول صوفیہ (8) رسالہ نوریہ (9) دیوان غربتی۔ ان کے علاوہ ہشت محفل کے نام سے آپ کے ملفوظات بھی ہیں' جو آپ کے فرزند اکبر حضرت سید محمد باقر نے مرتب فرمائے۔ یہ تمام کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔

آپ کی ایک غزل یہاں تبرک کے طور پر درج ہے۔

تشنہ لب گویاں سوئے آں بحرِ عرفاں می روم
سرزدہ چوں سیلِ اشکِ خود باشقاں می روم
جائی بغداد گیلانم ز شوق حضرتش

گہہ سوئے بغداد گاہے سوئے گیلاں می روم
ہم عرب شد ہم عجم صیدِ تو اے ترک عجم
بر اسیرِ خویش رحمے کن کہ حیراں می روم
غربتی سرو قدٗ خضرے مبارک پے کجاست
تا شود رہبر کہ سوئے آبِ حیراں می روم

آپ کے بعض ہم عصر

آپ کے تذکرہ نگاروں نے بعض معاصرین سے آپ کے روابط کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ٹھٹھہ کے ملا نیازی، اکبر اعظم کے ملک الشعراء فیضی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ملا عبدالقادر بدایونی اور جہانگیر کے ملک الشعراء طالب آملی شامل ہیں۔

ملا نیازی

ملا نیازی سے ملنے کے لیے حضرت شاہ ابوالمعالیؒ ایک بار خود ٹھٹھہ گئے۔ ملا نیازی اپنے عہد کے معروف مصنف اور شاعر تھے۔ دوران ملاقات ملا نیازی نے اپنے کئی اشعار سنائے، بعد میں اس ملاقات کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ ملا کی صحبت ان کی شاعری سے زیادہ بہتر رہی۔

فیضی

ملک الشعراء فیضی اکثر خطوں میں آپ سے اظہار عقیدت کرتا۔ ایک دفعہ آپ اس کے اصرار پر اس کا کتب خانہ بھی دیکھنے گئے۔ حضرت واپس تشریف لانے لگے تو اس نے ایک قیمتی کھیس آپ کے کندھوں پر ڈال دیا اور درخواست کی یہ تحفہ قبول فرمائیں۔

حضرت شیخ محدثؒ

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے خط و کتابت کے ذریعے آپ کا رابطہ رہتا۔ ایک دفعہ وہ بطور خاص آپ سے ملاقات کے لیے لاہور آئے، لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا

کہ حضرت لاہور سے باہر تشریف لے گئے ہیں' چنانچہ حضرت شیخ محدث آپ کی واپسی تک لاہور میں ٹھہرے رہے اور جب حضرت واپس لاہور تشریف لائے تو ان سے ملاقات کی۔ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ نے انہیں حضرت غوث الاعظمؒ کی کتاب "فتوح الغیب" کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا' یہ وعدہ انہوں نے دہلی میں جا کر پورا کیا۔ خاتمہ کتاب پر حضرت شیخ نے حضرت شاہ ابوالمعالی کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے۔

حضرت شیخ محدثؒ اپنی معروف زمانہ کتاب اخبار الاخیار میں حضرت شیخ داؤد کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کا تذکرہ بھی کرتے ہیں کہ "حضرت شیخ داؤد کے روحانی جانشین اس وقت شیخ ابوالمعالی ہیں' جو عالی منصب رکھنے کے باوجود مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول رہتے ہیں۔ کافی شہرت کے مالک ہیں۔ تندرست و توانا ہیں اور حسن مقال کی صفت سے موصوف ہیں۔ غوث اعظمؒ کی مدح میں فارسی زبان میں بہترین اسلوب سے شعر بھی کہتے ہیں۔ مجھ مؤلف اخبار الاخیار کو ان سے ملاقات کا بڑا شوق رہتا ہے۔"

(اخبار الاخیار: ص 439)

حضرت شیخ محدث ان کے روحانی مقام و مرتبہ کے اس درجہ معترف تھے کہ اپنے ذاتی حالات بھی ان کی خدمت میں تحریر فرماتے' ان سے رہنمائی اوز دعاؤں کی التجا کرتے۔ حضرت شیخ کے یہ تمام خطوط "کتاب المکاتیب" میں مل جاتے ہیں۔ جن سے دونوں بزرگوں کے اخلاص کا حال معلوم ہوتا ہے۔ حضرت شیخ محدث لکھتے ہیں:۔

"میاں شیخ داؤد کے بھتیجے' داماد اور جانشین ہیں۔ احوال و مقامات میں نہایت تیز رس اور بلند پایگاہ ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں ممتاز بلکہ بزرگوں سے بھی آگے ہیں۔ اپنے پیر کی محبت میں انہوں نے خود کو بالکل مٹا دیا ہے اور ہمیشہ پیر کی اتباع میں مصروف رہے۔ جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کو قطب الاقطاب حضرت میاں شیخ داؤدؒ کے پاس لے کر گئے اور ان سے نام رکھنے کے لیے کہا۔ حضرت میاں نے فرمایا: ان کا نام شاہ ابوالمعالی رکھو۔ ان کی تاریخ پیدائش "ابوالمعالی حق پرست" سے نکلتی ہے۔ (منتخب التواریخ صفحہ 618 تا 620)

اس کے علاوہ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کا انتخاب کلام نقل کیا ہے اور حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے چند خطوط بھی نقل کئے ہیں جو حضرت نے ملا بدایونی کے نام لاہور سے

لکھے تھے۔

طالب آملی

خفتگان خاک لاہور کے مصنف پروفیسر محمد اسلم نے لکھا ہے کہ جہانگیری عہد کے ملک الشعراء طالب آملی آپ کے مرید تھے۔ طالب آملی نے انہیں ایک شعر میں "یکے قطب است از اقطاب لاہور" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

تعلیمات

آپ کے بعض اقوال یہ ہیں۔

(1) دنیا ایک بے سروپا سرائے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کا خادم بنا دیا ہے' اگر تو چاہتا ہے کہ ابلیس تیرے کاموں میں دخل انداز نہ ہو' تو وہ کلام نہ کر جس میں اس کا دخل کار فرما ہو۔

(2) اگر دنیا و آخرت کی سب نعمتیں فقیر کے سامنے لا کر رکھ دی جائیں' تو وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور نہ انہیں اپنے راستے کا پتھر بناتا ہے۔

(3) جو شخص اپنی عقل سے دھوکا کھاتا ہے' وہ نفسانی اور شیطانی وسوسوں کی وجہ سے شریعت کی اطاعت سے روگرداں ہو جاتا ہے۔

(4) اپنی ناقص عقل پر مغرور ہونے والا سعادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ عقل کا دار و مدار قیاس پر ہے اور خدا قیاس سے سمجھ میں نہیں آتا۔

(5) عقل محض اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ ہم جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کی اطاعت کیسے کرنی ہے۔

(6) نفس کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے' نفس کی مخالفت کے باوجود محنت و ریاضت میں مشغول رہنا چاہئے۔

(7) اکثر دعا فرماتے: الہٰی! مجھے اپنے مرشد کی محبت کی توفیق عطا فرما تا کہ مجھے میرا مقصود حاصل ہو جائے۔

(8) آپ اکثر فرمایا کرتے تھے: ابوالمعالی! اپنے رب بزرگ و برتر کا بندہ بن اور مال و

زر کا بندہ نہ بن۔

وصال

علم و معرفت کا یہ آفتاب 63 سال 3 ماہ 4 یوم اپنی نورانی کرنوں سے ایک عالم کو منور کرنے کے بعد 16 ربیع الاول 1024ھ کو بعہد شہنشاہ جہانگیر ظاہر بیں نظروں سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ ہو گیا' لیکن اہل باطن کے لیے ان کا فیض آج بھی جاری ہے۔ (رائے بہادر کنہیا نے صحیح نہیں لکھا کہ آپ کا انتقال مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد میں ہوا۔)

آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ محمد باقرؒ نے آپ کا مزار مبارک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے روضہ مبارک کی طرز پر تعمیر کرایا۔

ہزاروں رحمتیں اللہ کے ان نیک ولیوں پر
کہ جن کی زندگی قرآن و سنت کا نمونہ تھی

حضرت میاں نتھا قادری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1027ھ)

شام کا وقت تھا کہ ایک مرید باصفا دن بھر کی ریاضت کے بعد اپنے مرشد کامل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مرشد نے پوچھا' کیوں بھئی آج کس طرف جا کر اللہ کے ذکر میں مشغول رہے؟ مرید نے عرض کیا: حضرت' پہلے تو موضع اچھرہ کے گرد و نواح میں مشغول ذکر و فکر تھا' لیکن وہاں کے درخت تسبیح سبحان اللہ و الحمدللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے' جس کی وجہ سے میرے اشغال میں خلل پڑ تا تھا۔ اس لیے میں وہاں سے اٹھ کر محلّہ خلیفہ جنید کے ایک گوشے میں جا بیٹھا اور وہیں دن بھر ذکر و فکر میں مشغول رہا۔

یہ سن کر مرشد نے فرمایا: سبحان اللہ! دیکھنا' اس لڑکے کا معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور یہ کیسی کیسی بلند باتیں کرتا ہے۔

بلند باتیں کرنے والا یہ لڑکا حضرت میاں نتھا تھا' اور ان کے بلند مقام کے بارے میں خبر دینے والے ان کے مرشد حضرت میاں میر قادری لاہوری تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

حضرت میاں نتھا'' سرہند میں پیدا ہوئے۔ ابھی لڑکپن تھا کہ حضرت میاں میر'' کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے مرید ہوئے۔ پھر تمام عمر انہی کی خدمت میں گزار دی۔ ''خزینۃ الاصفیاء'' میں ہے حضرت میاں میر'' کسی مرید کو رات کے وقت سوائے میاں نتھا کے اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ میاں نتھا پر ہر وقت حالت استغراق و بے خودی کا اس قدر غلبہ رہتا تھا کہ دنیا و مافیہا کی انہیں کچھ خبر نہ رہتی تھی۔ ''تذکرہ صوفیائے پنجاب'' میں ہے کہ آپ کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات کسی بلند دیوار پر مربع بیٹھ کر کئی دن گزار دیتے۔ بعض اوقات دن رات کسی جنگل یا ویرانے میں کسی قبر کے

سرہانے بیٹھے رہتے۔ حضرت میاں میرؒ کسی آدمی کو بھیجتے کہ جاؤ' نتھا کو بلا لاؤ کہ اس نے کئی روز سے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔ میاں نتھا کے ابتدائی حالات کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ سوائے اس کے وہ کم عمری میں سرہند سے آکر حضرت میاں میرؒ کے مرید ہو گئے تھے اور انہوں نے قبل ازیں تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ ایک دفعہ کوئی بزرگ ان کی ریاضت و عبادت کا حال سن کر ان کی خدمت میں آئے۔ میاں نتھا نے اس سے پوچھا: تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا: میں جونپور سے آپ کی زیارت کے لیے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ کے نام و عرف اور حسب و نسب سے آگاہی حاصل کروں۔

میاں نتھا نے فرمایا: میرا نام نتھا ہے۔ قوم کا پراچہ کنجد کش ہوں۔ حضرت میاں میر بالا پیر کا کمترین خادم ہوں۔ میرا حال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے عالم جبروت و ملکوت و لاہوت کی کنجیاں مجھے عطا کر دی ہیں۔ جس وقت چاہتا ہوں عالم ملکوت و عالم جبروت و عالم لاہوت کا دروازہ کھول کر داخل ہو جاتا ہوں۔

شہزادہ محمد دارا شکوہ نے "سکینتہ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ نباتات و جمادات تک میاں نتھا سے ہم کلام ہوتے تھے۔ ایک روز وہ ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ ایک درخت سے آواز آئی کہ اگر قلعی کو میرے پتوں کے ساتھ ملا کر آگ دیں' تو چاندی بن جائے۔ میاں صاحب نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔ آگے گئے تو ایک درخت نے کہا کہ اگر میری تھوڑی سی لکڑی کو تانبے کے ساتھ ملا کر آگ دیں تو خالص سونا بن جائے۔ میاں صاحب نے اسے بھی کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ پھر ایک گنبد کے نیچے ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلنے لگے' تو گنبد سے آواز آئی۔ ذرا رک جایئے۔ پوچھا' تو کون ہے؟ آواز آئی' میں یہی گنبد ہوں جس میں آپ بیٹھے ہیں' آپ کو روکنے کی وجہ یہ ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ باہر جائیں گے تو آپ کو تکلیف ہو گی۔ یہ گفتگو جاری تھی کہ بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"خزینتہ الاصفیاء" میں ہے کہ ایک روز آپ اپنے مرشد حضرت میاں میرؒ کے ساتھ حجرے کے باہر سایہ دیوار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک بارش آگئی اور ساتھ ہی تیز ہوا چلنے لگی۔ حضرت میاں میرؒ نے فرمایا: اب تو یہاں سے اٹھنا ہی پڑے گا۔ میاں نتھا نے ادب سے عرض کیا: یا حضرت! اگر فرمائیں تو اس باد و باراں کو ابھی لوٹا دوں۔ یہ سن کر مرشد نے برہم ہو کر فرمایا: اچھا' تو اب تم اظہار کرامت اور خود فروشی بھی کرتے ہو؟ پھر

اٹھ کر حجرے کی طرف جاتے ہوئے فرمایا: بھلا حجرے میں بیٹھنے سے کیا نقصان ہے، ہمیں اللہ کے کاموں میں دخل نہ دینا چاہئے کہ فعل المحمود محمود۔

حضرت میاں نتھا اگرچہ ظاہری تعلیم سے نا آشنا تھے لیکن مرشد کامل کے فیض نظر سے ان پر تمام علوم باطنی منکشف تھے۔

آپ نے 1027ھ مطابق 1618ء میں وفات پائی۔ خواجہ بہاری کا بیان ہے کہ جس روز میاں نتھا نے وفات پائی، وہ کچھ معمولی سے بیمار تھے اور حضرت میاں میرؒ کے حجرے کے سامنے چارپائی پر بیٹھے مشاہدۂ جمال حق میں مستغرق تھے۔ جب وہ بہت دیر تک اسی حالت میں رہے تو حضرت میاں میرؒ نے مجھ سے فرمایا: ذرا اٹھ کر دیکھو تو سہی میاں نتھا زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ میں نے قریب جا کر ان کو ہلایا، مگر وہ وفات پا چکے تھے۔ پھر آپ نے مریدین کو ان کی تجہیز و تکفین کے لیے حکم دیا۔ شیخ عبدالغنی کا بیان ہے کہ جب جنازہ اٹھا تو حضرت میاں میرؒ نے مجھ سے فرمایا، ہمارے آگے آگے چلو۔ میں نے دیکھا تو حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور فرما رہے تھے کہ ہمارے گھر کا فقر میاں نتھا لے گیا۔ پھر فرمایا: ہماری وفات کے بعد ہمیں میاں نتھا کے پاس دفن کرنا۔

"خزینۃ الاصفیاء" میں آپ کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

حضرت نتھا کہ ولیِ خداست
عارفِ حق واقفِ علم الیقین
عاشقِ مستانہ بجو رحلتش
نیز از محبوب بہشتِ بریں
1027ھ

آپ کا مزار مبارک حضرت میاں میر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے روضہ اقدس کی چاردیواری کے سامنے ہے۔ "سکینۃ الاولیاء" میں ہے کہ آپ نے مرشد کی خدمت میں رہ کر اس قدر علم حاصل کر لیا تھا کہ لوح محفوظ کی تحریر پڑھ سکتے تھے۔ ملا شاہ بدخشانی (جو آپ کے پیر بھائی تھے) کہا کرتے تھے کہ میاں نتھا اللہ کے محبوب تھے۔

حضرت شیخ محمد سلیم چشتی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1030ھ/1621ء)

آپ چشتی صابری سلسلہ میں حضرت شیخ محمد صدیق چشتی لاہوری (المتوفی 1084ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کے حالات بہت کم دستیاب ہو سکے۔ "بزرگان لاہور" مؤلفہ غلام دستگیر نامی کے مطابق آپ عشق و محبت' جذب و سکر اور سماع و وجد کے جامع تھے' مقام فقر میں مقام بلند اور درجہ معلیٰ کے مالک تھے۔ سماع کے دوران آپ پر ایسی حالت طاری ہو جاتی کہ انفراق روح کی نوبت آ جاتی۔ لوگ یہی سمجھتے کہ فوت ہو گئے ہیں' لیکن نماز کا وقت آتا تو اذان سن کر ہوش میں آ جاتے۔ لاہور میں بے شمار خلقت آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھی۔ آپ کا بیشتر وقت ارشاد و تلقین اور درس و تدریس میں گزرتا تھا۔

کہتے ہیں ایک دفعہ بعض علمائے لاہور نے جو سماع کے خلاف تھے۔ بادشاہ کو دہلی میں درخواست گزاری کہ ایسے شخص کا قتل مناسب ہے۔ بادشاہ نے وہ عرضی صوبہ دار لاہور کے پاس برائے تحقیق ارسال کی۔ جب صوبیدار لاہور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' تو آپ کے زہد و ورع اور ریاضت و عبادت سے اس قدر متاثر ہوا کہ آپ کا مرید ہو گیا۔ (مدینۃ الاولیاء ص 290)

آپ کا وصال 3 ذوالحجہ 1030ھ مطابق 9 اکتوبر 1621ء کو عہد جہانگیر میں ہوا۔ آپ کو میدان زین خاں میں آپ کے مرشد کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے آپ کی تاریخ وفات بہت عمدہ نکالی ہے۔

"ظہیر وقت" ہم "فخر خلائق"

1621ء   1621ء

دو تاریخ وصالش گفت نامی

امتدادِ زمانہ کے باعث اب آپ کا نشان مزار باقی نہیں رہا۔

حضرت شیخ جان اللہ چشتی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1039ھ / 1630ء)

حضرت شیخ نظام الدین بلخی رحمتہ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ آپ کا شمار اپنے عہد کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا۔ آپ لاہور میں پیدا ہوئے اور علوم ظاہری کی تکمیل بھی لاہور ہی میں کی۔ پھر مرشد کی تلاش میں تھانیسر پہنچے اور حضرت شیخ بلخیؒ کے مرید ہوئے۔ مرشد کی خدمت میں رہ کر زہد و ریاضت میں کمال حاصل کیا۔ مرشد کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے گئے۔ وہاں سے واپسی پر بلخ پہنچ کر مرشد نے خرقۂ خلافت سے نوازا۔ مرشد کے حکم سے لاہور آئے تو آپ کی کرامات کا اس قدر شہرہ ہوا کہ خلقت دعا و حصول برکت کے لیے ٹوٹ پڑی۔ آپ تمام عمر لاہور ہی میں ارشاد و ہدایت کے کام میں مشغول رہے۔

آپ کا تعلق چشتی صابری سلسلہ سے تھا۔ بے شمار خلقت آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئی۔

اس وقت لاہور میں آپ کے مندرجہ ذیل پیر بھائی بھی مرشد کے حکم سے رشد و ہدایت کے کام میں مشغول تھے۔

(1) حضرت شیخ عبدالکریم چشتی لاہوریؒ (جن کا مزار نواں کوٹ میں ہے)
(2) بندگی شیخ اللہ بخش چشتی لاہوریؒ
(3) سید اللہ بخش بھکری چشتیؒ
(4) شیخ دوست محمد لاہوری چشتیؒ

آپ کا وصال 9 جمادی الاخریٰ 1039ھ (مطابق 14 جنوری 1630ء) کو شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں ہوا۔ مزار مبارک نسبت روڈ پر دیال سنگھ لائبریری

کے قریب زیارت گاہ خلائق ہے۔ مفتی غلام سرور نے آپ کا قطعہ تاریخ اس طرح منظوم کیا ہے۔

شیخ جان اللہ چوں بحکمِ قضا
زیں جہاں رفت سوئے دارِ جناں
ہست "فیض الحسن" بتاریخش
ہم دگر "اہلِ فیض جانِ جہاں"
1039ھ

حضرت شیخ محمد طاہر بندگی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1040ھ)

اسم گرامی محمد طاہر۔ حضرت سید شاہ کمال کیتھلی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو عالم رویا میں بندگی کا لقب عطا فرمایا۔ آپ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے آباء و اجداد ایران سے ہندوستان آئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ آپ کی ولادت 984ھ میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں ہوئی۔ "بزرگان لاہور" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ آپ لاہور کے باشندے تھے۔ اس سے خیال گزرتا ہے کہ آپ کی پیدائش کا شرف لاہور کو حاصل ہے۔ آپ کے کسی تذکرہ نگار نے آپ کی جائے پیدائش اور ابتدائی حالات کا ذکر نہیں کیا۔ سید محمد لطیف نے "تاریخ لاہور" میں لکھا ہے کہ آپ لاہور میں فصیل کے اندر محلہ شیخ اسحاق (موجودہ موتی بازار اور چونی منڈی) میں رہتے تھے۔ یہیں پرورش پائی اور قرآن حکیم حفظ کیا اور علمائے وقت سے مروجہ علوم حاصل کئے۔ تحصیل علوم کے بعد آپ تکمیل روحانیت کی طرف متوجہ ہوئے۔

تذکرۂ صوفیائے پنجاب (مؤلف اعجاز الحق قدوسی) میں ہے:۔

"شیخ محمد طاہر لاہوری شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ کے عظیم المرتبت خلفاء میں ہیں۔ پہلے انہوں نے حضرت شیخ سکندر بن شاہ کمال کیتھلیؒ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔ پھر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے والد حضرت شیخ عبدالاحد سرہندیؒ کی خدمت میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ سے وابستہ ہو گئے اور انہوں نے ان کو اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کی تعلیم پر مقرر فرمایا۔ پھر شیخ محمد طاہر لاہوری نے حضرت مجدد الف ثانی کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو کر سلوک و معرفت کی اعلیٰ منازل طے کیں اور بارگاہ مجددی سے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ قادریہ اور چشتیہ میں اجازت تلقین و ارشاد سے سرفراز فرمائے گئے۔ پھر اپنے پیر کے حکم سے لاہور میں رشد و



مزار حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ

میری وفات کے بعد جو شخص میرے احاطہ مزار (میانی صاحب)
میں دفن ہو گا' میں نے اللہ سے مانگا ہے کہ اسے جنت میں داخل
فرمائے۔

(حضرت سید محمد طاہر بندگیؒ)

ہدایت اور ارشاد و تلقین کے لیے مامور فرمائے گئے۔"(ص 559)

لاہور آکر آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت مجدد الف ثانیؒ کو جو عریضہ تحریر کیا' وہ "تذکرۂ آدمیہ" کے حوالہ سے خزینۃ الاصفیاء میں درج ہے۔ اس مکتوب سے آپ کے روحانی حالات اور باطنی کمالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"حضرت سلامت! احقر الخدمت محمد طاہر عرض کرتا ہے کہ جب آستانہ عالیہ سے لاہور متوجہ ہوا' تو ہر قدم پر اپنے آپ سے کہتا تھا کہ اے نادان! مقصود کو سرہند میں چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے۔ آخر غیب سے آواز آئی کہ چلتا رہ' اور رک نہیں۔ آخر کشاں کشاں لاہور پہنچا اور ایک مسجد کے گوشہ میں حیران و پریشان بیٹھ گیا۔ اچانک حضرت خواجہ نقشبندی کی روح پر فتوح ظاہر ہوئی اور حکم دیا کہ جس کام پر مامور ہوئے ہو' اس میں لگ جاؤ۔ ان کے اور آپ کے حکم کی تعمیل میں چند آدمیوں کو مشغول کیا۔ اب مجلس گرم ہے اور مشائخ عظام کی روحیں فوج در فوج تشریف لا رہی ہیں اور بہت کرم فرما رہی ہیں۔ خصوصاً حضرت غوث الاعظمؒ خواجہ بزرگ نقشبندؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ تو ہر حلقہ ذکر و نماز میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔ جناب رسالت مآب (ﷺ) بھی کئی ہزار اصحاب کے ساتھ تشریف لا کر محفل کی رونق بڑھاتے اور نوازشیں فرماتے ہیں اور اعتکاف کے عشرہ میں خلوت خاص اور نسبت تازہ سے سرفراز فرماتے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بہت مہربانی فرمائی اور تشریفات خاصہ سے نوازا۔ اس سے پہلے نسبت ثلاثہ یعنی نقشبندیہ' قادریہ اور چشتیہ میں سے ہر ایک نسبت باری باری آتی تھی۔ اب کبھی اکٹھی بھی آ جاتی ہیں۔ کبھی غالب مغلوب بھی ہو جاتی ہیں۔ نسبت چشتیہ بہت غلبہ پا لیتی ہے حتیٰ کہ میں دوسری نسبتوں سے ناامید ہو جاتا ہوں' اس وقت نسبت نقشبندیہ غالب آ جاتی ہے اور دوسری نسبتوں کو زیر کر لیتی ہے۔ اب تینوں نسبتیں ایک ہو چکی ہیں۔ آج کل مشائخ عظام کی نسبت میں سیر کم ہے اور صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی نسبت میں سیر زیادہ ہے۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی نسبت کے علاوہ بندہ اکثر اوقات حضرت رسول اللہ ﷺ کی نسبت میں ہوتا ہے اور بہت خوش و خرم رہتا ہے اور فقر کا مطلب یہی ہے کہ اسی نسبت پیغمبری میں ترقی ہو۔ والسلام۔"

آپ علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار و منفرد تھے۔ امام ربانی حضرت مجدد

الف ثانیؒ" آپ کو العالم، الفاضل، الکامل و الشیخ محمد طاہر کے القابات سے یاد فرماتے تھے۔
حضرت امام ربانیؒ کے صاحبزادگان اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "ہم پر حضرت شیخ محمد طاہر کے حقوق اس قدر ہیں کہ ہم کسی طور بھی ان کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔"

آپ کی بیعت

اس بات پر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ آپ کی بیعت حضرت شاہ سکندر کیتھلی سے تھی اور آپ نے سلسلہ قادریہ میں خلافت بھی انہی سے حاصل کی البتہ ان کے وصال کے بعد آپ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا۔ پروفیسر سید خورشید حسین بخاری اپنی کتاب "حضرت شیخ طاہر بندگی لاہوری" میں لکھتے ہیں:۔
"حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ" حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ کی خدمت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وساطت سے پہنچے۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ سرہند تشریف لائے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے فرمایا کہ کوئی ایسا شخص جو زیور علم سے آراستہ ہو' ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم قصیدہ بردہ کے الفاظ کو درست کر لیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت شیخ طاہر بندگی کو جو اپنے وقت کے ممتاز و بے نظیر صاحب علم و فضیلت تھے۔ حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ کے ساتھ روانہ فرمایا۔ دونوں حضرات کیتھل پہنچے' کئی روز گزر گئے مگر حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ نے اس بارہ میں گفتگو نہ فرمائی۔ حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ اکتا گئے۔ ایک روز قصیدہ بردہ شریف اپنے قلم سے تحریر کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت شاہ سکندر کیتھلی قدس سرہ نے قصیدہ بردہ شریف دست مبارک سے لے کر پہلا ہی شعر قواعد صرف و نحو کے خلاف پڑھا۔ حضرت شیخ محمد طاہر بندگی نے درستی کرنا چاہی' لیکن آپ نے جلال میں آ کر فرمایا: اے شیخ محمد طاہر! یہ شعر اسی طرح درست ہے' جس طرح میں نے پڑھا ہے۔ اس جلالت مزاج کا حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ پر یہ اثر ہوا کہ وہ تین دن بے ہوش پڑے رہے اور جب آپ نے اپنا دست مبارک حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ کے چہرے پر پھیرا تو انہیں ہوش آیا۔ ہوش آنے کے بعد حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ پریشان ہو گئے اور بغیر اجازت لئے سرہند کی راہ لی۔ تین دن تک چلتے رہے' لیکن اپنے آپ کو کیتھل کی ہی حدود میں پایا۔ چوتھے روز حضرت شاہ

سکندر کیتھلی قدس سرہٗ نے آپ سے بصورت الہام فرمایا: اے طاہر! بد دل مکن۔ قسمت تو وابستہ 'فتراک ماست' و عنقریب خدائے تعالیٰ دوبارہؑ تو عنایت سازد۔" اس پر حضرت شیخ محمد طاہر بندگی واپس آئے اور حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت شاہ سکندر کیتھلی قدس سرہ نے آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ میں داخل فرما کر لاہور کی قطبیت کے فرمان سے نوازا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کو ہدایت فرمائی کہ شیخ محمد طاہر بندگیؒ کے حق میں خاص توجہ رکھیں۔

حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ کے قلب و روح پر حضرت شاہ سکندر کیتھلی قدس سرہ کی توجہات قادریہ کا اتنا اثر غالب ہو چکا تھا کہ ایک دفعہ حضرت شاہ سکندر کیتھلی قدس سرہ لاہور تشریف لائے اور حضرت شیخ محمد طاہر بندگی کے مکان پر پہنچے۔ اس وقت حضرت شیخ محمد طاہر بندگی بالائی منزل پر تھے۔ آپ نے حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ کو دیکھتے ہی بے اختیار بالائی منزل سے چھلانگ لگا کر قدم بوسی کا ارادہ کیا' حضرت سکندر کیتھلیؒ کو آپ کی قلبی حالت معلوم ہو گئی۔ فوراً فرمایا: محمد طاہر! حوصلہ سے کام لو' اور سیڑھی کے ذریعے نیچے آؤ۔" (صفحہ 34)

لاہور میں آپ کے پاس فتوحات بکثرت آتی تھیں' لیکن آپ قبول نہ فرماتے تھے۔ آپ کے حکم کے مطابق امراء اور دولت مندوں کو خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت نہ تھی۔ آپ علماء اور درویشوں سے مل کر خوش ہوتے۔ ایک مرتبہ حاکم لاہور نے بہت کوشش کی کہ آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو' لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ اس نے بطور نذر کچھ بھیجا تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ وعظ و تدریس کا بھی کوئی معاوضہ قبول نہ فرماتے اور نہ اسے جائز سمجھتے۔ آپ کتب احادیث و تفسیر خود اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے اور اس کے حواشی لکھ کر اور تصحیح کر کے فروخت کرتے اور اس طرح جو کچھ حاصل ہوتا' اس سے گزر اوقات کرتے۔

آپ کا اخلاق بہت بلند تھا' ہر کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ سلام میں پہل کرتے۔ ہر آنے والے کی دلجوئی فرماتے۔ کسی کو رنجیدہ یا پریشان نہ دیکھ سکتے تھے۔ کوئی آپ کے منہ پر تعریف کرتا' تو آپ ناپسند فرماتے۔ اپنی تعظیم سے خوش نہ ہوتے' کوئی آپ کی تعظیم میں کھڑا ہوتا' تو منع فرماتے۔ ہر شخص سے اس کی فہم کے مطابق گفتگو فرماتے۔

روحانی مقام

آپ کی زندگی ہی میں آپ کے کشف و کرامات کا چرچا دور دور تک پھیل گیا تھا' ہزاروں بندگان حق آپ کے درِ فیض سے ہدایت یاب ہوتے۔ ایک مرتبہ آپ پر جناب رسول اللہ ﷺ کی محبت کا غلبہ ہوا اور کمال بے قراری ہوئی۔ آپ نے درگاہ حق سبحانہ میں گریہ و زاری کی۔ اسی عالم میں خود کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پایا۔ حضور ﷺ نے خصوصی شفقتوں سے نوازا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پیر و مرشد کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں' جن کے اظہار سے مجھے شرم آتی ہے۔ مثلاً غلبہ احوال کے دوران بتایا جاتا ہے کہ جس نے تجھے دیکھا اسے آتش دوزخ سے آزاد کر دیا گیا اور ایک دفعہ مجھے بتایا گیا کہ جس نے تجھ سے بیعت کی اسے بخش دیا گیا۔"

ایک روز ارشاد فرمایا کہ میں نے حق سبحانہ سے اجازت لے لی ہے کہ جو شخص بھی میرے مزار کے اردگرد دفن ہونے کی سعادت حاصل کرے گا۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل ہوگا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ چبوترہ جس پر آپ کی قبر مبارک ہے سخت گرمی کے موسم میں بھی کبھی گرم نہیں ہوتا' ہمیشہ سرد ہی رہتا ہے۔

آپ کی یہ کرامت بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے مرشد حضرت شاہ سکندر کیتھلی قدس سرہ کے عرس مبارک کے موقع پر کیتھل شریف میں حاضر ہوئے۔ آپ کے پیر بھائی اور دوسرے مشائخ بھی جمع تھے۔ گفتگو کے دوران کلمہ طیبہ کے فضائل کا ذکر آیا تو آپ نے جذبہ حال میں فرمایا کہ جس نے اس کلمہ کو دل و جان سے پڑھا' وہ اگر لفظ "لا" کسی ذی روح کے کان میں کہہ دے تو وہ فوراً مرجائے اور "الا اللہ" کہہ دے تو وہ پھر زندہ ہو جائے۔ یہ کہہ کر اسی وارفتگی کے عالم میں اٹھے اور قریب ہی بندھی ایک گائے کے کان میں جاکر "لا" کہا۔ وہ گائے اسی وقت گر کر مر گئی۔ پھر آپ نے اس کے کان میں "الا اللہ" کہا تو وہ زندہ ہو گئی اور کھڑی ہو کر اپنا چارہ کھانے لگی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے' لاہور میں آپ کا قیام محلہ شیخ اسحاق میں تھا۔ خط میانی

کے رئیس حافظ جان محمد کو آپ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی' ان کے بیٹے بھی آپ کے نہایت مخلص مرید تھے۔ انہوں نے ایک عالی شان اور وسیع مدرسہ بنوا کر آپ کی نذر کیا اور درخواست کی کہ آپ اس میں بیٹھ کر درس و تدریس اور رشد و ہدایت کا کام کریں۔ حضرت شیخؒ نے ان کی گزارش کو پذیرائی بخشی اور اس مدرسے میں آگئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ اس مدرسہ سے ہزاروں اشخاص عالم فاضل بن کر مختلف علاقوں میں پہنچے اور دعوت دین کو عام کیا۔ آپ کا یہ مدرسہ اس علاقے میں تھا' جسے آج "میانی صاحب" کہا جاتا ہے۔

آپ نے 5 محرم الحرام 1040ھ (مطابق 1630ء) میں وصال فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک 56 سال تھی۔ "ہادی عظیم" سے آپ کا مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ وصال سے پہلے آپ نے اپنے مرید خاص شیخ ابو محمد قادری نقشبندی کو طلب فرمایا۔ وہ حاضر ہوئے تو دیر تک انہیں اپنے سینے کے ساتھ لگائے رکھا اور تمام باطنی فیوض اور نعمتیں ان کے سینے میں منتقل کر دیں۔ آپ کے وصال کے بعد انہی شیخ ابو محمدؒ نے آپ کی اس مسند کو رونق بخشی۔ آپ کے خلفاء میں شیخ ابو محمدؒ کے علاوہ سید صوفی (مدفون دہلی) شیخ لکھن (مدفون بیرون موری گیٹ لاہور) اور ابوالقاسم نقشبندی مشہور ہیں۔ حضرت شیخ آدم بنوریؒ جو خود صاحب مدارج تھے۔ بنور سے پیدل چل کر لاہور میں آپ کے پاس حاضر ہوئے اور نسبت قادریہ میں فیض کامل حاصل کیا۔ (نقوش لاہور نمبر ص 329)

آپ نے زندگی میں دو نکاح کئے' لیکن کسی بی بی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔ یہ دونوں بی بیاں (ماہ خانم اور عصمت النساء) آپ کے مزار کی پائنتی کی جانب مدفون ہیں۔

آپ کے مدرسہ کے ساتھ ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا' جو سکھ گردی کی نذر ہو گیا۔ سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں نہایت بے دردی کے ساتھ اس کتب خانے کو جلا دیا۔

کتب خانہ مجلس شوریٰ ملی تہران (ایران) میں آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا "قصیدہ غوثیہ" معہ شرح بزبان فارسی محفوظ ہے۔

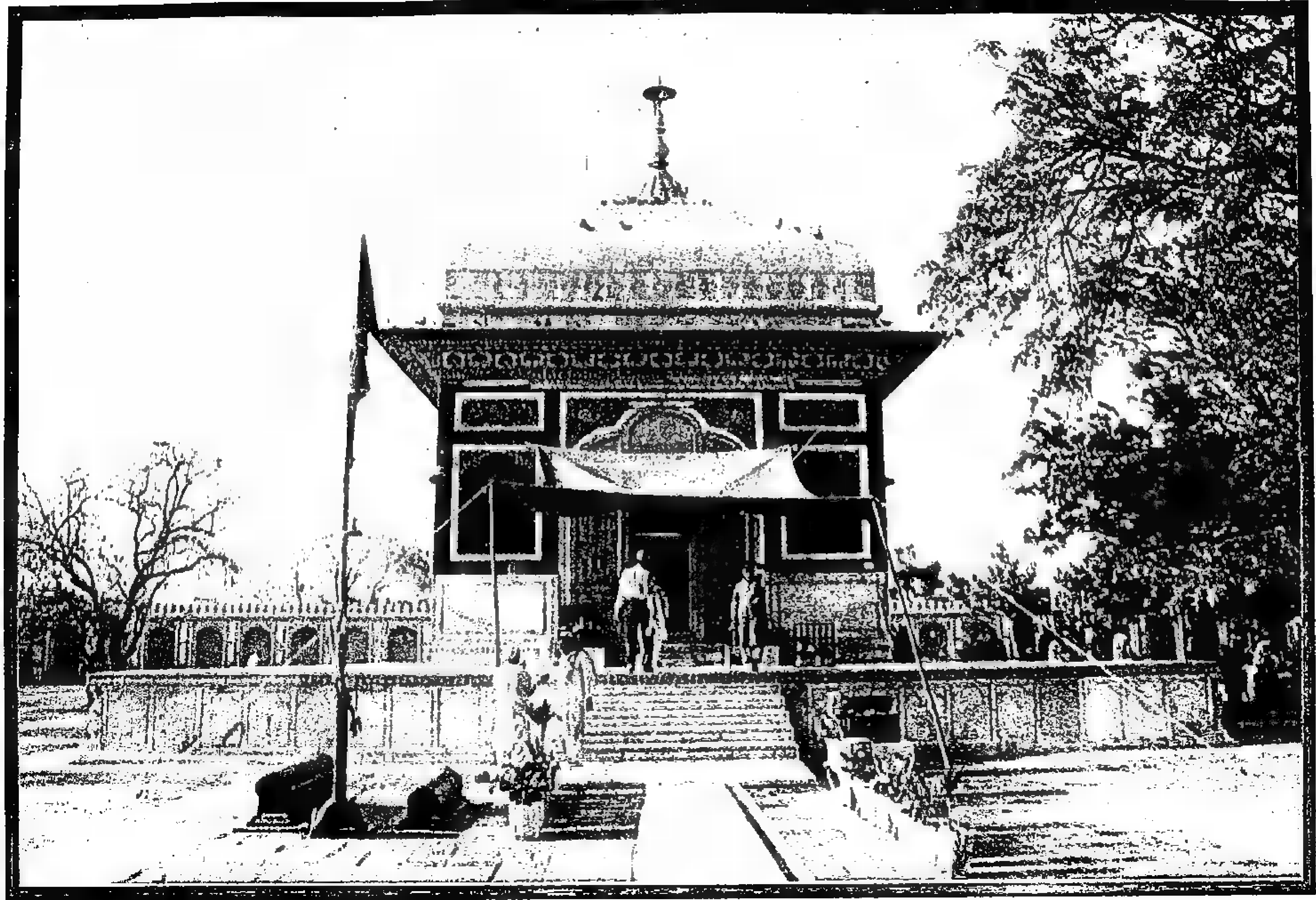
حضرت میاں میر بالا پیر رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1045ھ/ 1635ء)

یہ اس وقت کی بات ہے' جب متحدہ ہندوستان میں مغل حکمران تھے۔ لاہور میں ایک درویش بوریا نشین اپنی خانقاہ میں بیٹھا طالبان ہدایت کے درمیان علم و عرفان کے موتی لُٹا رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے درویش کی خدمت میں کچھ سکے پیش کیے۔ درویش کی طبیعت منقبض ہو گئی' کہاں ارفع و اعلیٰ روحانیت کی باتیں اور کہاں ہاتھوں کی میل چند سکے۔ اتفاق سے اس وقت مجلس میں ایک ولی عہد مغل شہزادہ بھی دعا کرانے کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ درویش نے سکے پیش کرنے والے شخص کا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے فرمایا: میاں' ان سکوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ ہمارا دل غنی ہے۔ اس میں روپے پیسے کی حرص کا دخل نہیں' وہ دیکھو' سامنے ہندوستان کا ولی عہد بیٹھا ہے' تم یہ سکے اسے دے دو' ان چیزوں کی حرص انہی لوگوں کو ہوتی ہے۔ انہی کی خاطر وہ اپنے لشکر اور غنیم کے لشکر دونوں کو برباد کرتے ہیں۔ پھر فرمایا: شاہ ما از گدا افتادہ است۔

علم و عرفان و حکمت کی یہ دلنشیں باتیں کرنے والے درویش خدا مست حضرت میاں میر قادری رحمتہ اللہ علیہ تھے اور ولی عہد سلطنت' شہنشاہ ہند کے بیٹے شہزادہ دارا شکوہ تھے' جو ان دنوں دکن میں اورنگ زیب سے برسرپیکار تھے اور اس وقت آپ کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر تھے۔ "تعمیر خودی" کے عنوان سے حضرت علامہ اقبالؒ نے یہ واقعہ اپنی کتاب "اسرار و رموز" میں بڑے موثر انداز میں بیان فرمایا ہے اور حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

حضرت شیخ میاں میرؒ ولی
ہر خفی از نور جان او جلی



مزار حضرت میاں میرؒ

بدی کرنے والا اگر اپنے کیے پر پشیمان نہیں ہوتا
تو وہ کبھی بدی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

(حضرت میاں میرؒ)

ترنبش ایمان خاکِ شہر ما
مشعل نورِ ہدایت بہرِ ما

حضرت میاں میرؒ 957ھ مطابق 1550ء میں سندھ کے قدیم شہر سیوستان (سہون) میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر ضلع دادو میں بھکر اور ٹھٹھہ کے درمیان ہے۔ ولادت کے وقت ان کا نام میر محمد رکھا گیا۔ والد ماجد کا اسم گرامی قاضی سائیں دتہ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب 28 واسطوں سے امیر المومنین سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت میاں میرؒ سات برس کے تھے کہ یتیم ہو گئے' والدہ محترمہ نے جو اس دور میں رابعہ ثانی مشہور تھیں' مردانہ ہمت سے اپنے یتیم بیٹے کی پرورش و تربیت کی اور سلوک کی ابتدائی تعلیم سے آراستہ کیا۔ میر محمد تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو اپنی والدہ بی بی فاطمہ کی اجازت سے سندھ میں سلسلہ قادریہ کے عظیم صوفی بزرگ حضرت شیخ خضر سیوستانیؒ (م 994ھ) کے دست مبارک پر بیعت کی۔

حضرت شیخ خضرؒ سیوستان کے باہر ایک پہاڑ کے غار میں رہتے تھے' جہاں ان کا سارا وقت یاد الٰہی میں گزرتا تھا۔ حضرت میاں میرؒ نے ان کی خدمت میں رہ کر علوم باطنی کی تکمیل کی اور سخت ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ پھر ایک روز مرشد کامل نے فرمایا کہ میاں میر! اب تمہارا کام مکمل ہو چکا ہے۔ تم جہاں چاہو سکونت اختیار کرو۔ چنانچہ مرشد کی اجازت سے لاہور تشریف لائے اور وصال تک یہیں رہے۔ آپ کا سلسلہ طریقت حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک اس طرح پہنچتا ہے:۔

حضرت میاں میرؒ۔ حضرت خضر سیوستانیؒ ۔ سید احمد ولیؒ ۔ سید عابد کبیر قادریؒ ۔ شیخ ابوالقاسم قادریؒ ۔ شیخ موسیٰ جلبیؒ ۔ شیخ ابوبکر مقبولؒ ۔ شیخ داؤد کریمؒ ۔ شیخ حفص ابوبکرؒ ۔ شیخ زیدؒ ۔ شیخ حسن علی قرشیؒ ۔ شیخ عبدالرزاق گیلانیؒ ۔ حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت 982ھ میں جب لاہور تشریف لائے تو اس وقت آپ کی عمر 25 سال تھی۔ اس وقت ہندوستان پر شہنشاہ جلال الدین اکبر حکمران تھا۔ حضرت نے لاہور تشریف لا کر سب سے پہلے اس وقت کے عظیم علماء مولانا سعد اللہ لاہوریؒ' مولانا نعمت اللہ لاہوریؒ اور مفتی عبدالسلام لاہوریؒ وغیرہ سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی۔

حضرت میاں میرؒ کی زندگی کا زیادہ حصہ ریاضت و مجاہدات میں گزرا۔ آپ کا معمول تھا دن بھر جنگل میں یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ جو مریدین ساتھ ہوتے وہ بھی ذرا

فاصلے سے الگ الگ درختوں کے نیچے اللہ کی یاد میں مصروف رہتے' جب نماز کا وقت آتا تو اذان سنتے ہی سب نماز کے لیے جمع ہو جاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے۔ رات کو بھی اپنے حجرے میں مختصر سے آرام کے بعد آپ یادِ حق میں مشغول ہو جاتے۔ آپ ہمیشہ عام لوگوں کا سا لباس زیبِ تن فرماتے۔ عموماً سفید دستار اور کھدر کا کرتہ استعمال فرماتے۔ فرمایا کرتے کہ لباس ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی یہ نہ پہچان سکے کہ اس کا مسلک درویشی ہے۔ (سکینۃ الاولیاء)

جہانگیر کی عقیدت

شہنشاہ جہانگیر آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ "تزکِ جہانگیر" میں وہ حضرت میاں میرؒ کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔

"جب مجھے معلوم ہوا کہ لاہور میں ایک درویش میاں میرؒ نامی نہایت فاضل' بابرکت اور صاحبِ حال بزرگ ہیں اور توکل اور گوشہ عزلت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ فقر کی دولت کی بدولت غنی اور دنیا سے مستغنی ہیں' تو ان اوصاف کی بناء پر میرا دل ان کی ملاقات کے لیے بے چین ہوا اور ان کی زیارت کے لیے میں نے اپنے دل میں غیر معمولی رغبت پائی' لیکن میرے لیے لاہور جانا مشکل تھا۔ میں نے ایک خط کے ذریعے ان کی خدمت میں اشتیاقِ ملاقات ظاہر کیا۔ حضرت باوجود ضعفِ پیری کے زحمت فرما کر تشریف لائے اور میں طویل عرصہ تک خلوت میں آپ کے ساتھ بیٹھا' اور آپ کی صحبت سے مستفید ہوا۔ بلاشبہ آپ کی ذات غیر معمولی شرف کی حامل ہے' اور اس زمانے میں آپ کا وجود مغتنمات میں ہے۔ ان ملاقاتوں میں مجھے آپ سے بہت سے معارف و حقائق سننے کا اتفاق ہوا۔ ہرچند میں نے چاہا کہ آپ کی خدمت میں نذر پیش کروں' لیکن آپ کے پایۂ عالی کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی اس تمنا کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر میں نے سفید ہرن کی ایک کھال جانماز کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کی۔

سکینۃ الاولیاء میں ہے کہ جہانگیر نے اس ملاقات کے موقعہ پر آپ سے عرض کیا کہ آپ مجھ سے کسی بات کی خواہش کریں۔ آپ نے فرمایا: کیا جو کچھ میں طلب کروں گا' وہ تم مجھے دو گے؟ جہانگیر نے وعدہ کیا' تو آپ نے فرمایا: اب مجھے رخصت کی اجازت دو۔ یہ سن کر جہانگیر نے آپ کو نہایت عزت و توقیر کے ساتھ رخصت کیا۔"

شاہجہاں کی حاضری

حق گوئی کے معاملے میں آپ بادشاہ کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شہنشاہ شاہ جہاں دو مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے شاہجہاں کو نصیحت فرمائی کہ عادل بادشاہ کو اپنی رعیت اور سلطنت کی خبرگیری کرنی چاہیئے اور اپنی تمام ہمت اپنی تمام ولایت کو آباد کرنے میں صرف کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اگر رعیت آسودہ حال اور ملک آباد ہے تو سپاہ آسودہ اور خزانہ پر ہو گا۔

شاہجہاں آپ سے ملاقات کے بعد اس درجہ متاثر ہوا کہ کہا: میں نے ترک و تجرید میں حضرت میاں میر جیسا کوئی درویش نہیں دیکھا۔ (سکینۃ الاولیاء)

دارا شکوہ نے "سکینۃ الاولیاء" میں آپ کے اخلاقِ حمیدہؒ کے بارے میں بڑی خوبصورت بات لکھی ہے کہ اگر اخلاق کو کسی انسان کی صورت نصیب ہو جائے تو وہ حضرت میاں میرؒ کی صورت میں ہمارے سامنے ظاہر ہو گا۔ آپ ہر آنے والے سے محبت و اخلاص سے پیش آتے اور ہر شخص یہی سمجھتا کہ حضرت کا خصوصی لطف و کرم اسی کے لیے ہے۔

آپ کے حجرہ میں ایک پرانا بوریا بچھا رہتا تھا' خود بھی اس پر بیٹھتے اور آنے والا خواہ بادشاہ ہوتا یا فقیر' اسی پر بیٹھتا۔ آپ کو دنیا اور دنیاوی چیزوں سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں تھا۔

حضرت لوگوں کو بہت کم بیعت کرتے' لیکن جب بیعت کر لیتے تو اسے خصوصیت کے ساتھ کم خوری' کم خوابی اور کم گوئی کی تلقین فرماتے اور کہتے کہ حق کی طلب کوئی آسان کام نہیں' جب تک تم اس کی طلب میں یگانہ نہ ہو جاؤ گے' اسے نہیں پا سکو گے اور چونکہ انسان کا دل ایک ہے اس لیے اس میں صرف ایک ہی چیز سما سکتی ہے' اس لیے دل میں اللہ کے علاوہ کسی کو جگہ نہ دینی چاہیئے۔ آپ کے سلسلہ طریقت میں تجرید و تفرید کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فرماتے ہیں:۔ وہی طالب کمال کی منزل تک پہنچتا ہے' جو اس پر عمل کرے۔ اس سلسلہ میں یوں وضاحت فرماتے کہ اگر کسی کے سر کا ایک بال ناپاک ہو اور جسم کے باقی اعضاء دھو دیئے جائیں تو ناپاکی باقی رہتی ہے۔ اسی طرح ترک علائق کے ساتھ اگر دنیاوی اندیشہ دل میں رہے تو اسے تعلقات سے بری اور مجرد نہیں کہا

جا سکتا اور اس کی باطنی ناپاکی باقی رہتی ہے۔

آپ کے اقوال وارشادات

سکینۃ الاولیاء میں آپ کے ارشادات و اقوال موجود ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم آج بھی اپنی سیرت میں اسلامی انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

(1) بازاروں میں ہمیشہ تنہا چلو' تاکہ یاد الٰہی میں مشغول رہ سکو۔

(2) حضوری قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی (یعنی نماز میں ہر لحہ یہ دھیان رہنا چاہئے کہ ہم اللہ کے حضور حاضر ہیں)

(3) جس کا اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے پر ایمان ہو' وہ کبھی مفلس نہیں ہوتا۔

(4) دل سے دنیا کی محبت نکال دینا بہت بڑا مجاہدہ ہے۔

(5) مراتب سلوک میں پہلا مرتبہ شریعت کی پابندی ہے۔

(6) اولیاء اللہ کی موت ان کے نفس کی مَوت ہوتی ہے' نفس کی موت کے بعد انہیں ابد الآباد کی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔

(7) ہر آدمی تین چیزوں یعنی نفس' دل اور روح کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک کی اصلاح تین چیزوں سے ہوتی ہے۔ اصلاح نفس' شریعت کی پیروی سے۔ اصلاح دل' طریقت کے فرائض ادا کرنے سے اور اصلاح روح حقیقت کے مرتبوں کی حفاظت سے ہوتی ہے۔

(8) کامل صوفی وہ ہے جس کی نظر میں پتھر اور جواہر یکساں ہوں۔

(9) صوفی جب کامل ہو جاتا ہے اور اس کا دل خطرے سے پاک ہو جاتا ہے تو اسے کوئی چیز ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

آپ کا وصال 7 ربیع الاول 1045ھ مطابق 1635ء کو ہوا۔ حضرت کو موضع ہاشم پورہ میں دفن کیا گیا۔ آج کل یہ علاقہ "بستی میاں میر" کہلاتا ہے۔ مزار کی تعمیر کا کام دارا شکوہ نے شروع کیا' لیکن اس کے قتل کے بعد اس کی تکمیل اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں انجام پائی۔

حضرت زندگی میں اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"وفات کے بعد مجھے شوریدہ زمین میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور نہ ہی میری قبر کو مزار کی صورت بنانا کہ

صورتے در قبر بعد از مرگ ویراں خوشتر است
نیستی مانند من با خاک یکساں خوشتر است

نیز یہ بھی فرماتے:۔

"میری ہڈیوں کو نہ بیچنا' اور میری قبر پر دنیا دار لوگوں کی طرح دوکان نہ سجانا۔"

آپ کی بے شمار کرامات زبان زد خلائق ہیں۔ ایک روز آپ نولکھ باغ میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا: جاؤ' سامنے والے درخت سے پوچھو وہ کون سی تسبیح پڑھتا ہے۔ جب اس نے سرس کے اس درخت سے یہ پوچھا تو اس نے جواب دیا: میں ہر وقت "یا نافع" پڑھتا ہوں۔ سبحان اللہ۔

ہزاروں رحمتیں ان پر ہوں حق تعالیٰ کی
تمام عمر تھی جن کی رضائے حق کے لیے

حضرت شاہ بلاول قادری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1046ھ)

دو بزرگ دریا کے کنارے جا رہے تھے' اتفاق سے ایک بزرگ ذرا ستانے کے لیے دریا کے قریب لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ دوسرے بزرگ قریب ہی بیٹھ گئے تاکہ جب وہ نیند سے بیدار ہوں تو ان کے ساتھ سفری رفاقت جاری رکھیں۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور قریب ہی ایک درخت سے لکڑیاں توڑنے لگا۔ جو بزرگ جاگ رہے تھے' انہوں نے کہا: بھلے مانس! لکڑیاں ذرا دور کسی پیڑ سے توڑ لو تاکہ سونے والے کی نیند خراب نہ ہو' لیکن وہ شخص نہ مانا اور برابر لکڑیاں توڑنے میں مصروف رہا۔ بزرگ کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اس کے حق میں بددعا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ آدمی' جو لکڑیاں توڑ رہا تھا' درخت سے گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

جو بزرگ سو رہے تھے' وہ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ قریب ہی ایک شخص مرا ہوا پڑا ہے۔ انہوں نے اس کا حال دریافت کیا تو بددعا دینے والے بزرگ نے تمام ماجرا انہیں کہہ سنایا۔ انہوں نے فرمایا: یہ تو تم نے بہت برا کیا۔ فقیر کا یہ مقام نہیں کہ وہ کسی کے حق میں بددعا کرے۔ فقیر تو خلق خدا سے محبت کرنے والا ہوتا ہے' اس سے کسی کو نقصان پہنچے' یہ اچھی بات نہیں۔

پھر انہوں نے فرمایا: تم فوراً اپنے اس جلال کو ختم کرنے کے لیے ایک حجرے میں معتکف ہو جاؤ اور ہر وقت تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول رہو۔ چنانچہ جلالی بزرگ کئی سال محلّہ حضرت ابواسحاق" مزنگ میں ایک حجرے میں معتکف رہ کر تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہے۔ اور حالت جلال میں بددعا دینے پر استغفار کرتے رہے۔

یہ جلالی بزرگ حضرت شاہ بلاول رحمتہ اللہ علیہ تھے اور انہیں اعتکاف کا حکم دینے

والے ان کے پیرو مرشد تھے' جن کا نام نامی تھا حضرت شیخ شمس الدین قاری قادری رحمتہ اللہ علیہ۔

حضرت شاہ بلاول رحمتہ اللہ علیہ 976ھ میں شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید عثمان بن سید عیسیٰ تھا۔ آپ کے آباؤاجداد ہرات (افغانستان) کے رہنے والے تھے۔ محبوب الواصلین میں ہے کہ ■ شہنشاہ ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے اور شیخوپورہ میں آباد ہوئے جو شہنشاہ ہمایوں نے انہیں بطور جاگیر دیا تھا۔ حضرت شاہ بلاول کے دادا سید عیسیٰ قادری بھی ایک باکمال بزرگ تھے۔

بچپن ہی سے آپ کی پیشانی سے انوارِ ولایت نمایاں تھے۔ جب پڑھنے کی عمر ہوئی تو آپ کے دادا سید عیسیٰ نے آپ کو علوم ظاہری کے لیے لاہور بھجوایا۔ جہاں آپ نے شیخ فتح محمد کی صحبت میں رہ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اس کے بعد آپ باطنی تعلیم کے لیے تلاش مرشد میں سرگرداں رہنے لگے' ایک روز دریا کے کنارے جا رہے تھے کہ حضرت شیخ شمس الدین سے ملاقات ہوئی' انہوں نے دیکھتے ہی ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: تم میرے ساتھ رہا کرو۔ تمہارا حصہ میرے پاس امانت ہے۔ میں جلد ہی مناسب موقعہ پر تمہیں دے دوں گا۔ یہ سن کر شیخ بلاول حضرت شیخ شمس الدین قادری سے بیعت ہو گئے اور ہر وقت ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ کئی برس کی عبادت و ریاضت کے بعد آپ کو مرشد کامل کی طرف سے خرقہ خلافت عطا ہوا۔

آپ کا شجرۂ طریقت "اولیائے لاہور" میں اس طرح مرقوم ہے:۔

(1) حضرت شاہ بلاول (2) حضرت شیخ شمس الدین قاری قادری (3) شاہ ابو اسحاق (4) حضرت شیخ داؤد بندگی (5) سید حامد (6) شمس الدین محمد (7) سید علی (8) سید احمد (9) سید صوفی (10) ابی فقر (11) غوث الاعظم حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہم۔

آپ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے اور زہد و ورع میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ آپ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ نہایت عمدہ اور نفیس لباس پہنتے تھے۔ آپ کی مرغوب غذا چولائی کا ساگ تھا۔ ہر رات ایک سے زیادہ قرآن پاک ختم کرتے۔ جس مریض کو آپ کا دم کیا ہوا پانی پلایا جاتا' وہ اللہ کے حکم سے شفایاب ہو جاتا۔

سلسلہ درس و تدریس

حضرتؒ نے لاہور میں درس و تدریس کے لیے ایک مدرسہ بھی قائم فرمایا۔ یہ مدرسہ آپ کی خانقاہ سے ملحق تھا۔ مدرسہ میں دور و نزدیک سے طلباء آکر علوم کی تکمیل کرتے۔ طلباء کو کتابیں اور کھانا وغیرہ مفت مہیا کیا جاتا تھا۔ طلباء کی رہائش کے لیے آپ نے ان کی رہائش گاہ کے لیے بھی عمارات تعمیر کرائیں۔

آپ کا لنگر بڑا وسیع تھا۔ ہر آنے والا وہاں پیٹ بھر کر کھانا کھاتا۔ جاتے وقت ہر شخص کو لنگر سے روٹیاں' مٹھائی' موسمی میوے' کوزے کی مصری وغیرہ بطور تبرک دیا جاتا' تاکہ وہ گھر میں اپنے بال بچوں کو بھی کھلائے۔ (تذکرہ حضرت شاہ بلاول قادری ص 45)

"اولیائے لاہور" میں آپ کی بے شمار کرامات درج ہیں۔ آپ کی یہ کرامت بہت مشہور ہے کہ ایک شخص چوری کی نیت سے آپ کے باورچی خانے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچتے ہی اندھا ہو گیا۔ صبح نماز کے بعد آپ نے داروغہ لنگر سے فرمایا کہ دیکھو' ایک شخص باورچی خانے میں بیٹھا ہے۔ وہ رات سے بھوکا ہے' اسے خوب اچھی طرح کھانا کھلاؤ۔ بعد ازاں وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور برے ارادہ پر معافی مانگی۔ آپ نے اس کے لیے دعائے خیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی واپس لوٹا دی۔ یہ شخص آپ کا مرید ہو کر بلند مرتبہ پر فائز ہوا۔

معمولات

آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ نماز فجر کے بعد چاشت تک مراقبے اور عبادت میں مشغول رہتے۔ پھر لوگوں میں کھانا تقسیم فرمانے کے بعد کچھ دیر آرام فرماتے۔ نماز ظہر باجماعت ادا کرنے کے بعد مریدوں کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کو ارشاد و تلقین فرماتے۔ اسی دوران سینکڑوں لوگ بیماروں کے لیے آپ سے پانی پر دم کراتے اور جو حاجت مند آپ سے سفارش کے طلبگار ہوتے ان کے لیے بادشاہ وقت اور امراء کے نام خطوط لکھ کر انہیں دیتے۔ ان خطوط کے آغاز میں "اللہ بس' باقی ہوس" لکھواتے۔ نماز عصر کے بعد مراقبے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ پھر افطار کے بعد مغرب کی نماز ادا کرتے۔ مغرب کے بعد اپنے حجرۂ خاص میں تشریف لے جاتے اور دو گھنٹے تک نوافل

اور نماز اوابین ادا کرتے۔ پھر لوگوں میں کھانا تقسیم فرماتے اور سب کے آخر میں خود کھاتے۔ عشاء کی نماز کے بعد حجرے میں تشریف لے جاتے اور رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارتے۔ (خزینتہ الاصفیاء جلد اول ص 162)

حضرت میاں میر رحمتہ اللہ علیہ سے آپ کے خصوصی مراسم تھے اور آپ اکثر ان سے ملنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ایک روز کسی نے کہا کہ آپ تو حضرت میاں میرؒ کی بہت تعریف کرتے ہیں' لیکن میں نے ان سے آپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے صرف یہی کہا کہ حضرت بلاول مرد صالح ہیں۔ آپ نے فرمایا: حضرت میاں میرؒ نے میرے لیے جو لفظ ارشاد فرمایا' اس سے بہتر ممکن نہیں۔

آپ کے حالات میں ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ (شاہجہاں) نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں نقد نذر پیش کی۔ انہوں نے انکار کیا' پھر بادشاہ شاہ بلاول کے پاس گئے۔ انہوں نے روپیہ لے لیا اور خادم مطبخ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ روزی رساں ہے۔ اس سے کچھ دن لنگر خانہ کا کام چلتا رہے گا۔ بادشاہ نے کہا۔ حضرت میاں میرؒ نے میری پیش کش قبول نہ کی' لیکن آپ نے قبول کرلی' اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے فرمایا: حضرت میاں میرؒ میں ملکی صفات ہیں۔ ان کی توجہ حکام دنیا کی طرف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں درویش اور مسافر آرام پاتے ہیں اور لنگر خانہ میں جو موجود ہو وہ انہیں کھانے کے لیے ملتا ہے۔ اس لیے ہمیں روپیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ بادشاہ پھر حضرت میاں میرؒ کے پاس گیا اور سب واقعہ عرض کیا۔ حضرت میاں میرؒ نے فرمایا: شاہ بلاول ولی کامل اور دریا کی مانند ہیں۔ میں ان کے سامنے ایک تالاب ہوں۔ دریا میں اگر کوئی ایسی ویسی چیز پڑ جائے تو ▪ پلید نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں تالاب کی کیا حیثیت ہے۔

ایک مرتبہ شاہجہاں نے حاضر ہو کر حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ کوئی ایسا عمل ارشاد فرمائیں' جس سے سعادت اُخروی نصیب ہو۔ آپ نے فرمایا: قیامت کے روز کی بازپرس سے ڈرو' اور اس کا اندازہ امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حال سے کرو کہ ایک بار دریائے جیحوں کے پل میں سوراخ ہو گیا' جس کی وجہ سے وہاں سے گزرنے والے مسافروں کے پاؤں میں چوٹ آئی۔ اس کا عتاب امیرالمومنین رضی اللہ عنہ پر ہوا کہ راہگذر اور مویشیوں کے راستے سے کیوں غفلت کی۔ جس سے خلقِ خدا کو نقصان پہنچا۔ پھر بادشاہ سے فرمایا: قیامت کے روز بادشاہ سے اس کی رعایا کو پہنچنے والی تکالیف کے

بارے میں پوچھا جائے گا' جس طرح حضرت عمرؓ کے عہد میں نقصان تو بغداد میں ہوا' لیکن اس کا جواب امیر المومنینؓ کو دینا پڑا۔ شاہجہان یہ سن کر رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس کے زمانے میں اسے ایسی اچھی باتیں بتانے والے بزرگ موجود ہیں۔

نزہتہ الخواطر میں ہے کہ شاہجہان بادشاہ کئی مرتبہ آپ کی خدمت اقدس میں عقیدتاً حاضر ہوا۔ آپ تبحر عالم تھے اور مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ آپ کی فرمائش پر ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ نے غنیتہ الطالبین (تالیف حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

حضرت شاہ بلاولؒ نے 70 سال کی عمر میں 28 شعبان 1046ھ کو وفات پائی۔ رائے کنہیا لال نے تاریخ لاہور میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ بلاولؒ کو ابتدا میں دریائے راوی کے کنارے جہاں رنجیت سنگھ کی بارہ دری تھی' ایک گنبد کے نیچے دفن کیا گیا' لیکن جب دریائے راوی نے اپنا رخ بدلا' تو اس کی وجہ سے بارہ دری کا بہت سا حصہ خراب ہو گیا۔ چونکہ مزار اس بارہ دری کے بغل میں تھا' اس لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود اپنے وزیر سید عزیز الدین سے کہہ کر ان کا جسدِ اطہر موجودہ مقبرے میں منتقل کروادیا۔ جس وقت آپ کی قبر کھولی گئی تو جسد مبارک بالکل صحیح و سالم تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ آپ ابھی کچھ دیر پہلے ہی فوت ہوئے ہیں۔ بعد نماز جنازہ آپ کو دوبارہ سپرد خاک کیا گیا۔

آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

زندگی مقصود بہرِ بندگیست
زندگی بے بندگی شرمندگیست

آپ کا مزار مبارک گھوڑے شاہ روڈ پر باغ راجہ دینا ناتھ کے نزدیک ایک اونچے چبوترے پر زیارت گاہ خلائق ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کا قطعہ وفات خزینتہ الاصفیاء میں اس طرح نظم کیا ہے

ز دنیا شد چو در خلدِ معلّیٰ
جناب شہ بلاول شاہِ شاہاں

بگو مقبول حق سر مست تاریخ
دگر کامل مہ فضل است اے جاں

۱۰۴۶ھ (خزینۃ الاصفیاء: حصہ اول)

حضرت سید عبدالرزاق مکی سہروردی رحمتہ اللہ علیہ

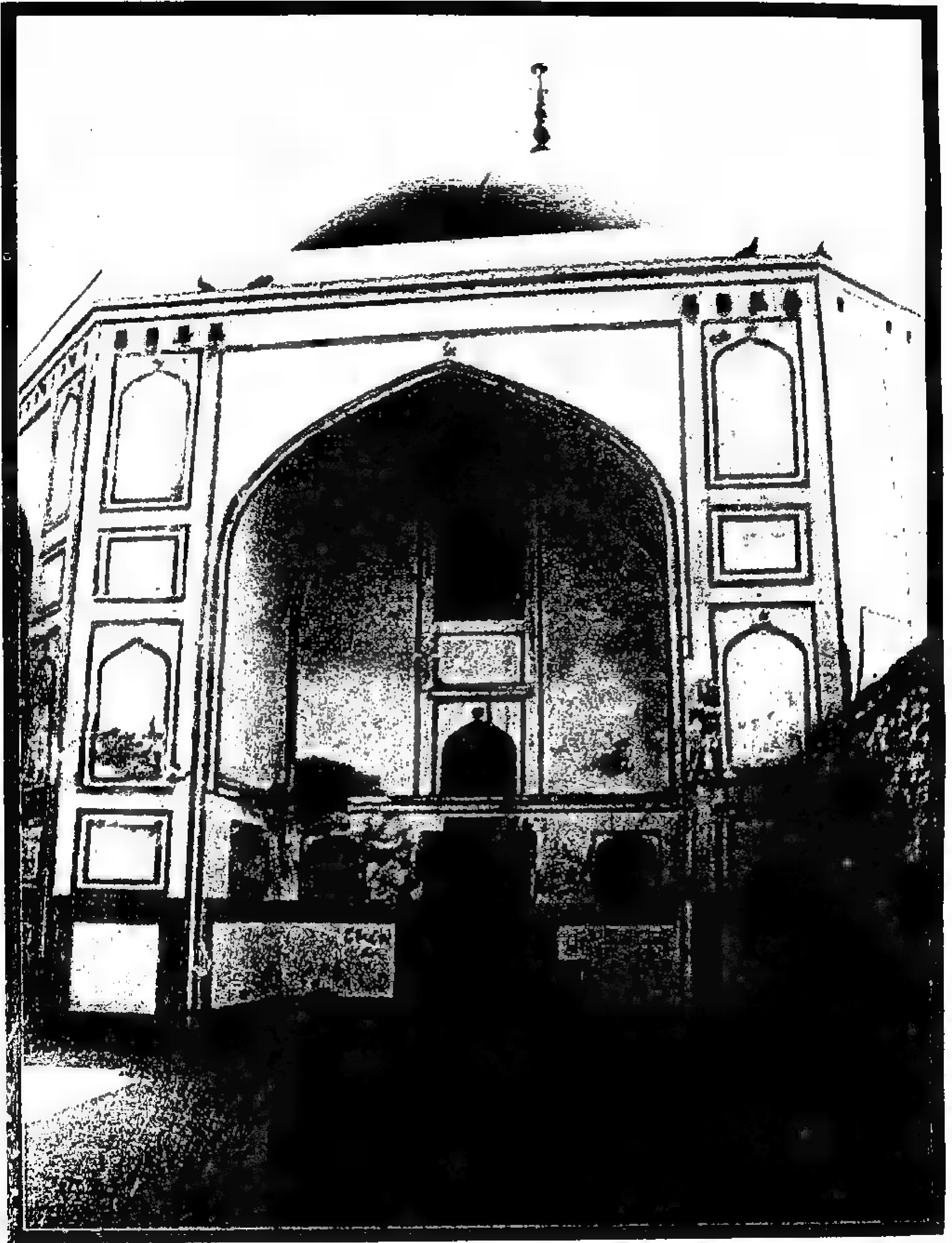
(المتوفی 1048ھ)

آپ حضرت میراں موج دریا بخاریؒ کے خلفاء سے ہیں۔ زہد و تقویٰ اور علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ سبزواری سیدوں کے خاندان سے تھے۔ غزنی سے پشاور تشریف لائے اور چند روز وہاں قیام کر کے دہلی پہنچے۔ اس وقت ہندوستان پر نصیر الدین ہمایوں کی حکومت تھی۔ آپ دہلی میں آ کر شاہی فوج میں ملازم ہو گئے اور کافی عرصہ فوج میں خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر لاہور تشریف لائے اور حضرت میراں محمد شاہ موج دریا بخاریؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ مرشد سے اس قدر محبت تھی کہ پھر کبھی لاہور سے باہر نہ گئے۔

جہاں اب آپ کا مزار ہے' وہاں آپ نے اپنی زندگی ہی میں ایک حجرہ اور دالان بنوا لیا تھا' دن بھر اسی حجرہ میں مشغول عبادت رہتے اور رات اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں گزارتے۔

وصال سے قبل آپ نے مریدوں سے فرمایا کہ ہماری وفات کے بعد ہمیں یہیں ہمارے حجرہ میں دفن کرنا۔ آپ نے 1048ھ کو وفات پائی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو اسی حجرہ میں دفن کیا گیا' جہاں آپ مصروف عبادت رہتے تھے۔ آپ کے مزار مبارک پر جو گنبد ہے' اس کا رنگ نیلا ہے۔ اسی نسبت سے یہ علاقہ چوک نیلا گنبد کے نام سے مشہور ہے۔

سکھوں کے عہد میں آپ کے مزار اقدس کو بہت نقصان پہنچا۔ "تاریخ لاہور" کے مصنف نے لکھا ہے۔ "سکھوں کے عہد میں مسجد اور مقبرہ میں بارود بھری رہتی تھی اور مسجد کے صحن میں آہنی گولے لوہار لوگ بنایا کرتے تھے۔ انگریز یہاں کھانا کھایا کرتے تھے۔



مزار سید عبدالرزاق سہروردیؒ

دنیا داروں سے الگ تھلگ رہنے ہی میں عافیت ہے۔

(حضرت سید عبدالرزاق سہروردیؒ)

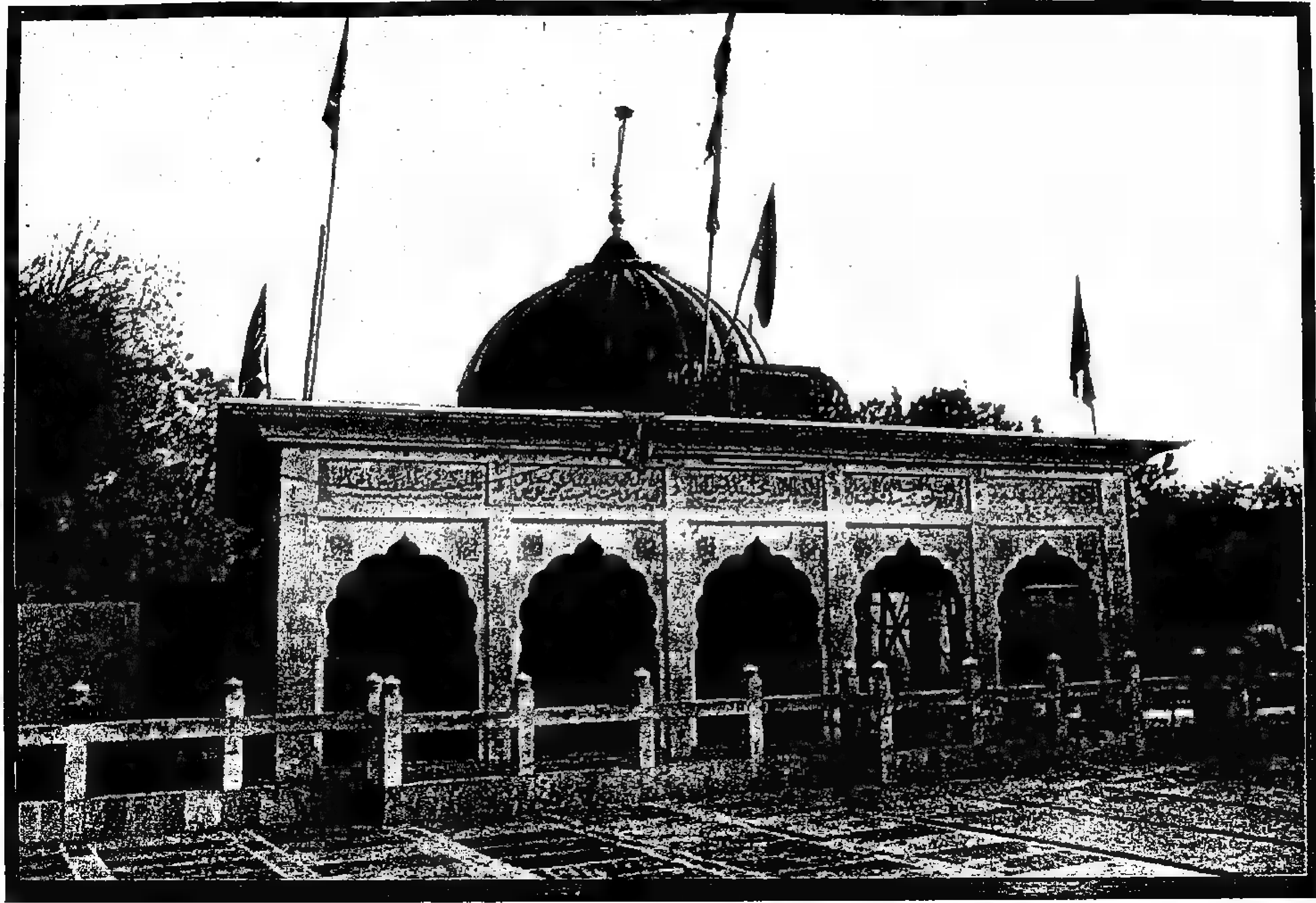
جب چھاؤنی انار کلی سے میاں میر منتقل ہوئی تو مسجد اور مقبرہ منشی نجم الدین ٹھیکیدار چھاؤنی نے لے لیا۔ اس نے مسجد کو از سرنو مرمت کروا کر آباد کروایا۔ مقبرہ میں قبور دوبارہ بنوائیں۔"

حضرت شاہ جمال سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1049ھ)

برصغیر پاک و ہند میں اشاعت و تبلیغ اسلام کا دروازہ غازیان اسلام محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنوی اور سلطان محمد غوری کی فتوحات سے کھلا۔ ان اسلامی فتوحات کے بعد صوفیائے کرام فروغ و اشاعت اسلام کی غرض سے یہاں آئے اور ان کے دم قدم سے ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوا۔ متحدہ ہندوستان میں آنے والے ان صوفیائے کرام کا علم اور مشاہدہ بڑا وسیع تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں اور جلد ہی یہ جان لیا کہ یہاں کی اکثریت (یعنی عوام) ذات پات کی ناروا تقسیم کے باعث سخت عذاب میں مبتلا ہے۔ نام نہاد اونچی ذات کے برہمن انہیں جانوروں سے بھی کم حیثیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام نے سب سے پہلے انہیں اسلام کی تعلیمات مساوات سے متعارف کرایا اور یہاں رہنے والے نیچی ذات کے ہندوؤں کو یہ بتایا کہ قبول اسلام کے بعد تم ہمارے بھائی ہو، اسلام میں انسانوں کے درمیان کوئی اونچ نیچ نہیں۔ اللہ کے دین کا یہی وہ پہلا سبق تھا، جس نے ان کے دلوں کو موہ لیا اور وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

صوفیہ کرام کے حالات کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات کے اولین مخاطب یہاں کے غریب عوام تھے اور ان کا رابطہ بھی زیادہ تر انہیں لوگوں سے رہتا تھا۔ اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ خود آنحضور ﷺ کی دعوتِ اسلام پر اول اول لبیک کہنے والے مکہ کے غریب عوام تھے۔ امیر لوگوں کے قبول حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی رعونت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے یہاں آکر سب سے پہلے تبلیغ و ہدایت کا آغاز غریبوں سے کیا۔ ان مبلغین اسلام میں حضرت سید علی



مزار حضرت شاہ جمال”

ناجائز ذرائع سے ترقی حاصل کرنے کا قصد کبھی نہ کرو
کیونکہ پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا دونوں خطرناک ہیں۔

(حضرت شاہ جمال ؒ)

ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت میاں میرؒ، حضرت میراں موج دریا بخاری اور سینکڑوں دوسرے صوفیاء کرام شامل ہیں۔ انہی بزرگوں میں ایک ممتاز نام حضرت شاہ جمال سہروردی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

حضرت شاہ جمالؒ 966ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند پر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر حکمران تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالواحد کے تعلقات حاکم کشمیر سے خراب ہو گئے، جس کے باعث انہیں کشمیر چھوڑنا پڑا، اور وہ وہاں سے سیالکوٹ آ گئے۔ آپ قاضی جمال الدین بڈشاہی کی اولاد سے تھے، جو کشمیر میں ایک معزز اور باوقار خاندان تھا۔ اس خاندان کے لوگ آج بھی سیالکوٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ حضرت شاہ جمال رحمتہ اللہ علیہ کا شجرۂ نسب شہید کربلا حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

حضرت شاہ جمال کم سنی میں ایک روز ہمجولیوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہے تھے کہ ایک درویش کامل کا اس طرف سے گزر ہوا۔ انہوں نے صرف آپ کو اپنے قریب بلایا اور فرمایا: بیٹا! تم کو دین اسلام کے بڑے بڑے کام کرنے ہیں، تم کھیل کود میں اس طرح اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ بزرگ کی یہ نصیحت سنتے ہی حضرت شاہ جمالؒ کا جی کھیل کود سے اچاٹ ہو گیا اور آپ دینی تعلیم کی غرض سے ایک مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ کئی سال آپ نے نہایت دل لگا کر تعلیم حاصل کی اور دینی علوم میں وہ کمال حاصل کیا کہ لوگوں کے نزدیک آپ کی علمی حیثیت مسلم ہو گئی۔ علمی معاملات میں لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے۔ خزینۃ الاصفیاء کے مصنف نے لکھا ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات ظاہری و باطنی کمالات کی جامع اور اور صوری و معنوی حسن کی مظہر تھی۔ بلاشبہ آپ مظہر جلال اور مصدر کمال تھے۔ (ص 767)

حضرت شاہ جمالؒ 895ھ مطابق 1587ء میں لاہور تشریف لائے اور اچھرہ کے علاقہ (موجودہ شاہ جمال کالونی) میں جہاں اب آپ کا مزار مبارک ہے، مسند ارشاد بچھائی لوگ آپ کے پاس آتے تو آپ خاص طور پر انہیں جھوٹ بولنے، غیبت کرنے، کم تولنے اور کم ماپنے سے منع فرماتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ کل قیامت کے روز انہی اعمال صالحہ کی بدولت نجات ممکن ہو گی۔ جو لوگ کم تولتے ہیں اور کم ماپتے ہیں، وہ کل قیامت

کے روز سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ ایک روز لاہور کے علاقہ چوک جھنڈا سے ایک غلہ فروش حسو تیلی نامی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں خاص طور پر پورا تولنے کی نصیحت کی اور سلسلہ میں اسلامی احکام اس موثر انداز میں بیان فرمائے کہ وہ روتے ہوئے آپ کے مرید ہو گئے۔ اس کے بعد ان کا یہ حال ہو گیا کہ انہوں نے غلہ تولنے کے لیے وہ باٹ استعمال کرنے شروع کر دیئے' جو سونا تولنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ غلہ فروش حسو تیلی آپ کی تعلیم و تربیت سے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے اور حضرت شاہ جمال نے انہیں اپنے سلسلہ عالیہ کی خلافت عطا فرمائی۔ آج لوگ انہیں حضرت پیر حسن شاہ ولیؒ کے نام نامی سے جانتے ہیں۔ ایبٹ روڈ (عقب تھانہ گوجر سنگھ) میں ان کا مزار مبارک آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت شاہ جمالؒ سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں سلسلہ قادریہ میں بھی بیعت کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ سلسلہ سہروردیہ میں آپ کے شیخ طریقت حضرت شاہ ککرا بیگؒ تھے۔ شجرہ طریقت اس طرح ہے:

حضرت شاہ جمالؒ ۔ حضرت شاہ ککرا بیگؒ ۔ شاہ شرفؒ ۔ شاہ معروفؒ ۔ شاہ جعفر الدینؒ ۔ شاہ فہیم الدینؒ ۔ شیخ جمالؒ ۔ شیخ صدر الدین عارفؒ ۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ ۔ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ (بحوالہ تحقیقات چشتی)۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے خوب خوب نوازا تھا' انتہائی خوش اخلاق تھے' جو ایک بار ملتا' متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ فیاض اور سخی اس قدر تھے کہ جو بھی ضرورت مند آتا' اسے اس کی ضرورت سے بڑھ کر عطا فرماتے۔ اس مقصد کے لیے اپنے مصلے کے نیچے ہاتھ ڈالتے اور رقم نکال لیتے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کو دست غیب حاصل تھا۔

آپ اکثر سخت ریاضت و مجاہدات میں مشغول رہتے۔ آپ کے تذکرہ نگاروں نے آپ کی کئی چلہ گاہوں کا ذکر کیا' جہاں آپ مختلف اوقات میں عبادت میں مشغول رہے۔ مثلاً (1) دمدمہ اچھرہ (جہاں آپ کا مزار مبارک ہے) (2) شاہ جمال روڈ شیخوپورہ (3) شاہ رحمٰن (بھڑی شریف) (4) چلہ گاہ شاہدرہ (5) ریاست چمبہ (ضلع گورداسپور۔ بھارت)

قیام لاہور کے دوران آپ نے ایک اونچے ٹیلہ پر دمدمہ کی تعمیر کا کام شروع کرایا'

اتفاق سے ان دنوں قریب ہی شہنشاہ اکبر کی بیٹی ایک محل تعمیر کروا رہی تھی' جس کی وجہ سے تمام معمار اور مزدور وہاں مصروف تھے۔ جب آپ کو مزید معمار اور مزدور دستیاب نہ ہوئے تو آپ نے طے فرمایا کہ محل کی تعمیر کرنے والے معمار اور مزدور ہی رات کے وقت دمدمہ کی تعمیر کا کام کیا کریں۔ اس پر تمام کاریگر اور مزدور خوشی خوشی دمدمہ کی تعمیر کا کام کرنے لگے۔ آپ ان لوگوں سے دن بھر کی محنت سے بہت کم کام لیتے' لیکن اجرت انہیں دن بھر کی شاہی اجرت کے مطابق ادا کرتے۔

مولانا نامی مؤلف بزرگان لاہور نے لکھا ہے کہ جب یہ دمدمہ تیار ہو گیا' تو شہزادی نے کہلا بھیجا کہ ایک درویش خدا مست کے لیے زیبا نہیں کہ وہ شاہی عمارت سے بلند عمارت تعمیر کرے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ وہ خود ہی اس کی بلندی کم کر دیں' ورنہ ہم شاہی ملازموں کو حکم دیں گے کہ وہ دمدمہ کی بالائی منزلیں منہدم کر دیں۔ نیز یہ بھی کہا کہ آپ کے تعمیر کردہ دمدمہ سے ہمارے محل پر نظر پڑتی ہے' جس سے بے پردگی کا اندیشہ ہے۔ یہ شاہی حکم سن کر حضرت بہت ہنسے اور فرمایا ہم اس کی بالائی منزلیں خود ہی گرا دیں گے' لیکن ایک بات شہزادی سے کہہ دیں کہ یہ فقیر خانہ قیامت تک قائم رہے گا لیکن شہزادی کے یہ محل اور باغات بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ بعد میں حضرت نے دمدمہ کی بالائی منزلوں کو خود ہی گرا دیا جس کا حال حضرت کے سب تذکروں میں موجود ہے۔

حضرت شاہ جمالؒ کے زمانے میں اکبر کے دین الٰہی کا چرچا ہوا' تو اکثر صوفیائے کرام نے اس کی مخالفت کی۔ حضرت نے بھی اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا فرمایا۔ جناب محمد نسیم عباسی اپنی مختصر کتاب "حضرت سید شاہ جمال قادری سہروردیؒ" میں لکھتے ہیں:

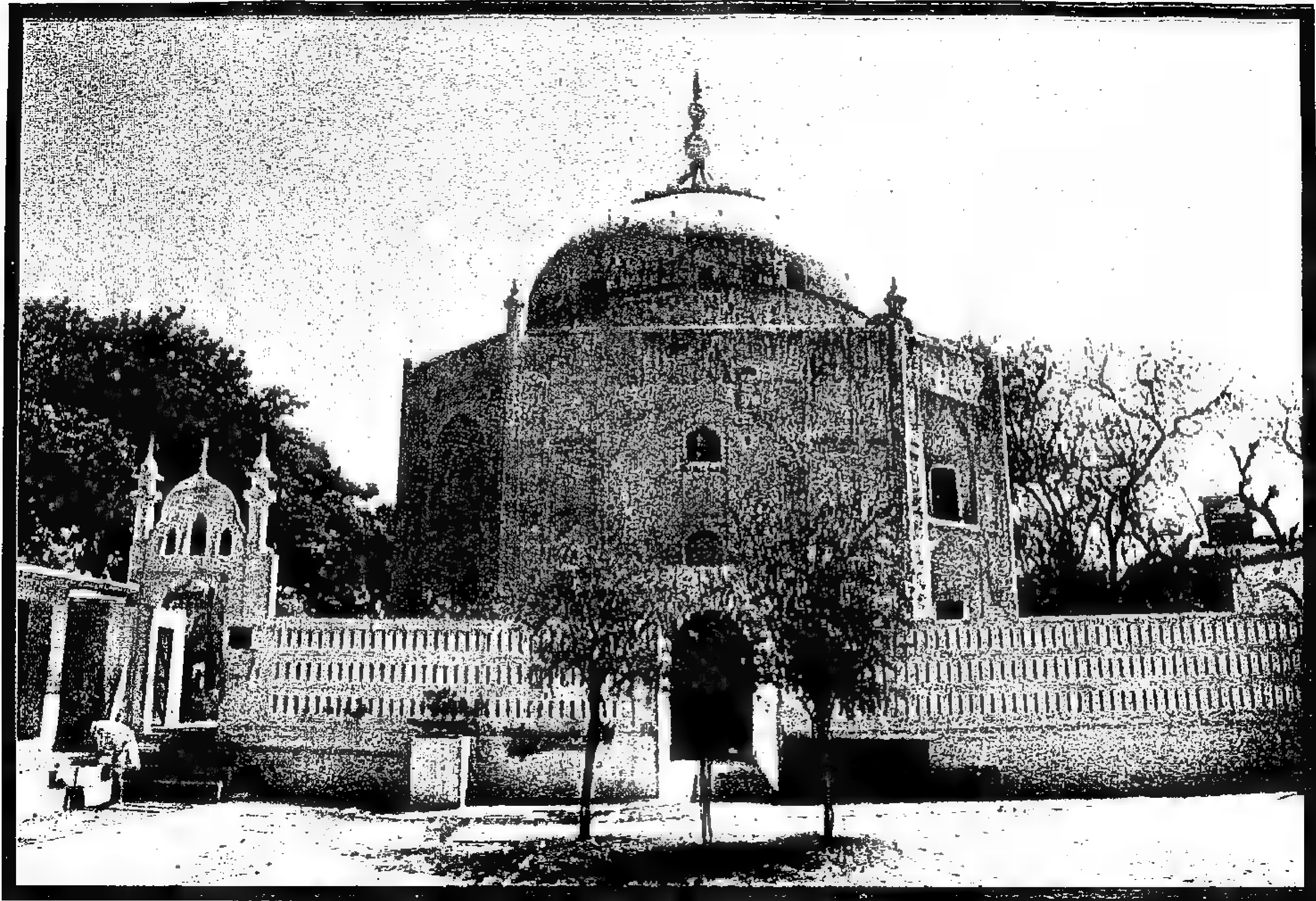
"جب جلال الدین محمد اکبر نے اپنے مشیروں کے غلط مشورہ پر دین الٰہی جاری کیا' تو علمائے حق اور صوفیائے اتقاء نے اکبر کی اس غلط روش کی سختی سے مذمت کی اور اس کی وفات کے بعد علماء حق' صوفیائے کرام اور امرائے سلطنت نے جہانگیر کی تخت نشینی کے لیے اس شرط پر مدد کی کہ وہ اکبر کے جاری کردہ تمام قوانین منسوخ کر دے گا۔ اسی طرح شاہجہاں نے بھی اس مذہب (دین الٰہی) سے بیزاری کا اعلان کیا۔ حضرت شاہ جمالؒ نے چونکہ ان تینوں شہنشاہوں کا دور دیکھا تھا اور اکبر کے عقائد کا عام چرچا بھی تھا' لہٰذا آپ نے بھی اس کی مخالفت کی اور اس سلسلے میں اپنے حلقہ ارادت کو اکبر کے نافذ کردہ دین الٰہی کے غلط عقائد کے بارے میں آگاہ کیا۔ اکبری فتنہ کی سرکوبی میں لاہور کے صوفیائے

کرام کا ایک خاص مقام ہے اور ان کے درمیان حضرت شاہ جمال ایک امتیازی مقام کے حامل ہیں۔"

وفات

آپ نے تمام عمر تجرد میں بسر کی۔ آپ کی وفات 4 ربیع الثانی 1049ھ کو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئی۔ تذکرۂ صوفیائے پنجاب میں خزینۃ الاصفیاء کے حوالے سے آپ کی وفات کا حال اس طرح لکھا ہے کہ آپ بسلسلہ عبادت و ریاضت اپنے حجرہ مبارک میں چلہ کش تھے۔ تیسویں روز اس قدر بارش ہوئی کہ حجرہ مبارک کا ایک حصہ گر گیا۔ اسی حادثہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ خدام نے حضرت کو حجرہ سے نکالنا چاہا' تو اندر سے آواز آئی کہ جو کچھ ہونا تھا' ہو چکا۔ اب پردہ فاش نہ کرو' حجرے کا دروازہ بند کر کے اوپر قبر کا نشان بنا دو۔ اس اشارۂ غیبی کی بناء پر مریدوں نے اسی حجرہ مبارک کو مدفن قرار دے کر نشان قبر قائم کیا۔

آپ تمام عمر لوگوں کی تربیت و ہدایت میں مشغول رہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری رکھا۔ ان خلفاء میں حضرت پیر حسن شاہ ولی سہروردی (جن کا ذکر مبارک اوپر آ چکا ہے) اور حضرت شیخ فخر الدین سہروردی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت شیخ فخر الدین ایک ہندو کھتری کے بیٹے تھے' جو آپ کی دعا سے پیدا ہوئے اور پھر مسلمان ہو کر آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور آپ ہی کی خدمت میں رہنے لگے۔ ان کی تعلیم و تربیت خود حضرت شاہ جمال رحمتہ اللہ علیہ نے فرمائی۔ حضرت نے شیخ فخر الدین کو لاہور میں محلہ جوڑے موری (اندرون شاہ عالمی گیٹ) ایک مکان بنا کر دیا' جس میں انہوں نے سکونت اختیار کی۔ یہ مکان آج بھی "مکان شاہ جمال" کے نام سے مشہور ہے۔



مزار حضرت سید خاوند محمود المعروف حضرت ایشاںؒ

جو شخص ضمیر کی پروا نہیں کرتا اس پر
کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔
(حضرت سید خاوند محمود المعروف حضرت ایشانؒ)

سید خاوند محمود نقشبندی
المعروف حضرت ایشان رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1052ھ)

یہ گیارھویں صدی ہجری کا واقعہ ہے۔

کشمیر میں یوسف شاہ بن علی شاہ حاکم تھا۔ یہ اولیاء اللہ سے انتہائی درجہ بغض و کینہ رکھتا تھا۔ کشمیر میں اس وقت ایک مرد باخدا کا بڑا شہرہ تھا۔ عوام و خواص کمال عقیدت کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دعا کراتے۔ اس کے حلقہ درس میں ہر روز سینکڑوں گمراہ انسان نور ایمان سے اپنے سینوں کو منور کرتے' لیکن اس اللہ والے بزرگ کی یہ مقبولیت حاکم وقت کو ذرا نہ بھائی۔ آخر ایک روز حاکم نے اس بزرگ کو یہ پیغام بھجوایا کہ آپ پندرہ روز کے اندر اندر کشمیر سے نکل جائیں۔ بزرگ نے یہ شاہی فرمان سنا' تو فوراً سجدہ میں سر رکھ دیا اور کہا: بار الٰہی! اب یہ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ ابھی پندرہ روز مکمل نہ ہوئے تھے کہ اکبری فوج نے کشمیر پر حملہ کیا اور سارے علاقے کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

نقشبندی سلسلہ کے یہ بزرگ جن کو حاکم نے پندرہ دن کے اندر اندر کشمیر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اور جن کی کرامت سے خود حاکم کو اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے' حضرت ایشاں رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ جن کا اصل نام نامی سید خاوند محمود تھا۔

"ایں شان" فارسی زبان کا لفظ ہے' جس کے معنی ہیں "بڑی شان والا۔" آپ کے تمام مریدین اور معتقدین آپ کو اس عزت والے نام سے پکارتے تھے۔ ترکستان میں آج بھی یہ لفظ مرشد یا استاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

حضرت ایشاںؒ 971ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید شریف الدین تھا۔ والدہ ماجدہ امیر المومنین حضرت علی ﷺ کے فرزند حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد سے تھیں۔ تذکرہ حضرت ایشاں میں میاں اخلاق احمد نے آپ کا شجرۂ نسب اس طرح لکھا ہے: حضرت خواجہ خاوند محمود (حضرت ایشاں) بن خواجہ سید شریف بن خواجہ سید ضیاء بن خواجہ سید میر محمد بن خواجہ سعید تاج الدین حسین بن خواجہ سید حسین بن خواجہ سید علاء الدین عطار (رحمہم اللہ تعالیٰ)

حضرت ایشاںؒ کے مُورثِ اعلیٰ حضرت خواجہ علاء الدّینؒ نقشبندیہ سلسلہ کے بانیٔ حضرت خواجہ بہاؤ الدینؒ نقشبند (م 791ھ) کے داماد اور خلیفہ اعظم تھے۔ ان کی رحلت کے بعد آپ مسندِ ارشاد پر رونق افروز ہوئے اور سلسلہ نقشبندیہ کو فروغ دیا۔

حضرت ایشاںؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے زیر سایہ بخارا میں حاصل کی۔ بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر والد ماجد کے ارشاد کے مطابق بخارا کے مدرسہ سلطانیہ میں داخل ہوئے اور علوم متداولہ کی تحصیل کی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں آپ تمام علوم ظاہری سے فارغ ہو گئے پھر راہ سلوک میں قدم رکھا اور حضرت خواجہ محمد اسحاق "سفید کی" کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ چند سال مرشد کی خدمت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔

آپ کم عمری ہی میں اپنے علم و فضل' زہد و تقویٰ' اتباع قرآن و سنت اور بدعات کی مخالفت کے باعث ہر طرف مشہور ہو گئے تھے۔ خواص و عوام آپ کی بے حد قدر کرتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد آپ کے دل میں سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ 23 سال کی عمر میں پہلے ختلان کے مشہور شہر ختش میں تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا' پھر بلخ' سمرقند' ہرات اور قندھار سے ہوتے ہوئے کابل تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ کابل ہی میں آپ کو اپنے والد ماجد کا خط ملا جس میں تحریر تھا کہ اب میرا آخری وقت ہے۔ اس لیے جلد آکر مجھے مل جاؤ۔ یہ خط پاتے ہی حضرت ایشاںؒ اپنے والد ماجد سے ملنے کے لیے "دہلوی حصار" روانہ ہوئے' لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آپ کے والد ماجد چند روز قبل انتقال کر گئے ہیں۔ والد ماجد کے ترکہ میں سے آپ کو جو کچھ ملا وہ آپ نے اپنی ہمشیرگان میں تقسیم کر دیا۔ چند روز "دہلوی حصار" میں قیام کر کے آپ کابل واپس آ گئے۔ لیکن

جلد ہی کشمیر تشریف لے گئے اور وہاں رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔

حضرت ایشاںؒ اپنے مریدوں اور عقید تمندوں کے ساتھ حلقہ ذکر و فکر میں شریک ہوتے اور اپنی باطنی توجہ سے ان کی رہنمائی فرماتے۔ قرآن و حدیث کے علوم کی ترویج' اشاعت دین اسلام' احکام شریعت کی پیروی' ریاضت و مجاہدات اور مراقبہ' آپ کے طریقہ تعلیم و تلقین کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ آپ غیر شرعی علوم سے احتراز و احتیاط کرنے اور اعلائے کلمتہ الحق پر بہت زور دیتے تھے۔ اشاعت دین کے لیے آپ نے خانقاہیں قائم کیں۔ درس جاری کئے۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں جو دینی مدرسے بند ہو چکے تھے۔ آپ نے انہیں اپنے مریدوں اور معتقدین کے ذریعے از سرنو آباد کیا۔

خانقاہ نقشبندیہ کے نام سے آپ نے سری نگر کشمیر میں ایک مرکزی درسگاہ قائم کی اور جب تک کشمیر میں مقیم رہے آپ نے یہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کے گرد ہر وقت عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی جو آپ کے ارشادات و ملفوظات سے فیض یاب ہوتی۔

کشمیر سے آپ لاہور تشریف لائے تو یہاں بھی آپ نے ایک درس گاہ قائم کی جو بعد میں مدرسہ حضرت ایشاںؒ کے نام سے معروف ہوئی۔ اس مدرسہ میں آپ ہر جمعہ کو وعظ فرماتے۔ جس میں کثیر تعداد میں علماء و مشائخ بھی شریک ہوتے۔ لاہور میں نو سال تک آپ کا فیضان آپ کی حیات ظاہری میں جاری رہا۔

لوگوں کی کثیر تعداد نے آپ سے علمی و روحانی فیض حاصل کیا۔ آپ کے مدرسہ میں درس قرآن و حدیث کو خاص طور پر بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ مدرسہ حضرت ایشاں اس زمانے میں روحانی تربیت کا عظیم مرکز تھا۔ آپ اکثر فرماتے کہ جو سنت مطہرہ کی پیروی میں جتنا فعال ہے اور اتباع پیغمبر ﷺ میں جتنا زیادہ جذبہ رکھتا ہے' اتنا ہی وہ روحانیت اور بزرگی میں افضل و اعلیٰ ہے۔ تبلیغ کی غرض سے آپ نے ایک جماعت تیار کی ان مبلغوں کو آپ اپنے مدرسہ میں تعلیم و تربیت دیتے۔ جب یہ لوگ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کر لیتے تو آپ انہیں اشاعت دین کی خاطر حجاز' دمشق' شام' عراق' ایران' کشمیر اور وسط ایشیاء وغیرہ ممالک میں بھیجتے۔ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اگر کوئی آپ کو مناظرے کی دعوت دیتا تو آپ اسے بخوشی قبول فرماتے۔ آپ کی پوری زندگی بدعات کے رد اور اسلامی تعلیمات کے فروغ میں گزری۔ قیام لاہور کے زمانے میں آپ

اکثر کشمیر تشریف لے جاتے۔ کئی کئی روز وہاں قیام فرماتے اور اہل کشمیر کو اپنے وعظ و ہدایت اور درس و تدریس سے نوازتے آپ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ قیام کشمیر کے دوران شہنشاہ جہانگیر کشمیر آیا تو وہ کمال عقیدت کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور درخواست کی کہ آپ مستقل طور پر لاہور تشریف لے چلیں اور وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے کشمیر کا مدرسہ اور خانقاہ نقشبندیہ کا انتظام اپنے فرزندوں کے سپرد کیا اور خود لاہور تشریف لے گئے۔

آپ کے ہم عصر بزرگوں میں حضرت مجدد الف ثانی'' ' حضرت شیخ طاہر بندگی'' ' حضرت میاں میر'' ' حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی'' ' حضرت شیخ آدم بنوری'' ' حضرت شاہ ابوالمعالی لاہوری'' اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت میاں میر رحمتہ اللہ علیہ اکثر مسائل شریعت و طریقت اور ''وحدت الوجود'' کے بارے میں آپ کے ساتھ مراسلت و گفتگو فرماتے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی'' آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک جگہ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ''خواجہ خاوند محمود پیرزادۂ ماأند و جذبہ موروثی دارند۔'' علاوہ ازیں مکتوبات شریف میں اکثر مقام پر حضرت ایشاں'' کو آپ نے ''شیخیت پناہ'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔

آپ'' کے تذکرہ نگاروں نے آپ کی بعض تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے' جو حسب ذیل ہیں:

(1) رسالہ محمودیہ۔ جس میں آپ نے اپنے سلسلہ طریقت کے اوراد و اذکار اور مشاغل و کیفیات کے علاوہ اپنا شجرہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ یہ رسالہ 1025 ہجری میں مرتب ہوا۔ بعد میں اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا جس کے مؤلف حضرت خواجہ محمد بن خواجہ وفائی نقشبندی'' ہیں۔ اس ضمیمہ کا سن تصنیف 1126ھ ہے۔ اس میں حضرت ایشاں'' سے لے کر خواجہ محمد بن خواجہ وفائی نقشبندی'' تک خاندان محمودیہ (حضرت سید خاوند محمود المعروف حضرت ایشاں'') کے حالات طیبات درج ہیں۔

(2) رسالہ رد شیعت۔ یہ حضرت ایشاں'' کی خصوصی تصنیف ہے۔

ان تالیفات و تصنیفات کے علاوہ آپ نے حضرت سید علی ہجویری'' المعروف بہ

حضرت داتا گنج بخشؒ کی تصنیف لطیف "کشف المحجوب" کو اپنے دست مبارک سے نقل کیا اور حاشیہ پر مولانا عبدالغفور لاریؒ کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں آپ نے قرآن مجید کی کتابت اپنے ہاتھ سے کی' جو ہمیشہ آپ کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خاندان میں ایک عرصہ تک محفوظ رہا۔

آپ کی تعلیمات

حضرت ایشاں اکثر نقشبندیہ سلسلہ کے چار اہم اصولوں کا ذکر فرماتے اور تاکید فرماتے کہ سالک کو ان اصولوں پر سختی سے کاربند رہنا چاہئے۔ وہ اصول یہ ہیں۔ (1) یادداشت (2) نگاہداشت (3) خلوت در انجمن (4) سفر در وطن۔

فرماتے ہیں کہ ہمارے سلسلے میں سالک کو شیخ کی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور نماز عصر کے بعد اپنے دن بھر کے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے کہ صبح سے اب تک کیا کیا ہے اور کتنے نفس گم کئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ مریدوں کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کے اقوال و ملفوظات کا مطالعہ کرتے رہیں۔ آپ اکثر حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول بیان فرماتے کہ بزرگوں کی باتیں اللہ کے لشکروں میں سے زمین پر ایک لشکر ہے۔ ان کی برکت سے مریدوں کے احوال قوی ہوتے ہیں اور مشتاقین کا شوق بڑھتا ہے۔

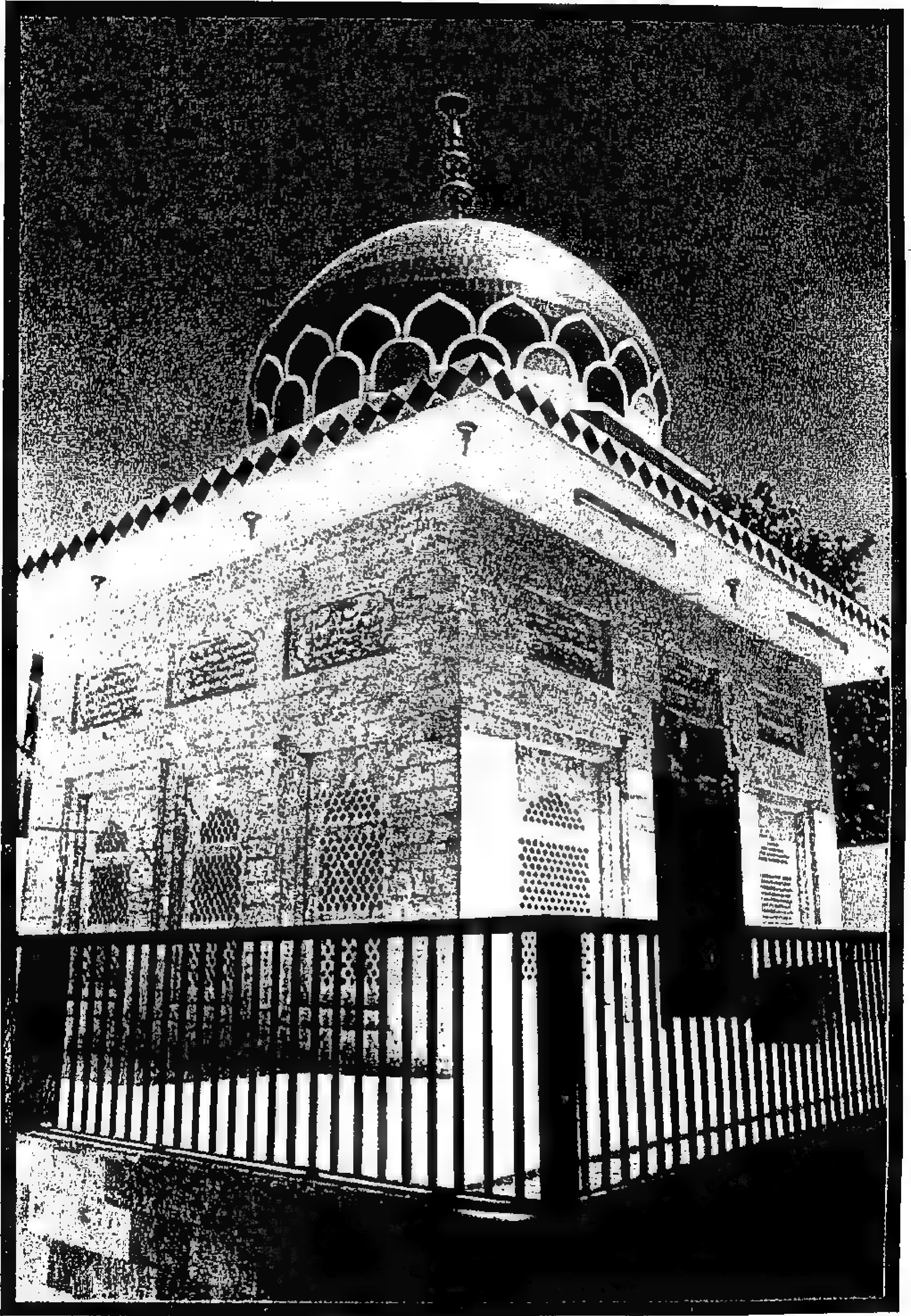
حضرت ایشاںؒ فرماتے ہیں کہ سالک کو مراقبہ کی طرف پوری توجہ دینی چاہئے۔ مراقبہ تمام صفات کمال کا جامع ہے اور تمام نقصانات سے پاک ہے۔ ذکر کثرت سے کرنا چاہئے اور اس سے کسی وقت بھی خواب یا بیداری میں غافل نہ رہنا چاہئے۔ (تذکرہ حضرت ایشاںؒ)

وصال

جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو ٹھیک پندرہ روز پہلے نماز عصر کے بعد آپ نے اپنے مرید نواب افتخار الدین عالی جاہ سے فرمایا کہ میں پندرہ دن کے بعد اس دارالفنا سے دارالبقا کی طرف کوچ کر جاؤں گا۔ جب سولہواں دن آیا تو بروز شنبہ 12 شعبان 1052 ہجری نماز مغرب ادا کرنے کے بعد آپ نے چند بار مولانا جامیؒ کا یہ شعر پڑھا۔

الٰہی غنچۂ امید بکشا
گلے از روضۂ جاوید بنما

پھر سجدہ میں گئے اور جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ شاہ جہاں اس وقت لاہور میں موجود تھا۔ وہ اپنے وزیروں اور امیروں کے ساتھ تجہیز و تکفین میں شریک ہوا۔ قبر مبارک میں اتارنے سے قبل جب چہرہ مبارک کی زیارت کے لیے کفن ہٹایا گیا تو دیکھا کہ ہونٹ مبارک اسی طرح ذکر میں مشغول ہیں جس طرح حیات ظاہری میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کو بیگم پورہ لاہور میں دفن کیا گیا۔ آپ کا مزار مبارک زیارت گاہِ خلائق ہے۔



مزار حضرت مادھو لال حسینؒ

ہر شے بھلیں، رب نہ بھلیں، رب نہ بھلن جیہا

(حضرت شاہ حسینؒ مرشد حضرت مادھو لال حسینؒ)

حضرت شیخ محبوب الحق رحمتہ اللہ علیہ
المعروف مادھو لال حسین قادری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1056ھ/ 1646ء)

آپ سلسلہ قادریہ میں حضرت شاہ حسین لاہوریؒ کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں۔ مادھو رام کے والد برہمن تھے' جو شاہدرہ میں رہائش پذیر تھے۔ مادھو رام بہت خوبصورت تھے کہتے ہیں کہ شاہ حسینؒ نے انہیں پہلی بار دیکھا تو بے اختیار منہ سے نکلا کاش ایسا خوبصورت انسان دوزخ کا ایندھن نہ بنے۔

ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور مادھو ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ آخر سترہ برس کی عمر میں ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ شاہ حسینؒ نے ان کا اسلامی نام محبوب الحق رکھا۔

مادھو نے 13 برس راجہ مان سنگھ (جو اکبری عہد کے امراء میں سے تھا) کی ملازمت میں گزارے اور اس کے ساتھ دکن کی مہم میں شریک ہوئے۔ شیخ مادھو کی دکن سے واپسی سے ایک سال قبل ان کے مرشد حضرت شاہ حسین رحلت فرما گئے۔ شاہ حسینؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ انہیں شاہدرہ میں دفن کیا جائے۔ ساتھ ہی انہوں نے پیش گوئی کی کہ اس تدفین کے ایک سال بعد مادھو آئے گا اور میری نعش کو یہاں سے نکال کر باغبانپورہ میں دفن کرے گا' اور وہی ہمارا سجادہ نشین ہو گا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہی ہوا اور مادھو تقریباً 35 سال تک شاہ حسین کے سجادہ نشین رہے۔ (خزینۃ الاصفیاء جلد اول)

مادھو کو اپنے شیخ سے بے حد محبت تھی۔ ان کی وفات کے بعد وہ اکثر ان کے مزار سے لپٹ کر فراقیہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

حضرت شیخ محبوب الحق المعروف مادھو لال حسین قادریؒ نے 1056ھ مطابق 1646ء بروز دو شنبہ وفات پائی۔ مزار مبارک حضرت شاہ حسینؒ کے ساتھ ہے۔ آپ کا عرس مبارک میلہ چراغاں کے نام سے مشہور ہے' جو موسم بہار کے آغاز پر ہر سال باغبانپورہ میں منعقد ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ بہاری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1060ھ/ 1650ء)

خواجہ بہاری قصبہ حاجی پور (بہار) میں پیدا ہوئے۔ کم عمری ہی میں حصول تعلیم کے لیے گودہ پور (بہار) چلے گئے اور شیخ جمال الدین اولیاء سے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر لاہور تشریف لائے اور ملا محمد فاضل لاہوری سے فقہ' حدیث اور تفسیر پڑھی۔ ملا اپنے اس ہونہار شاگرد سے اس قدر خوش تھے کہ انہیں اپنے گھر ہی میں رہنے کی اجازت دے دی۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ زاہد مرتاض تھے۔ سفینۃ الاولیاء میں ہے کہ جن دنوں خواجہ بہاری ملا محمد فاضل کے ہاں سکونت پذیر تھے۔ ایک دن ملا صاحب کی اہلیہ خواجہ صاحب کے لیے آش کا پیالہ دینے آئیں۔ دیکھا کہ خواجہ صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور ان کے اعضاء ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بھاگی ہوئی ملا صاحب کے پاس گئیں اور تمام ماجرا بیان کیا۔ ملا صاحب یہ سنتے ہی موقع پر پہنچے' تو دیکھا خواجہ بہاری سر جھکائے مراقبہ میں بیٹھے ہیں۔ واپس آکر اہلیہ سے کہا کہ اللہ والوں کے کئی احوال و مقامات ہوتے ہیں' تم نے جو دیکھا ہے' اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت میاں میر لاہوری ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دست حق پرست پر سلسلہ قادری میں بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

حضرت میاں میر لاہوری ؒ کی وفات کے بعد ان کے خلفاء میں خواجہ بہاری سب سے زیادہ اہل لاہور کی عقیدت کا مرکز بنے۔ لوگ کثرت سے آپ کی خدمت میں آتے اور توبہ کر کے حلقہ مریدین میں داخل ہوتے۔ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں آپ کی کئی کرامات تحریر کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے بیٹے کو خواجہ صاحب کی خدمت میں

لایا' اس کے جسم پر برص کے سفید داغ تھے۔ آپ نے فرمایا: کسی حکیم سے اس کا علاج نہ کراؤ' اس کا علاج میں خود کروں گا۔ چنانچہ آپ ہر روز ایک داغ پر انگلی رکھتے اور وہ مٹ جاتا۔ یہاں تک کہ تمام داغ معدوم ہو گئے اور لڑکا بالکل درست ہو گیا۔

دارا شکوہ کا کہنا ہے کہ 1051ھ میں مرزا آصف بیگ والئی ایران نے قندھار کی تسخیر کا ارادہ کیا' تو میں نے اس کا ذکر حضرت خواجہ بہاری سے کیا۔ آپ نے فرمایا: اس کی کیا مجال کہ تمہاری مملکت پر دست درازی کر سکے۔ ان شاء اللہ مارا جائے گا۔ ایک ماہ کے بعد خبر آئی کہ مرزا آصف بیگ کو اسی کے دشمنوں نے زہر دے کر ہلاک کر دیا ہے۔

آپ نے تمام عمر ہدایت خلق اور درس و تدریس میں گزاری۔ آپ کا مدرسہ دہلی دروازہ کے اندر تھا۔ جو صاحب خزینۃ الاصفیاء کے قول کے مطابق بہت مشہور تھا اور کسب علوم کے لیے طلبہ دور دور سے آ کر فیض یاب ہوتے تھے۔ نواب سعد اللہ خاں اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے۔

شعر فہمی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ ایک روز کسی شخص نے حکیم سنائی کے اس شعر کا مطلب دریافت کیا۔

مجلسِ وعظ رفتنت ہوس است
مرگِ ہمسایہ' وعظ تو بس است

فرمایا' ہمسایہ سے مراد قواء اور اعضائے جسمانی ہیں یعنی دانت' آنکھ' کان ہاتھ پاؤں وغیرہ۔ بڑھاپے میں ان کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سب اعضاء دل کے ہمسائے ہیں۔ اس شعر میں دل کو خطاب کیا ہے کہ اعضاء کے ضعف سے نصیحت حاصل کرے اور خبردار رہے۔

فقر و استغنا میں آپ کا مقام بہت بلند تھا۔ ایک دفعہ شاہجہاں آپ سے ملاقات کے لیے آیا۔ آپ کو خبر ہوئی تو چپکے سے گھر سے نکل گئے۔ بادشاہ بزرگوں کا ماننے والا تھا' اصل بات سمجھ گیا' اس نے اپنے درباری خان ناظر (مصنف تاریخ مراۃ العالم) کو خواجہ صاحب کی خانقاہ میں بٹھا دیا کہ جب خواجہ صاحب تشریف لائیں' ہمارے سلام نیاز مندانہ کے بعد یہ شعر عرض کر دیں۔

امانت مہمان نداشت
خانہ بے مہماں گذاشت

جب خواجہ واپس تشریف لائے۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: میں اپنا اطمینان قلب کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ایک فقیر' مجھے بادشاہوں سے کیا سروکار؟

خواجہ صاحب کی وفات 1060ھ مطابق 1650ء میں ہوئی۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ ایک روز آپ شالا مار باغ کی (جو اس زمانے میں نیا تعمیر ہوا تھا) سیر کے لیے گئے۔ وہاں دو تین مرتبہ فرمایا: ابھی وہ مجھے طلب نہیں کرتے' جب بھی وہ طلب کریں' مجھے مرشد کی قبر کے پاس دفن کرنا۔

آپ کا مزار مبارک علامہ اقبال روڈ پر میو گارڈن کے اندر ریلوے آفیسرز کالونی میں ہے۔ خزینۃ الاصفیاء میں آپ کا یہ مادۂ تاریخ درج ہے۔

بہاری چوں بہ جنت رفت بر بست
ز دنیا جست یکسر بر کناری
بسال رحلتش سرور رقم کرد
کہ "سلطان الولی خواجہ بہاری"

1060ھ

غلام دستگیر نامی نے لکھا ہے کہ خواجہ بہاری کا گنبد ایک بلند خشتی چبوترے پر حضرت میاں میرؒ کے روضہ کے مغربی جانب ہے۔ مقبرہ چار طرف سے سنگ سرخ اور دیگر قیمتی پتھروں سے آراستہ تھا' جنہیں رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنیل ایوٹیابئل (AVITABILE) نے اتار کر لاہور میں اپنی کوٹھی میں لگا لیا۔ برطانوی حکومت کے شروع میں اس جگہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا ایک افسر رہتا تھا' مگر اب حضرت میاں میرؒ کے سجادہ نشین کے قبضہ میں ہے۔ اس کے مغرب کی طرف ایک پرانی مسجد ہے جس کی مرمت اب اردگرد کے رہنے والوں نے کی ہے۔ مشرقی جانب ایک پرانا تالاب ہے جو زمانہ بعید میں غسل و وضو کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

(بزرگان لاہور صفحہ:77)

خواجہ بہاریؒ کی وفات عہد شاہجہاں میں ہوئی۔ اکثر فرمایا کرتے مجھے جو کچھ حاصل ہوا۔ حضرت میاں میر صاحبؒ سے حاصل ہوا۔

حضرت سید جان محمد حضوری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1064ھ / 1654ء)

اسم گرامی جان محمد، اور حضوری لقب تھا۔ ان کے والد ماجد حضرت شاہ نور بن سید محمود حضوری" کے حالات آپ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ سید جان محمد حضوری کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم" بن حضرت امام جعفر صادق" اور سلسلہ طریقت حضرت غوث الاعظم شیخ سید عبدالقادر جیلانی" تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد امجد کوہستان غور سے برصغیر میں تشریف لائے۔ حضرت سید جان محمد حضوری" نے ظاہری و باطنی تعلیم اپنے والد بزرگ سے حاصل کی، اور ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ پر رونق افروز ہوئے۔ آپ کی تمام عمر درس و تدریس اور ہدایت خلق خدا میں گزری۔ بے شمار انسانوں نے آپ سے ظاہری و باطنی فیضان حاصل کیا۔ جو شخص بھی آپ کا مرید ہوتا، اسے اس رات خواب میں آنحضور پُرنور شافع یوم نشور ﷺ کی زیارت ہوتی۔

حضرت کا وصال 1064ھ مطابق 1654ء میں ہوا۔ بعض اقوال کے مطابق 1065ھ میں فوت ہوئے۔ برصغیر پر اس وقت شہنشاہ شہاب الدین شاہجہان کی حکومت تھی اور شیخ عبدالکریم لاہور کا گورنر تھا۔ آپ کا روضہ مبارک گڑھی شاہو لاہور میں حضرت سید محمود حضوری" کے مزار شریف کے قریب ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کا سال وفات اس طرح منظوم کیا ہے۔

جان ہر دو جہان، محمد جان
کرد چوں از جہان مخلد ظہور

"فیض دیں سالک" است تاریخش
1065ھ
باز جو وصلش از "محبت حضور"
1064ھ

سید محمد لطیف نے "تاریخ لاہور" میں آپ کا سال وصال 1120ھ اس کتبہ سے نقل کیا ہے جو حضرت سید جان حضوریؒ کی مشرقی دیوار پر مرقوم ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی تاریخ اور مزار شریف پر لکھی ہوئی تاریخ میں 56 برس کا فرق ہے۔ "تاریخ لاہور" کے مطابق آپ کا وصال بہادر شاہ ظفر بن اورنگ زیب کی تخت نشینی کے تیسرے سال میں ہوا۔

حضرت سید سرور دین حضوریؒ

آپ نے اپنے والد ماجد سے سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کی اور خلافت حاصل کی۔ ظاہری علوم بھی انہی سے حاصل کئے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد ان کے سجادہ پر بیٹھے۔ آپ کے بزرگوں کی طرح آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ کمال بخشا تھا کہ جو شخص آپ سے بیعت کرتا' اسے خواب میں زیارت مصطفیٰ (علیٰ تحیتہ و الثناء) نصیب ہوتی۔ اس کرامت کی بدولت آپ بھی عوام و خواص میں حضوری کے لقب سے معروف ہوئے۔

آپ کی وفات 1100ھ بمطابق 1689ء میں بعہد اورنگ زیب عالمگیرؒ ہوئی۔ مزار مبارک حضرت سید جان محمد حضوریؒ کے پہلو میں ہے۔

حضرت ملا شاہ بدخشانی رحمتہ اللہ علیہ
(المتوفی 1071ھ/ 1661ء)

گیارھویں صدی ہجری کے ربع اول میں اللہ کا ایک بندہ بدخشاں سے کشمیر اس غرض سے آیا کہ کوئی مرشد کامل ایسا ملے' جو اسے اللہ کی راہ دکھائے۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ ایسے خداشناس ایک بزرگ تو لاہور میں موجود ہیں۔ اس معلومات کے مطابق یہ بندۂ خدا کشمیر سے لاہور پہنچا اور کئی روز خوب اطمینان کر لینے کے بعد ان بزرگ سے درخواست کی وہ انہیں اپنا مرید بنالیں۔ لیکن بزرگ نے فرمایا' تم اپنا اطمینان کر چکے' لیکن میرا اطمینان بھی ضروری ہے' بہتر ہے تم کچھ عرصہ عبادت و ریاضت میں گزارو' جب میرا اطمینان ہو جائے گا' میں تمہیں مرید کرلوں گا۔

اس طرح تین سال گزر گئے' ایک روز بزرگ نے فرمایا: اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں علم باطنی سکھاؤں اور اللہ تک پہنچاؤں۔ تم اپنے کپڑے اچھی طرح دھو کر اور نہا کر میرے پاس آؤ۔ وہ طالب حق اٹھے اور دریا پر جا کر اپنے کپڑے دھونے لگے۔ اتنے میں دریا سے ایک شخص برآمد ہوا اور کہا: لاؤ' تمہارے کپڑے میں دھوتا ہوں۔ انہوں نے توجہ نہ دی اور اپنے کپڑے دھونے میں مشغول رہے اور پھر نہا دھو کر بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ یا حضرت! میں حاضر ہوں' مجھے مرید کر لیجئے۔ بزرگ نے فرمایا: دریا پر حضرت خضرؑ تم سے کپڑے دھونے کے لیے مانگتے تھے' تم نے کیوں نہ دیئے۔ کہا: یا حضرت! میں اس لائق کہاں کہ حضرت خضرؑ میرے کپڑے دھوئیں۔ ہاں' اللہ چاہے تو آپ کی توجہ سے میں اس لائق ہو سکتا ہوں۔ بزرگ اس جواب سے خوش ہوئے اور اپنی خاص توجہ سے انہیں نوازا اور مس خام کو کندن بنا دیا۔

مرید ہونے والے یہ بزرگ حضرت ملا شاہ بدخشانی تھے' اور مرید کرنے والے یہ مرشد کامل تھے حضرت میاں میر لاہوری رحمتہ اللہ علیہ۔

ملا بدخشانی کا اصل نام شاہ محمد تھا۔ والد ملا احدی موضع ارکسا (علاقہ روستاق ولایت بدخشاں) کے قاضی تھے۔ اپنے علاقہ کے بارے میں ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

ملک من از ملک ہا ملک بدخشاں آمدہ

از بلاد و از روستاق اخترے از ارکسا

آپ کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی تاہم قیاس{1} ہے کہ آپ 997ھ یا 998ھ میں پیدا ہوئے۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد تلاش مرشد میں وطن سے نکلے اور کشمیر آئے۔ تین سال یہاں مقیم رہے۔ آپ کے تذکرے میں ہے کہ قیام کشمیر کے دوران آپ اکثر قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک روز تصوف کے رنگ میں تفسیر شروع کی تو خود آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہی دنوں حضرت میاں میرؒ کی تعریف سن کر لاہور پہنچے اور ان کی خدمت اقدس میں رہ کر اپنی مراد تک پہنچے۔

ملا بدخشی (آپ بدخشی اور بدخشانی دونوں ناموں سے معروف ہیں) تقریباً تیس سال تک حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں رہے اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ عبادت الٰہی میں بسر کیا۔ بہت کم سوتے تھے' زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ گھنٹوں حبس دم کی مشق کرتے۔

شہزادہ دارا شکوہ آپ کا مرید تھا۔ اس کی بڑی بہن جہاں آرا بیگم بھی آپ کے عقید تمندوں میں شامل تھی۔ سکینۃ الاولیاء میں جہاں آرا بیگم کے نام آپ کے کئی خطوط موجود ہیں۔ جہاں آرا بیگم نے عقیدت مندی کی بنا پر آپ کی ریاضت و عبادت کے لیے مسجد و حجرہ اور حمام تعمیر کرائے۔ نیز آپ کے مریدوں اور ملاقاتیوں کے لیے چند عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔

"تاثر لاہور" کے مؤلف منشی محمد دین فوق لکھتے ہیں: شاہجہاں جب کشمیر میں تھا تو عمارات کی تکمیل کے بعد 12 جمادی الثانی 1061ھ مطابق 1650ء کو ملا بدخشانی کی زیارت کے لیے لاہور میں آیا۔ ملا بدخشانی جب بادشاہ کے آنے کی خبر سنتے تو عصا ہاتھ میں لے کر ٹہلنے میں مشغول ہو جاتے' تاکہ بادشاہ کی آمد پر انہیں تعظیم کے لیے اٹھنا نہ

{1} اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں آپ کی عمر 57 برس لکھی ہے جبکہ یہ کتاب اس نے 1052ھ سے 1056ھ کے درمیان لکھی۔

پڑے۔ یہی عمل بادشاہ کی روانگی کے وقت کرتے۔ جب معلوم ہوتا کہ بادشاہ جانے کی تیاری کر رہا ہے' تو پہلے ہی اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیتے۔

آپ اپنے حجرے میں چراغ روشن نہ کرتے تھے۔ ایک رات معلوم ہوا کہ شہزادہ دارا شکوہ ملنے کے لیے آ رہا ہے۔ آپ نے خاص طور پر مٹی کا چراغ منگوا کر روشن کرایا۔ جب دارا شکوہ حاضر ہوا تو آپ نے خوش ہو کر یہ شعر پڑھا۔

تو چراغ است دریں خانہ ویرانہ ما
روشن از آتش عشق تو شدہ خانہ ما

شہزادہ کی آمد چونکہ لوجہ اللہ ہوتی تھی' اس لیے ملا بدخشانی ان سے ہمیشہ محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ صاحب "مآثر لاہور" لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ جب پہلی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' تو آپ نے اس کا ہاتھ بطور مصافحہ پکڑ کر فرمایا: "اے عزیز! میں تجھے دل و جان سے پیار کرتا ہوں' انشاء اللہ آخرت میں بھی تیری امداد کروں گا۔"

ملا بدخشانیؒ شریعت کے سخت پابند تھے اور اسی کی تلقین کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان سے کسی نے کرامت کے بارے میں دریافت کیا۔ تو فرمایا: امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کے اولیاء کو لازم ہے کہ توحید ربانی پھیلانے' حقیقی ایمان کی کیفیت بیان کرنے اور مردہ دلوں کو زندگی بخشنے کے کاموں میں لگے رہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی اشاعت حقیقی ایمان کی کیفیت بیان کرنے اور یاد خدا سے غافل لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے سے بڑی کوئی کرامت نہیں۔ یہی کشف ہے اور یہی ولایت ہے۔

بدخشانیؒ بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ شاعری میں وہ شاہ تخلص کرتے تھے۔ منشی محمد دین فوق نے مآثر لاہور میں آپ کے رسائل کی فہرست درج کی ہے۔ یہ رسائل دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد میں یہ رسائل شامل ہیں:

(1) تفسیر قرآن (جس میں سورۂ فاتحہ' سورۂ بقرہ' سورۂ آل عمران اور سورۂ یوسف کی تفسیر ہے)۔

(2) رسالہ بسم اللہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بحر میں لکھی ہوئی مثنوی) جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
خال و خط و زلف و قد مستقیم

(3) رسالہ حمد و نعت و منقبت (4) قصہ یوسف زلیخا (5) رسالہ دیوانہ (6) رسالہ مرشد (7) رسالہ ولولہ (8) رسالہ ہوش (9) رسالہ در تعریفات خانہا و باغات ، منازل کشمیر (10) رسالہ نسبت۔

دوسری جلد میں مندرجہ ذیل رسائل ہیں:

(11) رسالہ شاہیہ (12) دیوان اول (13) دیوان دوم (14) شرح رباعیات (15) رقعات (16) قصائد عربی۔

ان رسائل کے تمام قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور بانکی پور لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ علامہ اقبال ؒ نے ایسے ہی قلمی نوادر یورپ میں دیکھ کر کہا تھا۔

وہ موتی علم کے یعنی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

سکینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ نے آپ کے اکثر اشعار' رباعیات و قطعات اور غزلیں درج کی ہیں جن میں سے چند تبرکاً درج کی جاتی ہیں۔

رشتہ تسبیح با رشتہ زنار شد
رہ سوئے میخانہ دارد مرشدِ دانائے ما
قید غلامی نماند از نگہِ خاص او
قاضی و مفتی نگر رحمت مولائے ما

از شش جہتم روئے نمودی آخر
از ہر طرفے' دلم ربودی آخر
بیرون و درون جلوہ گری می دیدم
بر تحقیق آمدم تو بودی آخر

دورہ عشق آنکہ مارا کشت
غیر ما کس نبود قاتل ما
از میان چیست پردۂ حائل
شاہ خود بندہ بود حائل ما

عزم سفر مغرب و رو با مشرق
اے راہ رو پشت بمنزل ہشدار

کار باید کرد گو فرزند پیغمبر بود
گو حسب نمبود، نباشد سود ازیں احتساب
ایں ریاضات سلوک از بہر توحید است و بس
چوں بمنزل شد برابر گشت بیداری و خواب
دست عارف خون ایدیہم یداللہ آمدہ
از ترانی خوش مشو، ز لن ترانی رومتاب

"فرحت الناظرین" میں محمد اسلم انصاری پسروری نے آپ کا یہ شعر بھی لکھا ہے:

آں ابروئے کجش را تیغ خمیدہ گفتم
زاں تیغ اشارتے کرد "بالائے دیدہ" گفتم

ملا شاہ بدخشانی" حضرت میاں میر رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم تھے۔ تمام عمر اپنے مرشد کی طرح تجرد میں گزاری۔ ان کا وصال 1071ھ مطابق 1661ء میں ہوا۔{1} بدخشانی کا مزار حضرت میاں میر" کے مزار کی طرز پر تعمیر ہوا تھا' لیکن رنجیت سنگھ اس کا پتھر اکھاڑ کر امرتسر لے گیا۔ محکمہ آثار قدیمہ کی غفلت سے اب صرف اس کی ایک برجی اور صدر دروازہ باقی رہ گئے ہیں۔ ازدگرد لوگوں نے اپنے مکانات تعمیر کر لیے ہیں۔ سکینتہ الاولیاء میں دارا شکوہ نے آپ کے حسب ذیل خلفاء کا ذکر کیا ہے:

(1) ملا محمد سعید (2) ملا مسکین (3) ملا محمد امین کشمیری (4) ملا عبدالنبی (5) حاجی عبداللہ۔

{1} "بزرگان لاہور" میں نامی نے آپ کی تاریخ وفات 1069ھ مطابق 1659ء تحریر کی ہے۔ عہد عالمگیری کے معروف مورخ محمد اسلم ایم محمد حفیظ انصاری پسروری نے "فرحت الناظرین" میں لکھا ہے کہ آپ کی قبر کی لوح پر تاریخ کندہ ہے: "واد ملا شاہ در توحید جاں" 1072ھ

حضرت سید ابو تراب
المعروف حضرت شاہ گدا لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1071ھ/1660ء)

نام نامی سید ابو تراب بن سید نجیب الدین' حسینی سید ہیں۔ شیراز میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی طلب حق کے لیے گجرات (کاٹھیا واڑ' موجودہ بھارت) پہنچے جہاں حضرت شیخ وجیہہ الدین گجراتی قادری شطاری کے مرید ہوئے۔ انہی کی تربیت میں رہ کر خلافت سے سرفراز ہوئے۔ مرشد کی وفات کے بعد بعہد شہنشاہ ہمایوں لاہور تشریف لائے اور پھر تمام عمر یہیں رہے۔

آپ کے تذکرہ نگاروں نے آپ کے شجرۂ نسب و طریقت اس طرح تحریر کئے ہیں:

شجرۂ نسب

سید ابو تراب بن سید نجیب الدین بن سید شمس الدین بن اسد الدین بن زین الدین بن یونس بن عبدالوہاب بن عبدالہادی بن ابوالبرکات بن انور علی بن عبداللطیف بن محمد شریف بن ابوالمظفر بن عبدالباقی بن ابوالحسن بن عبدالعزیز شیرازی بن سید عبداللہ بن محمد امین بن قدرت اللہ بن سید موسیٰ بن مسعود بن صادق بن احمد بن سید باقر بن حسن بن زید بن جعفر بن محمود بن ہارون بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق (علیہم الرحمتہ)

شجرۂ قادری

سید ابوتراب۔ شیخ وجیہہ الدینؒ گجراتی۔ سید محمد غوث گوالیاری۔ شیخ لیفور حاجی۔ شیخ ابوالفتح الخاطب شیخ ہدایت اللہ سرمست۔ شیخ عبدالوہاب۔ شیخ عبدالرؤف۔ شیخ محمود۔ شیخ عبدالغفار۔ شیخ محمد۔ شیخ عبدالرحیم۔ سید ابوبکر تاج الدین۔ حضرت غوث الاعظم شیخ سید محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز۔

شجرۂ شطاریہ

سید ابوتراب۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتی۔ سید محمد غوث گوالیاری۔ شاہ حمید۔ شاہ قاذن۔ شیخ عبداللہ شطاری (رحمتہ اللہ علیہم)

حضرت اکثر بہ وضع مجذوبانہ رہتے تھے اور عموماً یہ شعر بحالت جذب و سرمستی پڑھتے تھے۔

خود بود خدا بود علی بود گدا بود
در حضرت معبود علی بود گدا بود

خلفاء

(1) قاضی محمد لاہوری۔ مزار آپ کے مرقد منور کے پاس ہے۔
(2) شیخ محمد فاضل۔ مزار دہلی میں ہے۔
(3) شاہ جمال۔ رہتاس میں مدفون ہیں۔
(4) لعل گدا۔ آپ کا مزار بھی مرشد کے مرقد انور کے قریب ہے۔
(5) احمد گدا۔ آپ بھی مرشد کے روضہ انور کے قریب دفن ہوئے۔
(6) شہباز گدا۔ آپ بھی مرشد کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

آپ نے ایک سو چودہ سال عمر پائی۔ 1071ھ مطابق 1660ء میں وصال فرمایا۔ اس وقت ہندوستان پر اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی اور نواب خلیل اللہ خاں لاہور کا صوبیدار تھا۔

مزار مبارک گڑھی شاہو لاہور میں ریلوے پل کے نزدیک ہی زیارت گاہ خلائق

ہے۔ مزار اقدس پر یہ کتبہ درج ہے۔

شاہ گدا سید ولی متقی
بندۂ حق خاک پائے بو تراب
گفت تاریخ وصال او خرد
شہ ولی سید گدائے بو تراب
1071ھ

حضرت شاہ کمال سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1080ھ/ 1669ء)

والد ماجد کا اسم گرامی عبداللہ تھا۔ سادات حسینی سے تعلق رکھتے تھے۔ سہروردی سلسلہ میں لکرا بیگ کے مرید تھے۔ شجرۂ طریقت اس طرح ہے:

(1) لکرا بیگ (2) شاہ شرف (3) شاہ معروف (4) شیخ جعفرالدین (5) شیخ فہیم الدین (6) حضرت جمال خنداں (7) حضرت صدر الدین عارف (8) حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی (رحمہم اللہ)۔

آپ کا شمار لاہور کے اکابر علماء میں ہوتا تھا۔ تمام عمر درس و تدریس میں گزری۔ آپ کے شاگردوں میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور نواب سعد اللہ خاں (وزیر اعظم شاہجہاں) بہت معروف ہیں۔

"مدینۃ الاولیاء" کے مؤلف نے حضرت شاہ کمالؒ کے ان تینوں فاضل شاگردوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ اور علامہ سعد اللہ خاں اوائل عمر میں لاہور میں برائے تحصیل علوم آئے تھے۔

آپ کی وفات 1080ھ مطابق 1669ء لاہور میں بعہد شاہجہاں ہوئی۔ مزار مبارک قصبہ راواں میں (جو اب رحمان پورہ کے نام سے مشہور ہے) مرجع خلائق ہے۔ "تاریخ لاہور" میں ہے کہ آپ کا مقبرہ ہشت پہلو چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ راواں لاہور کی قدیم ترین آبادی ہے، جس کو راجہ رام چندر کے لڑکے اچھو (جس نے اچھرہ بسایا تھا) کے سالے (برادر نسبتی) راوٗ نے اپنے نام پر آباد کیا تھا، لیکن اب صرف یہاں مزار اقدس ہی ہے۔ مقبرہ کا نشان تک نہیں ہے۔

حضرت شیخ جان محمد ثانی سہروردی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1080ھ / 1669ء)

حضرت میاں محمد اسماعیل عرف میاں وڈا ؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ عالم و فاضل اور جامع کمالات ظاہر و باطن تھے۔ آبادی شہر سے باہر مسجد قصاب خانہ میں درس دیتے تھے۔ ہزارہا لوگ آپ کے اس چشمہ فیض سے مستفید ہوئے۔

انتہائی غیور تھے۔ غربت کے باوجود کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرتے، نہ کبھی کسی سے درس و تدریس کی اجرت لیتے۔ پڑھانے سے فارغ ہو کر قوت لایموت کے لیے چکی پیستے۔ ایک روز حضرت میاں وڈا ؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ انہوں نے پوچھا: جان محمد! گزارہ کی کیا صورت ہے؟ عرض کی: پیرو مرشد! اللہ کا شکر ہے، خوب گزر ہوتی ہے۔ فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم چکی پیس کر گزر بسر کرتے ہو۔ درس و تدریس کے ساتھ اس قدر محنت شاقہ سے کہیں تمہاری صحت خراب نہ ہو جائے؟ پھر کمال شفقت و محبت سے فراخی رزق کے لیے ایک تعویذ عطا فرمایا۔ اس کی برکت سے چند ہی روز میں دنیا کی نعمتوں سے مستغنی ہو گئے۔ پھر مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تعویذ واپس کر دیا اور عرض کی: پیر و مرشد! مجھے دولت دنیا کی ضرورت نہیں۔ میں دولت عقبیٰ چاہتا ہوں۔ حضرت میاں وڈا ؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اپنے سلسلہ عالیہ سہروردیہ کی خلافت و اجازت سے سرفراز فرمایا۔

خزینۃ الاصفیاء میں یہ واقعہ یوں ہے کہ شیخ جان محمد جب حضرت میاں وڈا ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: حق تعالیٰ نے مجھے معلوم کروا دیا ہے کہ تم رزق حلال کے لیے چکی چلاتے ہو اور سخت محنت کرتے ہو۔ پھر از راہ عنایت مرشدانہ ایک تعویذ عطا فرمایا اور کہا یہ تعویذ اپنے گھر میں رکھ لو۔ جب دنیا کی نعمتوں سے سیر ہو جاؤ

تو یہ تعویذ مجھے واپس دے دینا۔ آپ نے تعمیل ارشاد کی اور تعویذ گھر لے گئے۔ اس قدر فتوحات ہوئیں کہ تین ہی دنوں میں مستغنی ہو گئے۔ اللہ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تعویذ واپس اپنے مرشد کی خدمت میں لائے اور عرض کی: اب دنیا کی نعمتوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں' تاہم اگر اس تعویذ کو لکھنے کی اجازت دیں' تو عنایت ہو گی۔ حضرت میاں وڈا نے یہ تعویذ لکھنے کی اجازت دے دی۔ شیخ احمد دین حالیہ سجادہ نشین مزار حضرت میاں وڈا" کی اجازت سے یہ تعویذ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.....ےے ھصصد

پیر غلام دستگیر نامی نے "بزرگان لاہور" میں یہ تعویذ اس طرح درج کیا ہے:

۸	۴
عـه	۲

ء

.....ےے ھصعد

نور احمد خاں فریدی نے اپنی تالیف "شاہ رکن عالم ملتانی" میں یہ تعویذ اس طرح درج کیا ہے۔ (صفحہ 612)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

..ےےھصعد

۸	۶
عـه	۲

صلى

جب 1060ھ میں مسجد قصاب خانہ تعمیر ہوئی' تو لوگوں کی درخواست پر حضرت میاں وڈا" نے آپ کو وہاں درس و امامت کے لیے بھیجا۔ جہاں آپ فرائض امامت کے ساتھ درس قرآن بھی دیتے تھے اور فارغ ہو کر گزر بسر کے لیے چکی چلاتے تھے۔

ایک روز ایک مفلوک الحال شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی: میں بہت تنگی سے زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔ کچھ پڑھنے کے لیے بتائیں' تاکہ میرے حالات

اچھے ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: ہر روز نماز فجر کے بعد قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھو اور ایک سو بار "سبحان اللہ" پڑھو۔ ایک ہفتہ بعد آ کر مجھے اپنا حال بتاؤ۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھ پر اس قدر فتوحات کے دروازے کھلے ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ آپ نے فرمایا: یہ وظیفہ مزید ایک ہفتہ جاری رکھو۔ سات دن بعد وہ پھر حاضر ہوا اور عرض کی: اب تو زمین کے تمام خزانے جہاں وہ دفن ہیں' میرے لیے ظاہر ہو چکے ہیں' لیکن میری طبیعت ان کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے وسیلہ جلیلہ سے اخروی دولت سے بہرہ مند ہوں۔ پھر وہ حضرت کے حلقہ ارادت میں داخل ہو کر اپنے مقصود کو پہنچا۔

آپ کا وصال 1080ھ مطابق 1669ء میں ہوا۔ اس وقت برصغیر میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کی حکومت تھی۔ ریلوے گاف گراؤنڈ کے قریب مسجد قصاب خانہ قدیم کے متصل آپ کا مزار ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کی تاریخ وفات لکھی ہے:

شد ازیں دنیا چو در خلد بریں
پیر دیں' جان محمدؒ جان جاں
شیخ دین حق بگو تاریخ او
نیز قرأ از زباں عرش آستاں
باز حق' جان محمدؒ قطب وقت
خواں: وصال آں شمع کون و مکاں

حضرت سید عبدالرزاق رحمتہ اللہ علیہ
المعروف حضرت شاہ چراغ لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1084ھ/ 1658ء)

اسم گرامی سید عبدالرزاق اور والد ماجد کا نام نامی سید عبدالوہاب گیلانی تھا۔ "تذکرۂ صوفیائے پنجاب" میں شجرۂ نسب اس طرح مرقوم ہے: سید عبدالرزاق بن سید عبدالوہاب بن سید عبدالقادر ثالث بن محمد غوثِ بالا پیر زین العابدین بن سید عبدالقادر ثانی بن سید محمد غوث اچی گیلانی (رحمتہ اللہ علیہم)

حضرت پیدا ہوئے تو آپ کے جدِ امجد حضرت سید عبدالقادر ثالث کو اطلاع کی گئی وہ اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمارے گھر میں ایک چراغ بھیجا ہے۔ انشاء اللہ یہ پورے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ اسی روز سے آپ کا لقب چراغ شاہ مشہور ہو گیا۔ آپ کے کسی تذکرہ نگار نے آپ کا سنہ پیدائش تحریر نہیں کیا۔ تاہم قیاس ہے کہ آپ دسویں صدی ہجری کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے یعنی 990ھ یا 1000ھ کے درمیان۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے اپنے والد بزرگوار حضرت سید عبدالوہاب کے دست حق پرست پر بیعت کی' جو اپنے وقت کے عظیم المرتبت شیوخ میں سے تھے۔ مرشد کے زیر سایہ آپ ایک عرصہ تک ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہے اور پھر ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

آپ کو سیاحت کا بے حد شوق تھا' چنانچہ ایک عرصہ تک بلاد اسلامیہ کی سیاحت کرتے رہے' اسی سیاحت کے دوران آپ زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے

اور بے شمار شیوخ کرام سے روحانی فیوض و برکات حاصل کیں۔

"اولیائے لاہور" اور دیگر تذکروں میں ہے کہ شاہجہاں بادشاہ آپ کا نہایت درجہ عقیدت مند تھا۔ اکثر آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضری دیتا۔ اس کی خواہش تھی کہ حضرت کے کسی فرزند ارجمند سے اپنی بیٹی کی شادی کرے' لیکن حضرت نے پسند نہ فرمایا۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے آپ کے محامد و مناقب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت شاہ چراغ" علوم ظاہری و باطنی' شرافت و نجابت' سیادت و شجاعت و سخاوت کے جامع اور درجہ کمال پر فائز تھے۔

حضرت نے 22 ذی قعدہ 1068ھ مطابق 12 اگست 1658ء میں وصال فرمایا۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء کے مطابق آپ کا مزار مبارک شاہ جہاں نے تعمیر کرایا' لیکن تحقیقات چشتی کے مطابق آپ کا روضہ اقدس اورنگ زیب عالمگیر نے تعمیر کرایا۔ منشی محمد دین فوق نے اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ روضہ عالیہ شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے تعمیر ہوا ہے۔ اس لیے کہ 1068ھ میں شاہجہاں آگرہ کے قلعہ میں نظر بند تھا اور موت ہی نے نظربندی سے اس کو رہائی دلائی تھی۔ (مآثر لاہور بحوالہ نقوش لاہور نمبر ص 306)

مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کا قطعہ تاریخ وصال تحریر کیا۔

جلوہ گر شد درجہاں مثلِ چراغ

چوں چراغِ آں آفتابِ عارفاں

حضرت والاشان کے سات صاحبزادے تھے۔ جو سب کے سب علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔ وصال کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے سید مصطفیٰ گیلانی" نے مسند رشد و ہدایت کو زینت بخشی۔ جن کا وصال 13 شعبان 1084ھ مطابق 10 جنوری 1674ء کو ہوا۔

حضرت سید شاہ چراغ" کے مزار مبارک سے ملحقہ مسجد 1716ء میں نواب زکریا خاں نے اپنی والدہ بیگم جان کی وصیت کے مطابق اس کے زیورات بیچ کر تعمیر کرائی۔ سکھوں کے دور میں اس مسجد میں بارود وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ منشی محمد دین فوق لکھتے ہیں کہ "سکھوں کے زمانے میں مقبرہ شاہ چراغ اور اس کی متصلہ قدیم عالی شان مسجد میگزین کا کام دیتی تھی۔ انگریزوں کی عملداری آئی تو (1849ء میں) مقبرہ اور مسجد میں چھوٹی سی

دیوار بندی ہو گئی۔ مقبرہ کو تو مقبرہ رہنے دیا گیا لیکن مسجد کو ایک کوٹھی کی شکل میں تبدیل کر کے ڈپٹی کمشنروں کی اقامت گاہ بنا دیا گیا؛ ڈپٹی کمشنروں کے بعد یہ جگہ دفاتر میں تبدیل ہو گئی اور سیشن جج کی عدالت یہاں لگنے لگی۔ آج سے چند سال پیشتر یہ جگہ بالکل اجاڑ اور غیر آباد سی تھی۔ احاطے میں جھاڑیاں اور درخت اگے ہوئے تھے۔ چاردیواری خستہ حال تھی' لیکن 1935ء میں مسجد شہید کے ایجی ٹیشن کے بعد جب مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو مل گئی اور سرکار نے اپنا قبضہ اس پر سے اٹھالیا تو اس اجاڑ جگہ ریزرو بینک کی عالی شان عمارت تعمیر ہو گئی اور اس چاردیواری کو جس میں والدہ نواب خان بہادر کی قبر بیان کی جاتی ہے۔ از سر نو تعمیر کر کے اس کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا۔"

(مآثر لاہور محررہ 1944ء)

سکھوں اور انگریزوں کے عہد میں لاہور میں اولیاء اللہ کے مزارات کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ سکھ ان مزارات کے تمام قیمتی پتھر اکھاڑ کر لے گئے اور انگریزوں نے تاریخی مزارات و مقابر کو دفاتر بنا کر ان کی بے حرمتی کی۔

حضرت میاں محمد اسماعیل رحمتہ اللہ علیہ
(المعروف میاں وڈا)

(المتوفی 1085ھ)

شہنشاہ اکبر کا دور حکومت ہے' موضع چنہہ میں (جو دریائے چناب کے کنارے واقع ہے) ایک مسجد میں مولوی صاحب بچوں سے قرآن مجید کا سبق سن رہے ہیں' اتنے میں ایک بچہ قرآن پاک اٹھائے آتا ہے اور مولوی صاحب کو سبق سنانے لگتا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک لفظ پر بچے کو ٹوکا کہ اسے "زیر" کے ساتھ پڑھو۔ بچے نے پھر "زبر" کے ساتھ پڑھا۔ استاد نے دو چار بار ٹوکا تو لڑکے نے ادب سے عرض کی: مولوی صاحب! مجھ سے یہ لفظ "زیر" کے ساتھ ادا نہیں ہوتا۔

رات کو مولوی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ کہتے ہیں کہ بچے کو وہ لفظ "زیر" کے ساتھ پڑھنے کے لیے کیوں کہتے ہو' وہ صحیح پڑھتا ہے۔

صبح اٹھ کر مولوی صاحب نے تحقیق کی' تو معلوم ہوا' بچہ صحیح پڑھتا تھا۔ مولوی صاحب نے بچے کے والد ماجد کو بلوایا اور کہا: تمہارا بیٹا مادر زاد ولی ہے۔ اس کی تربیت کسی استاد کامل کے ہاتھوں ہونی چاہیے۔ بہتر ہے اسے مخدوم حافظ عبدالکریم سہروردی (ساکن موضع لنگر) کی خدمت میں لے جاؤ۔ یہ سن کر باپ اپنے ولی بیٹے کو مخدوم صاحب کے ہاں چھوڑ آیا اور انہیں وہ تمام واقعہ بھی سنایا' جو مولوی صاحب نے سنایا تھا۔

مادر زاد ولی اس بچے کا نام نامی حضرت محمد اسماعیلؒ تھا جو بعد میں حضرت میاں وڈاؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت میاں وڈا بعہد اکبری 995ھ (مطابق 1587ء) کو موضع چنہہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد جناب فتح اللہ بن عبداللہ کا تعلق کھوکھر زمیندار گھرانے سے تھا' جو نہایت نیک اور پارسا انسان تھے۔ والد ماجد کی طرح آپ کی والدہ بھی نہایت پاکباز خاتون تھیں۔ اکثر دن کو روزہ رکھتیں اور رات عبادت میں مشغول رہتیں۔ ایک رات وہ تہجد کے وقت سورۂ یٰسین پڑھ رہی تھیں کہ دیکھا کہ افق آسمان سے ایک نور ہویدا ہوا' جس

نے ساری دنیا کو روشن کر دیا۔ آپ فوراً سجدہ میں گر گئیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی: یا اللہ! میرے بطن سے جتنے فرزند پیدا ہوں ان سب کو حافظ قرآن بنانا۔ یہ دعا قبول ہوئی اور آپ کے چاروں بیٹے (محمد اسماعیل' محمد خلیل' محمد ابراہیم اور محمد حسین) حفظ قرآن کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔

آپ موضع لنگر میں حضرت مخدوم صاحب کی خدمت میں حفظ قرآن کی غرض سے آئے تو انہوں نے حفظ قرآن پاک کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی سونپی کہ مسجد اور گھر کے استعمال کے لیے پانی بھی لایا کریں۔ آپ نے ایک سال تک بڑی محبت اور محنت سے یہ ذمہ داری نبھائی۔ پھر آپ کو اس ذمہ داری سے فارغ کر کے نئی ڈیوٹی سونپی گئی' وہ یہ کہ آپ لنگر کے لیے آٹا پیسا کریں۔ چنانچہ دو وقت لنگر کے لیے جس قدر آٹا درکار ہوتا' آپ پیس کر لنگر میں پہنچا دیتے۔

اتفاق سے ایک روز مطبخ میں آٹا پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ مخدوم صاحب نے ایک درویش کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ درویش نے آ کر آپ کے حجرے میں جھانکا تو دیکھا کہ چکی از خود چل رہی ہے اور میاں صاحبؒ دنیا و مافیہا سے بے نیاز مراقبہ میں مشغول ہیں۔ درویش نے مخدوم صاحب کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا' تو وہ بنفس نفیس تشریف لائے اور جو کچھ درویش نے کہا تھا' اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بہت مسرور ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی: یا اللہ! محمد اسماعیل نے لنگر کی بہت خدمت کی ہے' اپنے فضل و کرم سے اسے کامل و مکمل فرما اور اس کا فیض جاری فرما' لوگ قیامت تک اس سے فیض یاب ہوں۔

مخدوم صاحب دعا سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ محمد اسماعیل آٹا سر پر اٹھائے حاضر ہوئے۔ مخدوم صاحب نے آٹا مطبخ میں بھجوایا اور اپنے شاگرد کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا: آج سے تمہارا نام "میاں وڈا" ہے۔ پھر فرمایا: آج سے تمہاری مشقت صرف اتنی ہے کہ تم ہمارے مویشیوں کا دودھ دوھ لایا کرو۔

اسی حفظ قرآن کے زمانے کا ذکر ہے۔ ایک رات آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ مخدوم صاحب نے فرمایا: محمد اسماعیل! آج نمازیوں کے لیے ڈھیلے کون لائے گا؟

عرض کی: حضرت' میں حاضر ہوں۔

مخدوم صاحب نے فرمایا: بارش ہونے والی ہے' دیکھنا' ڈھیلے تر نہ ہوں۔
تابع فرمان شاگرد نے ٹوکرا اٹھایا اور ڈھیلوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ڈھیلے تلاش کرنے کے بعد لوٹے تو دیکھا' مخدوم صاحب حجرہ کا دروازہ بند کر کے آرام فرما رہے ہیں۔ آپ نے ان کے آرام میں مخل ہونے کو سوئے ادب جانا اور ٹوکرا ایک محفوظ جگہ پر رکھ کر خود دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے کہ جب استاد پکاریں گے' میں ڈھیلے پیش کر دوں گا۔ تہجد کے وقت جب مخدوم صاحب نے دروازہ کھولا تو دیکھا' شاگرد پانی میں شرابور کھڑا ہے۔ ادب و نیاز مندی کے اس منظر کو دیکھ کر فوراً مخدوم صاحب کے ہاتھ بارگاہ صمدیت میں اٹھ گئے۔ عرض کی: یا اللہ! اس طالب صادق کو مطلوب و مقصود تک پہنچا دے۔ پھر میاں وڈا کو حجرے میں لے گئے اور اپنے سلسلہ سہروردیہ کے تبرکات و تحائف عطا فرمائے۔

آپ حفظ قرآن کی نعمت سے تو پہلے ہی مالا مال ہو چکے تھے۔ نیز سالہا سال مرشد کامل کی خدمت میں رہ کر علوم باطنیہ میں بھی کمال حاصل کر چکے تھے۔ اگلی صبح حضرت مخدوم صاحب نے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کے لیے فارغ کر دیا اور فرمایا کہ اب جہاں چاہو' اقامت اختیار کرو اور لوگوں کو قرآن پاک کی دولت سے مالا مال کرو۔

آپ کا سلسلہ طریقت اس طرح ہے:

(1) حضرت محمد اسماعیلؒ (2) مخدوم عبدالکریم (3) مخدوم طیب (4) مخدوم برہان الدین (5) مخدوم چنن (6) شیخ میلوم (7) شیخ حسام الدین متقی (8) سید شاہ عالم (9) سید برہان الدین قطب (10) سید ناصر الدین (11) سید جلال الدین مخدوم جہانیاں (12) شیخ رکن الدین ملتانی (13) حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (رحمہم اللہ)

مرشد سے رخصت و اجازت کے بعد آپ موضع خوجیانوالی پہنچے اور دریائے چناب کے کنارے ایک شیشم کے درخت کے نیچے ڈیرے ڈالے اور درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا تو آپ شیشم کا ایک پتہ کھا کر ایک گھونٹ پانی پی لیتے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ طالبان علم یہاں جمع ہونے لگے اور آپ نے یہاں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ طالب علم جب بھوک پیاس کا ذکر کرتے تو آپ انہیں بھی اپنے ہاتھ سے شیشم کا ایک پتہ کھلاتے اور پانی پلاتے' جس سے وہ سیر ہو جاتے اور انہیں قطعاً کوئی کمزوری محسوس نہ ہوتی۔

جب آپ کی شہرت دور دور تک پھیلی، تو ہر شخص کی تمنا ہوئی کہ آپ درخت کے نیچے قیام فرمانے کے بجائے ان کے گاؤں میں آ جائیں۔ دیہات کے لوگ سواریاں لے کر حاضر ہوتے اور ادب سے درخواست کرتے کہ آپ ان کے گاؤں میں قدم رنجہ فرمائیں۔ ہم آپ کے لیے پختہ مدرسہ تعمیر کر دیں گے، مگر آپ بے نیازی کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کر دیتے۔ ایک روز موضع امان اللہ پور کا چوہدری میرداد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کچھ اس انداز سے اپنی درخواست پیش کی کہ آپ اس کے ساتھ گاؤں جانے کے لیے آمادہ ہو گئے، وہ آپ کو اپنی پشت پر سوار کر کے اپنے گاؤں لے گیا۔ آپ نے اس کا ذوق و شوق دیکھ کر اس کے لیے خصوصی دعا فرمائی۔

ایک روز آپ موضع امان اللہ پور سے باہر کہیں جا رہے تھے کہ دل میں خیال آیا کہ میرا کوئی حقیقی فرزند نہیں، کیا ہی اچھا ہو کہ میرا چچا زاد بھائی میاں محمد صالح مجھ سے فیض حاصل کرے۔ کچھ دن نہ گزرے تھے کہ میاں محمد صالح آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ کے ہاں مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی درخواست کی۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ آپ کے فیض تعلیم و تربیت سے انہوں نے چھ ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ (بعد میں یہی میاں محمد صالح اور ان کی اولاد آپ کی جانشین ہوئی۔)

جب لنگر میں قیام کو کافی عرصہ گزر گیا اور درس و تدریس کا سلسلہ خوب چل نکلا تو آپ نے وہاں اپنے شاگرد حافظ محمد فاضل کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا اور خود موضع دریانوالہ جا کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ یہاں بھی طالب علم دور و نزدیک سے جمع ہونے لگے۔ لیکن افسوس یہاں کے اوباش اور بااثر لوگوں کو یہ سلسلہ رشد و ہدایت پسند نہ آیا اور حسد کی وجہ سے آپ کے دشمن بن گئے، جب آپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو آپ لاہور آ گئے، کئی طالب علم بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ ایک ہفتہ گزر گیا، لیکن اہل لاہور نے توجہ نہ کی۔ آپ نے یہاں سے کوچ کا ارادہ فرمایا اور شاگردوں سے کہہ دیا کہ کل ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ مغل پورہ کے جس علاقہ میں آپ ٹھہرے تھے۔ وہاں مقیم ایک بزرگ حضرت میر سید محمود کو بذریعہ کشف معلوم ہوا کہ ایک فاضل اجل قطب زماں دل برداشتہ ہو کر یہاں سے رخصت ہونے والا ہے، وہ علی الصبح آپ کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ آپ ہرگز یہاں سے نہ جائیں۔ آپ نے ان کی درخواست کو شرف قبول بخشا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک 45 سال

تھی۔ آپ نے یہاں مسجد بھی تعمیر کروائی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے مدرسہ کے اخراجات کے لیے سات چاہ معہ اراضی مزروعہ آپ کی خدمت میں پیش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں طلباء کا ہجوم ہونے لگا اور آپ کے مدرسہ کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی۔ آپکے فیضؒ برکت کی بدولت طلباء چند ماہ میں قرآن پاک حفظ کر لیتے تھے۔

لاہور میں عمر کی آخری سانس تک آپ علم و عرفان اور تعلیم قرآن کے موتی لنڈھاتے رہے۔ 25 شوال المکرم 1085ھ کو نوے سال کی عمر میں (بعہد عالمگیر) آپ نے وصال فرمایا۔ مغل پورہ کے علاقہ درس میاں وڈا میں آپ کا سلسلہ درس وہدایت آج بھی جاری ہے۔

آپ کے خلفاء میں مندرجہ ذیل بزرگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(1) شیخ محمد صالح (2) شیخ عبدالحمید (3) شیخ تیمور (4) شیخ محمد ہاشم (5) شیخ عبدالکریم قصوری (6) اخوند محمد عثمان (7) اخوند محمد عمر (8) امانت خاں (9) حافظ عبداللہ ساکن کیوال (10) حافظ محمد فاضل (11) حافظ اللہ بخش (12) حافظ محمد حسین آوان (13) حافظ فتح محمد خوشابی (14) شیخ جان محمد لاہوری (15) شیخ جان محمد ثانی لاہوری۔

حضرت شاہ رضا قادری شطاری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1102ھ/ 1706ء)

علم و فضل میں آپ کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ تفسیر حدیث و فقہ میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ دور دور سے طالبان علم و ہدایت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے۔ زہد و عبادت اور دعوت اسمائے الٰہی میں بے نظیر تھے۔ کرامات و خوارق آپ سے بے اختیار سرزد ہوتے۔ "تذکرہ صوفیائے پنجاب" میں ہے کہ آپ صاحب فتویٰ تھے۔ استجاب دعا کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ زبان سے فرماتے وہ اسی طرح ہوتا۔ صاحب کشف و کرامات تھے۔

صاحب خزینتہ الاصفیاء نے لکھا ہے' کہ حضرت شاہ رضا قادری" جن ظاہری و باطنی نعمتوں سے بہرہ ور تھے' وہ لاہور اور پنجاب میں دوسروں کا حصہ نہ بن سکیں۔

آپ کا سنہ پیدائش تلاش بسیار کے باوجود کسی تذکرہ سے نہ مل سکا۔ علوم دینی کی تحصیل کے بعد آپ نے سلسلہ قادریہ شطاریہ میں حضرت شیخ محمد فاضل قادری لاہوری{1} سے بیعت کی۔ انہی کی صحبت میں رہ کر آپ نے عرفان و تصوف کی منازل طے کیں اور خرقہ خلافت پایا۔ شجرۂ طریقت حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری" سے اس طرح جا ملتا ہے:۔

حضرت شاہ محمد رضا قادری" ۔ شیخ محمد فاضل لاہوری" ۔ شیخ اللہ داد قادری" ۔ اکبر آبادی" ۔ شیخ محمد جلال" ۔ شیخ سید نور"۔ شیخ زین العابدین"۔ شیخ وجیہہ الدین گجراتی۔ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری" ۔

حضرت شاہ محمد رضا" نے 12 جمادی الاول 1118ھ مطابق 11 اگست 1706ء میں وصال فرمایا۔ مزار مبارک ایک چبوترے پر بازار سید محمد لطیف جج (نزد ٹبی) میں زیارت گاہ خلق ہے۔ پہلے مزار کے ساتھ کافی زمین وقف تھی۔ جو رفتہ رفتہ مسلمانوں نے

ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر دی۔

آپ کے خلفاء میں حضرت شاہ عنایت قادری رحمتہ اللہ علیہ (مرشد گرامی حضرت پیر بلھے شاہؒ) بہت معروف ہیں۔

{1} حضرت سید محمد فاضل متوکلؒ کے حالات خزینتہ الاصفیاء اور بعض دیگر تذکروں میں اس طرح درج ہیں:

آپ عالم و فاضل متوکل و متورع تھے۔ ریاضت و عبادت اور تجرید و تفرید میں شہرہ آفاق تھے۔ تمام زندگی دائم الصوم اور قائم اللیل رہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ تمام عمر اسی میں گزاری اور ایک خلق کثیر نے آپ سے ظاہری و باطنی فیوض و برکات حاصل کیے۔ کتاب جواہر خمسہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور اکثر اس کا مطالعہ کرتے۔ ان کے والد ماجد سید محمد ہاشم گیلانیؒ جب حج کے لیے جانے لگے تو انہیں نصیحت کی کہ فرزند عزیز! گھر سے باہر نہ نکلنا۔ اپنے گھر ہی میں مصروف رہنا۔ اسی نصیحت پر آپ نے عمر بھر عمل کیا اور ایسے خانہ نشین ہوئے کہ وفات کے بعد ہی گھر سے نکلے۔ اورنگ زیب عالمگیر کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ اکثر حاضر خدمت ہو کر فیوض و برکات حاصل کرتا۔ ایک دفعہ نقد و جنس و جاگیر پیش کی' لیکن آپ نے ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ فرمایا۔

1112ھ میں وفات پائی۔ حضرت سید اسمٰعیل محدثؒ کے مزار کے متصل مدفون ہوئے۔ عالمگیرؒ نے مقبرہ اور مسجد تعمیر کرائے جسے مزنگ کے زمینداروں نے خشت فروشی کے لالچ میں انگریزوں کی عملداری میں مسمار کر دیا اور اینٹیں بیچ دیں۔ اس سے قبل سکھوں نے آپ کے روضہ مبارک کا قیمتی پتھر اکھاڑ لیا تھا۔

چوں شد فاضل' ولی اہل فضل
شد از دنیائے دوں اندر جناں
قبلۂ دیں فاضل آمد رحلتش
نیز "زیب اصفیاء فاضل" بخواں

1112ھ

حضرت سعدی بلخاری نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1108ھ/ 1696ء)

یہ گیارھویں صدی ہجری کی بات ہے۔ وزیر آباد کے معروف بزرگ حاجی سعد اللہ اپنے مرشد حضرت آدم بنوری" (خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی") کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے بنور جا رہے تھے۔ حاجی سعد اللہ حضرت آدم بنوری" کے خلیفہ تھے۔ اس زمانے میں درویش لوگ عموماً پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ حاجی سعد اللہ بھی جب بنور جاتے ہوئے راستے میں ایک گاؤں سے گزرے تو ان کے کان میں اذان ظہر کی آواز آئی۔ حاجی صاحب کے قدم گاؤں کی طرف ہو گئے۔ مسجد میں پہنچے تو وہاں سات آٹھ برس کے ایک بچے کو دیکھا جو بڑے ہی انہماک سے وضو کر رہا تھا۔ حاجی صاحب اسے غور سے دیکھتے رہے کہ ایسا مکمل وضو تو اکثر بوڑھے لوگ بھی نہیں کرتے۔ کچھ یہی حال اس کی ادائیگی نماز کا تھا۔ نماز کے بعد حاجی صاحب نے بچے سے چند باتیں کیں' اس کے لیے دعائے خیر فرمائی اور بنور جانے والے راستے پر ہو لیے۔

ادھر بچے کے دل میں خیال آیا کہ یہ بزرگ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے' مجھے اس کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بچہ حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے چلنے لگا' لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ حاجی صاحب اور اس کے درمیان کافی فاصلہ رہے۔ بچے کا خیال تھا کہ بزرگ کو اگر معلوم ہو گیا کہ میں ان کے پیچھے آ رہا ہوں' تو وہ مجھے میرے گاؤں واپس بھیج دیں گے' اور اس طرح میں ان کی مقدس رفاقت سے محروم ہو جاؤں گا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر کام کا سبب اللہ کی ہی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ بچہ بھی حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا بنور جا پہنچا۔

بنور پہنچ کر حاجی صاحب مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے' وہ بچہ بھی نہایت ادب سے مجلس کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ حضرت آدم بنوریؒ نے حاجی صاحب سے پوچھا' آپ کے ساتھ یہ چھوٹا بچہ کون ہے؟ اب حاجی صاحب کی بچے پر نظر پڑی تو فوراً پہچان گئے' بہت حیران ہوئے۔

حضرت آدم بنوری نے بچے کو اپنے قریب بلایا' تو بچے نے تمام حال کہہ سنایا۔

حضرت نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟

بچے نے کہا: سعدی۔

حضرت نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا: تم ازلی سعادت مند ہو۔ دنیا میں بھی سعدی ہو اور آخرت میں بھی سعدی۔

سات آٹھ سال کا یہی سعادت مند بچہ حضرت آدم بنوری کی تربیت سے آگے چل کر حضرت سعدی بلخاری رحمتہ اللہ علیہ کے نام نامی سے معروف ہوا۔ جن کا مزار مبارک لاہور میں مزنگ کے قریب سعدی پارک کے علاقے میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت سعدی بلخاریؒ مادر زاد ولی تھے' بچپن میں جب ابھی ان پر نماز فرض نہ ہوئی تھی' اس وقت بھی ہمہ وقت عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ بزرگان لاہور کے فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ بنور میں جب حضرت آدم بنوریؒ نے حاجی سعد اللہؒ سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے تو حاجی صاحب نے اسے پہچان کر فرمایا: یہ ہمارے ساتھ آیا ہے۔ یہ سن کر حضور بنوریؒ نے فرمایا: حاجی صاحب! یہ نہ کہو کہ یہ لڑکا ہمارے ساتھ آیا ہے' بلکہ کہو کہ ہم اس کے ساتھ آئے ہیں۔ پھر فرمایا:

یہ لڑکا سعادت ازلی سے بہرہ مند ہے' مقبول خدا ہے۔ اگر قیامت کے روز خدا تمہیں بخشے گا' تو اسی کے سبب بخشے گا۔

حضرت سعدی بلخاریؒ فرماتے ہیں کہ پہلی ملاقات کے بعد جب مجلس برخواست ہوئی' تو حضرت مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ حرم محترم میں فرمایا کہ آج ہمیں چھوٹی عمر کا وہ لڑکا ملا ہے جسے سید عالم ﷺ نے اور حضرت سیدۃ النساء فاطمہ الزہراؓ نے اپنی فرزندی میں قبول فرمایا ہے۔ پھر حضرت نے مجھے اپنی بیعت سے مشرف فرمایا۔ اس کے بعد میں حضرت ہی کے گھر میں رہا۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی اور اپنے ظرف کے مطابق جس قدر روحانی فیوض و برکات حاصل کر سکتا تھا' حاصل کئے اور خرقۂ خلافت سے

سرافراز ہوا۔

آپ اپنے پیر و مرشد حضرت سید آدم بنوریؒ کے وصال کے بعد بہ اشارۂ غیبی لاہور تشریف لائے اور پھر تمام عمر یہیں قیام فرمایا۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ لاہور میں آپ نے چالیس برس تک درس و تدریس اور رشد و ہدایت کا مبارک سلسلہ جاری رکھا۔ مفتی غلام سرور مرحوم نے تحقیق کے بعد آپ کا سال وصال 1108ھ تحریر کیا ہے۔ اس حساب سے خیال ہے کہ آپ لاہور میں 1068ھ کے لگ بھگ تشریف لائے۔

لاہور میں آپ کی بدولت نقشبندی سلسلے کو بہت فروغ حاصل ہوا اور ہزاروں طالبان راہ حق آپ کی تربیت سے منزل مقصود تک پہنچے۔ خود فرماتے ہیں کہ: "مریدان ما مانند ستارہ ہائے آسمان از حیطہ شمار خارج اند۔" یعنی میرے مریدوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے، جس قدر آسمان کے ستارے۔ انہیں شمار کرنا ممکن نہیں۔

"مدینتہ الاولیاء" میں تذکرۂ مناقب سید ادھم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ لاہور میں آپ نے چالیس سال تک خلق خدا کو ظاہری و باطنی علوم کی تعلیم دی۔ آسیب زدہ مریضوں کو آپ کی خدمت میں لایا جاتا تو نظر ملانے ہی سے آسیب زدہ تندرست ہو جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپ فرماتے کہ مریض کو میرے پاس لانے کی ضرورت نہیں، آسیب زدہ کے کان میں جا کر کہہ دو کہ سعدی نے کہا ہے کہ اگر خیریت مطلوب ہے تو یہاں سے چلا جا، ورنہ تیرا حال بہت برا ہو گا۔ اس طرح کہنے سے مریض تندرست ہو جاتا۔

حضرت سعدی بلخاریؒ نے 3 ربیع الثانی 1108ھ مطابق 31 اکتوبر 1696ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں وفات پائی۔ اس وقت مہابت خاں ابراہیم لاہور کا صوبیدار تھا۔

آپ کے چار صاحبزادے تھے (1) خواجہ محمد سلیم (2) خواجہ محمد غنی (3) خواجہ محمد عارف (4) خواجہ محمد یوسف۔ یہ چاروں صاحب زادے علم و عمل اور زہد و ورع میں اپنے والد بزرگوار کے صحیح جانشین تھے۔

آپ کے مریدوں میں شیخ محمد عمر پشاوری بہت معروف ہیں جنہوں نے آپ کے حالات میں ایک کتاب "جواہر الاسرار" لکھی ہے، جس میں حضرت کے حالات اور خوارق و مراتب درج ہیں۔

آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے مزار اقدس پر گنبد تعمیر نہیں کیا گیا۔ "مدینۃ الاولیاء" میں ہے کہ مزار عالی مزنگ میں سعدی پارک ترمذی اسٹریٹ میں واقع ہے۔ لٹن روڈ سے دل فروز سٹریٹ میں داخل ہوں' تو اسی سے ترمذی اسٹریٹ نکلتی ہے۔ اس گلی کے آخر میں آپ کا مزار مبارک ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے "خزینۃ الاصفیاء" میں آپ کی تاریخ وفات یوں منظوم کی ہے۔

شد چو سعدی از جہان اندر بہشت
دل بسال رحلت آں شیخ پیر
"گفت سعدی تاج نعمت" کن رقم

نیز "سعدی عارف اکبر فقیر"
1108ھ

حضرت نظام الدین چشتی المعروف پیر مہکا رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1117ھ/1705ء)

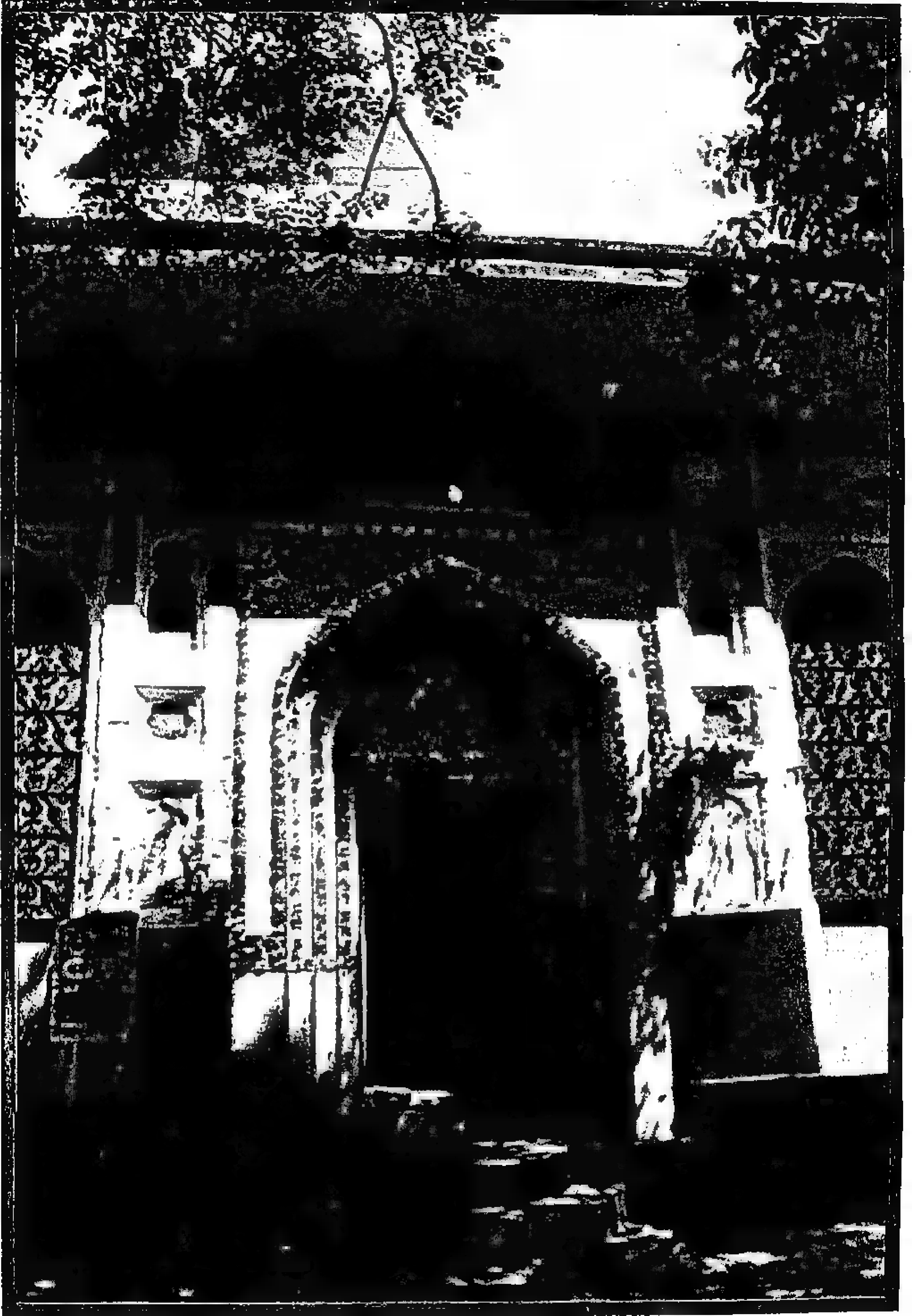
حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایران سے پہلے دکن آئے اور پھر کچھ عرصہ مرشد کی خدمت میں رہنے کے بعد لاہور تشریف لائے اور علاقہ خیر گڑھ (گڑھی شاہو) میں قیام فرمایا۔ مرشد نے آپ کو "خواجہ لاہور" کا خطاب دیا تھا۔ (مدینۃ الاولیاء)

لاہور میں آپ نے رہائش کے لیے ایک حویلی اور باغ تعمیر کیا۔ حویلی میں خانقاہ اور مدرسہ کا بھی آغاز کیا۔ نہایت عالم فاضل تھے۔ لاہور میں بے شمار لوگوں نے آپ سے باطنی و ظاہری فیوض حاصل کیے۔ آپ کے درس کی دور دور تک شہرت تھی۔ کئی مغل شہزادے بھی آپ کے شاگرد تھے جو آپ سے قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر آپ کی بڑی قدر کرتا تھا اور آپ کے مشورے مانتا تھا۔ کہتے ہیں اس نے اپنی بیوی دل رس بانو بیگم کی وفات کے بعد تاج محل کی طرز پر اورنگ آباد میں مقبرہ آپ ہی کے مشورہ کے مطابق تعمیر کروایا تھا۔

آپ سے بے شمار کرامات ظہور پذیر ہوئیں۔ آپ کی دعا سے پھنسیوں، موکوں اور مہاسوں کی تکلیف رفع ہو جاتی تھی۔ اسی لئے عوام میں پیر مہکا کے نام سے مشہور ہو گئے۔

لاہور کے اکثر امرائے شاہی آپ کے معتقد تھے۔ آپ کچھ عرصہ نواب خان بہادر کے لڑکے نواب یحییٰ خاں کے بھی اتالیق رہے۔

آپ کی وفات 1117ھ مطابق 1705ء میں ہوئی۔ اپنی خانقاہ میں ہی دفن ہوئے۔ محمد شاہ رنگیلا بادشاہ دہلی نے بہ لاگت کثیر آپ کا روضہ تعمیر کرایا۔ سکھوں کے عہد



مزار حضرت سید نظام الدین چشتی ؒ

جو شخص اپنی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عادی ہے
وہ کبھی کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

(حضرت نظام الدین چشتیؒ)

میں اس مقبرہ کا قیمتی سنگ مرمر اتار لیا گیا۔ آپ کے دو صاحبزادے محبوب حسین اور امام الدین تھے جو آپ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ حضرت نظام الدین چشتی "تحقیقات چشتی" کے مؤلف نور احمد چشتی کے اجداد میں سے تھے۔ ان کے حالات میں نور احمد چشتی نے اپنا شجرہ بھی درج کیا ہے جو "تحقیقات چشتی" میں صفحہ 436 پر درج ہے۔ اس صفحہ پر مفتی غلام سرور کا یہ قطعہ سال وفات بھی درج ہے۔

پیر مہکا نظام ہر دو جہاں
شیخ عالم امام دین نبیؐ
بہر سال وصال آں حضرت
گفت سرور: نظام دین نبیؐ

1117ھ

نور احمد چشتی مرحوم نے حضرت کے مقبرہ کے بارے میں بھی قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں جو محفوظ کر لینے کے قابل ہیں۔ "تحقیقات چشتی" پہلی دفعہ 1864ء میں شائع ہوئی تھی۔ حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ کا یہ منظر اسی عہد سے متعلق ہے۔ نور احمد چشتی لکھتے ہیں:

"یہ مقبرہ موضع گڑھی شاہو میں اور جنوب رویہ سڑک میاں میر موجود ہے۔ صورت اس کی باہر سے مربع' چار پہلو۔ ہر پہلو میں تین تین دہن اور ہر دہن کے اوپر محراب خورد۔ میان دہن کلاں اور بغلوں والے اس سے خورد۔ دہن ہائے میانہ کے باہر محراب قالبوتی اور اس کے نیچے اندر دروازہ خشتی اور دروازے کے اوپر تابدان۔ اب محراب ہائے بالائی اور دہن ایک ہی ہو گئے ہیں۔ یعنی حد میانہ گر گئی ہے اور لب بام ہر چار طرف گردنہ اب کہیں کہیں سے بوسیدہ۔

میانہ میں گنبد کلاں اور کلاں مقبرہ کے دروازوں کے اوپر گنبد' جہاں سے عمارت گنبد شروع ہوتی ہے' چاروں گوشوں میں چار محراب دیواریں تمام چونہ گچ۔ سقف مقبرہ بے استرکاری۔ اوپر سے گنبد چونہ گچ۔ اب برنگ سیاہ۔

غرب رویہ باہر مقبرہ کے ایک تھڑہ چونہ گچ۔ اس پر قبرمائی معصومہ خادمہ حضرت کی۔ اب باعث بے غوری و کم توجہی جناب والدم کے قبور مسمار ہو گئی ہیں۔ فقط شرق رویہ اس مقبرہ کے ایک گز بلند ایک تھڑہ مربع کھڑا ہے۔ عمارت اس کی ایسی پختہ ہے کہ

گرانا اور اکھاڑنا اس کا بعید العقل۔ اس کے نیچے ایک تہہ خانہ۔ یہ قبر حضرت پیر مہکا صاحب کی کنیز مسماۃ قدم خیر کی ہے۔ اس کے شمال و شرق رویہ اکثر قبور خام ساکنان موضع خیر گڑھ وغیرہ زمینداران کی۔ اب گردونواح اس تھڑہ کے زراعت ہوتی ہے۔

حضرت شاہ کنٹھ قادری نوشاہی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1119ھ / 1707ء)

آپ حضرت نوشہ گنج بخش قادری رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ صاحب تحقیقات چشتی کے مطابق 1020ھ مطابق 1610ء بعہد سلطان نور الدین جہانگیر افغانستان سے ہندوستان میں آئے۔ بیعت و خلافت کے بعد آپ کو لاہور جانے کا حکم ہوا۔

کسی تذکرہ میں آپ کی تاریخ ولادت اور نام نامی درج نہیں ہے۔ کہتے ہیں کنٹھ مالا کے مریض حضرت کی دعا سے شفایاب ہو جاتے تھے' اس لئے عوام میں شاہ کنٹھ کے نام سے معروف ہو گئے۔ جس طرح لاہور کے بزرگوں حضرت گھوڑے شاہ اور حضرت شیر شاہ وغیرہ کے اسمائے گرامی سے عوام واقف نہیں ہیں البتہ قدیم تذکروں سے ان کے نام معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حضرت شاہ کنٹھ کا اصلی نام کسی بھی تذکرہ نگار نے نہیں لکھا۔

حضرت نے لاہور میں آ کر اس جگہ ڈیرہ لگایا' جہاں آج آپ کا مزار مبارک ہے۔ نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں اور منشی محمد دین فوق نے یاد رفتگاں میں اور مولوی محمد عبدالحئی صدیقی مذاقی قادری نے تذکرۃ الصلحا الموسوم بہ تاریخ احسن میں آپ کی تاریخ وفات 14 ربیع الاول 1119ھ مطابق 15 جون 1707ء تحریر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طویل عمر پائی اور تقریباً ایک سو سال تک اہل لاہور کو فیض یاب فرمایا۔ اس وقت محمد اعظم بن اورنگ زیب عالمگیر کا دوسرا سال جلوس تھا۔

شریف التواریخ (جلد سوم حصہ اول) میں سید شرافت نوشاہی نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد اگر کوئی آپ کے مزار اقدس کی بے ادبی کرتا تو اس کو سخت ایذا پہنچتی تھی۔

قبر مبارک پر یہ کتبہ موجود ہے:

روضہ مبارک شاہ کنٹھ و الٰہی شاہ مرحوم مغفور از خاندان نوشاہ قادریہ عالیہ و خلفائے پاک رحمٰن۔ (مرتبہ: سائیں جواہر شاہ طالب الٰہی شاہ صاحب 1290ھ)

چبوترے پر کل چار قبریں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ الٰہی شاہ کی قبر ہے اور اس کے ساتھ رحمانی سلسلہ کے دو بزرگ محمود شاہ اور بھائی خاں آسودۂ خواب ہیں۔

سید شرافت نوشاہی نے شریف التواریخ میں آپ کا مادۂ تاریخ اس طرح درج کیا ہے۔

مقبول عصر شاہ کنٹھ

1119ھ

حضرت شیخ جان محمد سہروردی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1120ھ/ 1708ء)

آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل (المعروف حضرت میاں وڈا) رحمتہ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں سے ہیں۔ حضرت میاں وڈا" کے اسی نام کے ایک خلیفہ حضرت شیخ جان محمد ثانی سہروردی" کے حالات آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ سہروردیہ خاندان کے بعض تذکروں (مثلاً شاہ رکن عالم ملتانی" از علامہ نور احمد فریدی) میں ان کے نام نامی کے ساتھ ثانی کا اضافہ موجود ہے۔ اس اعتبار سے اب جن بزرگ کا ذکر خیر مقصود ہے' وہ شیخ جان محمد لاہوری (اول) ہیں۔

آپ طریقت' شریعت' فقہ اور حدیث کے عالم کامل اور مقتدائے زمانہ تھے۔ لاہور کے محلہ پرویز آباد میں سکونت رکھتے تھے۔ صغر سنی میں آپ شیخ عبدالحمید سے انکے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جو حضرت میاں وڈا رحمتہ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ایک روز آپ کے استاد شیخ عبدالحمید اپنے مرشد کی خدمت میں تشریف لے گئے تو آپ بھی انکے ہمراہ تھے۔ حضرت میاں وڈا" اس وقت خوش بیٹھے تھے۔ چھوٹے بچے کو مخاطب کر کے فرمایا: اے لڑکے! اگر تم پڑھ لکھ کر عالم فاضل بن جاؤ' تو کیا میرے ساتھ حدیث پاک کا دورہ کرو گے؟ شیخ جان محمد شرم و حیا اور ادب کے باعث خاموش رہے۔ اس پر ان کے استاد شیخ عبدالحمید نے فرمایا: اے بچے! یوں عرض کرو کہ اگر حضور کی توجہ سے مجھے علوم متداولہ پر عبور حاصل ہو گیا تو پھر میں حضرت ہی کے قدموں میں آ پڑوں گا۔ شیخ جان محمد نے اسی طرح عرض کی' جس پر حضرت میاں صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی جس کی برکت سے شیخ جان محمد تھوڑے سے عرصہ میں علوم ظاہری سے فارغ ہو گئے۔

شیخ عبدالحمید نے جب دیکھا کہ ان کا شاگرد ان سے بھی زیادہ قوت علمی حاصل کر

چکا ہے اور ابھی اس کا طائر ہمت برابر محو پرواز ہے" تو انہوں نے ان کو شیخ تیمور کے حوالے کیا۔ وہ بھی حضرت میاں صاحب کے مرید اور لاہور کے جید علماء میں سے تھے۔ انہوں نے شیخ جان محمد کو اپنی تربیت میں لے لیا اور تھوڑی مدت میں ہی جملہ علوم طے کرانے کے بعد ان کی دستار بندی فرمائی۔

ادھر شیخ جان محمد کی دستار بندی ہوئی ادھر حضرت میاں صاحب اپنے مدرسہ میں مراقبہ فرما رہے تھے۔ دفعتاً ان کی توجہ شیخ جان محمد کی طرف منعطف ہوئی۔ اسی وقت شیخ جان محمد کے دل میں میاں صاحب سے ملنے کے لیے بے قراری پیدا ہوئی اور وہ اسی حال میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ میاں صاحب نے انہیں دیکھتے ہی چھاتی سے لگا لیا اور نعمت باطنی سے سرفراز کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اب وعدہ کے مطابق دو شنبہ اور جمعہ کے دن آ کر میرے ساتھ حدیث پاک کا دورہ کیا کرو۔ چنانچہ جب تک حضرت میاں صاحب زندہ رہے شیخ جان محمد مقرر دنوں میں ان سے حدیث کا دورہ کیا کرتے تھے دورۂ حدیث کے دوران جہاں کہیں کسی حدیث میں شبہ گزرتا میاں صاحب فوراً مراقبہ میں چلے جاتے اور حضرت رسالت پناہ ﷺ کی روح پاک سے تصحیح کرا لیتے۔

حضرت سید شاہ محمد غوث قادری جب پشاور سے علم حدیث پڑھنے کی غرض سے لاہور آئے تھے تو انہوں نے آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور حدیث کی اجازت بھی حاصل کی تھی۔

شیخ جان محمد نے 1120ھ مطابق 1708ء میں بعہد بہادر شاہ اول خلف اورنگ زیب عالمگیر انتقال فرمایا۔ پہلے آپ کو پرویز آباد میں دفن کیا گیا' لیکن آپ نے اپنے خادم کو خواب میں فرمایا کہ مجھے حضرت میاں وڈا رحمتہ اللہ علیہ کے مزار اقدس کے قریب دفن کرو۔ علاقہ کے نمبردار نے آپ کے جسد اطہر کو نکلوا کر حضرت میاں صاحب کے قدموں میں دفن کرایا' مگر دوسرے دن جب لوگوں نے دیکھا تو شیخ جان محمد کی قبر حضرت میاں صاحب کی قبر شریف کے بالکل متوازی بنی ہوئی تھی۔ مزار پر یہ اشعار کندہ ہیں:

جہان معنی و جان محمد
کہ از عشق محمد گشت محمود
فرو از فضل حق تاریخ سالش
وصال عاشق و معشوق فرمود

حضرت درگاہی شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1122ھ/ 1710ء)

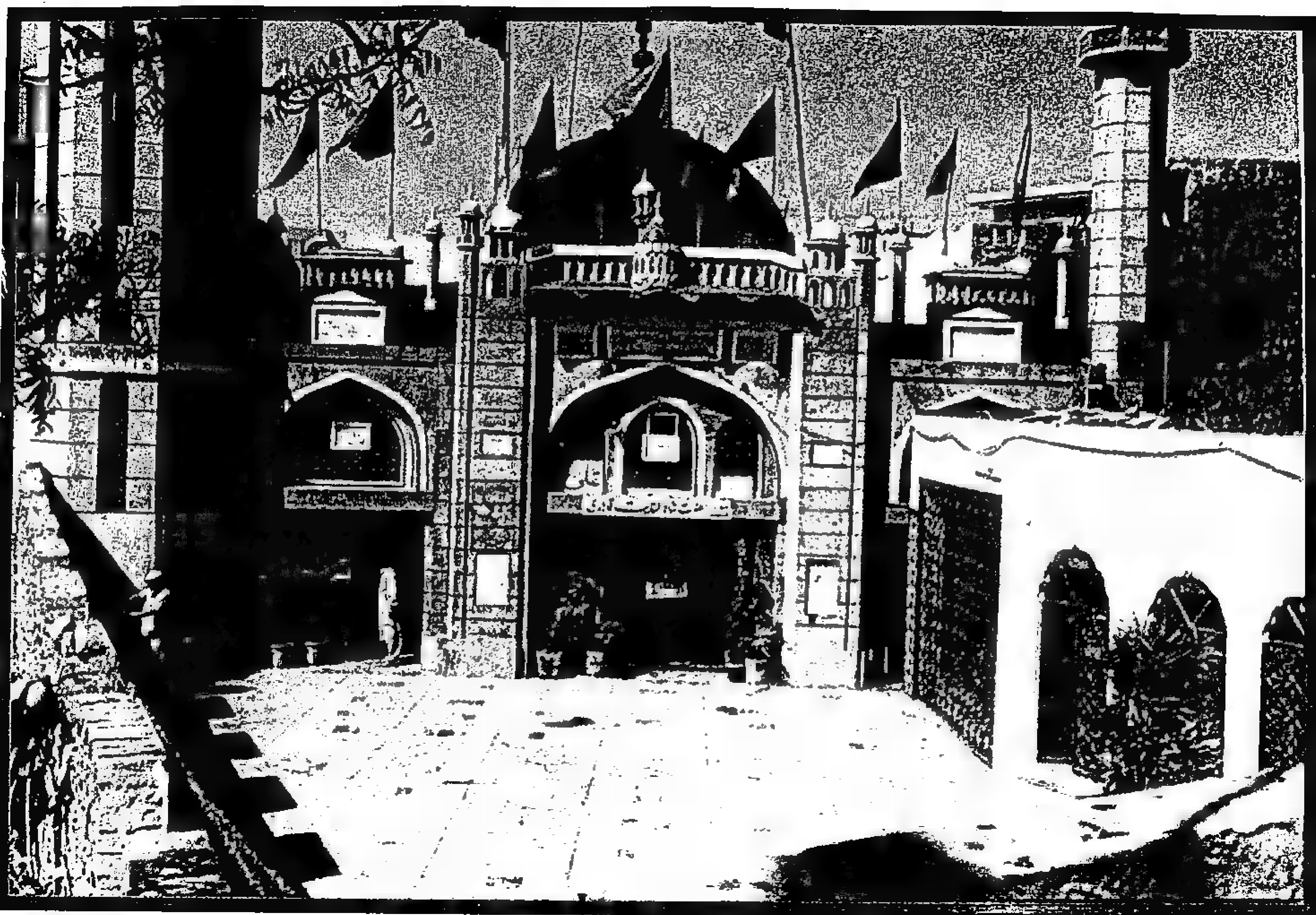
آپ کے ابتدائی حالات کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہو سکے۔ تحقیقات چشتی کے مطابق حضرت شاہ چراغؒ کے ہمراہ لاہور میں تشریف لائے۔ حدیقۃ الاولیاء میں ہے کہ آپ حضرت شاہ چراغ گیلانی لاہوریؒ کے مرید اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ ان کی دعا حاجتمندوں کے لیے اکسیر اعظم تھی' اس لئے دن رات دروازے پر دعا کرانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ "مدینۃ الاولیاء" میں ہے کہ قادری سلسلہ کے علاوہ آپ نے خاندان چشتیہ صابریہ میں بھی فیض حاصل کیا۔

ہال روڈ میں جس جگہ اب آپ کا مزار ہے' اس کے ساتھ ایک کنواں بھی ہوتا تھا۔ جسے "پانی واتیاں دا کھوہ" کہتے تھے۔ راقم نے لڑکپن کے زمانے میں اس کنویں کو دیکھا تھا۔ جس کے ساتھ چند "سقاوے" بھی تھے۔ خارش کے مریض یہاں آکر نہاتے تھے اور اللہ کی قدرت سے شفایاب ہو جاتے تھے' اب کنواں بند کروا کر ہینڈ پمپ لگا دیا گیا ہے۔

"اولیائے لاہور" میں ہے کہ جو زمیندار اس کنویں کا مالک تھا' وہ حضرت کا مرید تھا' اتفاق سے زمیندار کے بیٹے کے بدن پر اس قسم کے پھوڑے نکل آئے جسے پنجاب میں "پانی واتی" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے پھوڑوں میں صرف پانی ہوتا ہے۔ زمیندار اپنے بیٹے کو حضرت کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا اور التجا کی کہ اس کی شفا کے لیے دعا فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس مرض سے شفایابی کے لیے تمہارے کنویں کا پانی کافی ہے۔ اسے کنویں کے پانی سے نہلا دو' یہ شفایاب ہو جائے گا' پھر فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ خارش کا جو بھی مریض اس کے پانی سے نہائے' وہ شفایاب ہو۔ زمیندار نے اپنے

بچے کو کنویں کے پانی سے نہلایا تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ تندرست ہو گیا۔

حضرت کی وفات 1122ھ مطابق 1710ء میں ہوئی۔ اس وقت متحدہ ہندوستان پر قطب الدین شاہ عالم اول (بہادر شاہ اول) کی حکومت تھی اور سید اسلم خان نائب ناظم لاہور تھا۔ مزار اقدس چوک ہال روڈ کے قریب مسجد کے اندر واقع ہے۔ اسی روڈ پر چند قدم آگے حضرت سید اسماعیل بخاری محدث رحمتہ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ جنہیں اولین مبلغ لاہور کہا جاتا ہے۔



مزار حضرت شاہ عنایت قادریؒ

قرآن اور تلوار سے عشق کرو۔

(حضرت شاہ عنایت قادریؒ)

حضرت شاہ عنایت قادری شطاری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1141ھ/1706ء)

حضرت شاہ رضا قادری رحمتہ اللہ علیہ المتوفی 1706ء (جن کا مزار مبارک بٹی بازار میں ہے) خلیفہ اعظم ہیں' کے والد ماجد کا نام پیر محمد تھا۔ جن کا تعلق باغبانپورہ کے ارائیں خاندان سے تھا۔ آپ ایک عرصہ تک مرشد کامل کی خدمت میں رہے اور تربیت کے بعد تکمیل کو پہنچے۔ مرشد نے خرقہ خلافت عطا فرما کر قصور جانے کا حکم دیا۔ وہاں جا کر آپ خلق خدا کی ہدایت میں مشغول ہوئے۔ آپ کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ سینکڑوں اشخاص آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

آپ کی مقبولیت حاکم قصور کے لیے پریشانی کا باعث ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اس سے اختلاف کے باعث آپ کو قصور چھوڑنا پڑا اور آپ لاہور واپس آ گئے۔ مؤلف اولیائے لاہور قصور سے ہجرت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قصور کی ایک مغنیہ کا شوہر فوت ہو گیا' تو ایک روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حضرت کی مجلس میں اس نے اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کی اور آئندہ اسلامی احکام کے مطابق نیک زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ چونکہ بیوہ ہونے کے بعد یہ عورت نہایت مفلس ہو گئی تھی' اس لیے اس نے حضرت کی خدمت میں درخواست کی کہ اسے زنانہ لنگر خانہ میں خدمت گزاری کے لیے رکھ لیا جائے۔ حضرت نے اس کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ اس وقت یہ عورت اپنے مرحوم شوہر کی طرف سے امید سے تھی۔ چھ ماہ کے بعد اس کے بطن سے ایک حسین و جمیل بیٹی پیدا ہوئی' جسے اس نے مسائل دین کی تعلیم دلائی اور قرآن مجید بھی حفظ کرایا۔ یہ نیک سیرت اور صالحہ بچی جب بالغ ہوئی تو اس کی والدہ نے حضرت کی خدمت میں گزارش کی کہ میری بچی کا اپنے خدام میں سے کسی کے ساتھ نکاح کروا دیں۔ یہ سن کر

حضرت نے فرمایا کہ انتظار کرو شاہ عنایت تمہاری دختر نیک اختر سے نکاح کا خواستگار ہو گا۔ یہ سن کر وہ عورت بہت خوش ہوئی اور اپنی سعادت سمجھ کر اس بات کو قبول کیا۔ چند روز بعد اس دختر کا حضرت کے ساتھ نکاح ہو گیا۔

مغنیہ کے رشتہ داروں کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے بہت شور مچایا کیونکہ وہ تو اس خیال میں تھے کہ بچی کو حاصل کر کے اس سے گانے بجانے کا کام کروائیں گے۔ جب ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا تو انہوں نے حاکم قصور نواب حسین خان تک رسائی حاصل کی اور اس کے کان بھرے۔ حاکم تو پہلے ہی حضرت کی مقبولیت سے خائف تھا اس نے حضرت کو طلب کیا اور کہا کہ ایک مغنیہ کی بیٹی کو اپنے حرم میں داخل کرنا آنجناب کے شایان شان نہیں۔ یہ تو بہت گھٹیا لوگ ہوتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ توبہ کر لینے کے بعد اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے سے کوئی انسان گھٹیا نہیں رہتا۔ قرآن نے ان لوگوں کو جو تقویٰ کی زندگی گزارتے ہیں انتہائی معزز و محترم قرار دیا ہے۔ میں نے لڑکی کے ساتھ جو نکاح کیا ہے وہ اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق اور شریعت حقہ کے عین مطابق کیا ہے۔ نواب حسین خان کی سمجھ میں یہ بات کیسے آ سکتی تھی' وہ تو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح حضور کو قصور سے نکال دے۔ چنانچہ اس نے حضرت سے کہا کہ اب آپ کا قصور میں رہنا مناسب نہیں آپ لاہور تشریف لے جائیں۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا کہ اللہ کی زمین وسیع ہے' اگر تمہیں میرا یہاں رہنا پسند نہیں تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت اسی وقت اپنے اہل و عیال کے ساتھ قصور سے نکل کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ اہل قصور کو جب اس کا علم ہوا تو وہ روتے ہوئے حضرت کے پیچھے دوڑے اور ان سے عرض کی کہ آپ قصور ہرگز نہ چھوڑیں' لیکن حضرت نے سب کو تسلی دی اور فرمایا کہ تم فکر نہ کرو' حسین خان نے ہم کو قصور سے نکالا ہے لیکن ہم نے اس کی جڑ کو دنیا سے باہر پھینک دیا ہے۔ چنانچہ چند روز نہ گزرے تھے کہ نواب حسین خان سکھوں کی سازش سے گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

قصور سے آنے کے بعد آخر عمر تک حضرت لاہور ہی میں مقیم رہے۔ حضرت شاہ عنایت ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے۔ ابوالمعارف آپ کی کنیت تھی۔ آپ کی تصنیفات میں غایتہ الحواشی حاشیہ شرح وقایہ (دو جلدوں میں) اور ملتقط الحقائق' شرح کنز الدقائق بہت مشہور ہیں۔

آپ کے درس میں قرآن پاک' حدیث و فقہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم' فصوص الحکم اور تصوف کی امہات کتاب کا درس بھی ہوتا تھا۔

آپ کے درس میں قرآن پاک' حدیث و فقہ کے علاوہ مثنوی مولانا روم" نصوص الحکم اور تصوف کی امہات کتب کا درس بھی ہوتا تھا۔

حضرت شاہ عنایتؒ نے 1141ھ میں محمد شاہ کے عہد میں وفات پائی۔ اس وقت لاہور کا ناظم نواب عبدالصمد خاں تھا۔ بے شمار طالبان خدا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل مراتب کو پہنچے۔ آپ کے خلفاء میں حضرت سید بلھے شاہ" نے بہت زیادہ شہرت پائی۔

مزار مبارک شاہراہ فاطمہ جناح پر مرجع خلائق ہے۔

حضرت سید بلھے شاہ قادری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1171ھ)

گیارھویں صدی ہجری اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی' اور موضع اوچ گیلانیاں (بہاولپور) میں پانچ چھ سال کا ایک چھوٹا بچہ نہایت تیزی کے ساتھ اپنی روحانی ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔

ایک روز یہ مبارک بچہ گاؤں سے باہر اپنے ننھے ہم جولیوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ گاؤں کے لوگ چینا کے دانے کوٹنے اور اس کی چھڑائی میں مصروف تھے۔ اچانک بچے کی نظر گاؤں کے بعض ان لوگوں پر پڑی جو تسبیح تو بہت پھیرتے ہیں' لیکن اپنی زندگی میں حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتے۔ جو نیکی کا ذکر تو کرتے ہیں' لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اس موزون طبع بچے کی زبان سے فوراً یہ اشعار نکلے جنہیں اس نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔

لوکاں دیاں جپ مالیاں' تے بابے دا جپ مال
ساری عمرا مالا پھیری' اک نہ کھتما وال
چینا انج چھڑیندا

(یعنی لوگوں کا مال ناحق کھاتے رہے اور جو کچھ اللہ نے دیا'
اس میں سے کبھی اس کی راہ میں خرچ نہ کیا۔ اسی حال میں ساری
عمر تسبیح پھیرتے رہے' لیکن کچھ حاصل نہ ہوا)

کافی دیر تک جب یہ بچہ گھر نہ پہنچا' تو اس کا بزرگ والد اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے گاؤں سے باہر آیا۔ دیکھا کہ بچہ ہاتھ میں تسبیح پکڑے شعر پڑھنے میں مگن ہے۔ عارف اور خدا شناس والد چھوٹے بچے کی زبان سے ظاہر پرستوں اور ریاکاروں پر کی جانے والی اس

طنز سے بہت متاثر ہوئے بچے کو پیار کیا اور اسے کاندھوں پر بٹھا کر گھر لے آئے۔ اسے ڈھیروں دعائیں دیں اور فرمایا: بیٹا! انشاء اللہ تو بڑا ہو کر رشد و ہدایت کے سلسلے میں بڑے بڑے کام انجام دے گا۔

دنیا دار اور ریاکار مذہبی لوگوں پر طنز کرنے والے اس بچے کا نام عبداللہ تھا جو بعد میں حضرت بلھے شاہؒ کے نام سے مشہور ہوا' اور اس کے عارف باپ کا اسم گرامی سید سخی محمد شاہ تھا' جو ایک درویش صفت بزرگ اور ممتاز عالم دین تھے۔

حضرت بلھے شاہؒ کی ولادت اوچ گیلانیاں (بہاولپور) میں 1081ھ میں ہوئی اور والد نے عبداللہ شاہ نام رکھا۔ شجرۂ نسب چودہ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے۔ تفصیل اس طرح ہے: حضرت سید عبداللہ شاہ' سید سخی شاہ محمد' نور محمد' ابوبکر' وجیہہ الدین' عبدالحکیم' شاہ نعمت اللہ' ابو صدر الدین' نصیرالدین' محمد رحمت اللہ' سید یحییٰ' سید احمد' سید صالح نصر' سید عبدالرزاق' محبوب سبحانی حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔

بلھے شاہ پیدا ہوئے' تو یہ وہ زمانہ تھا جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ وفات پا چکے تھے اور اطاعت گزار حکمران بغاوت پر آمادہ ہو رہے تھے۔ اس موقع پر سکھوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور پنجاب میں اپنی طاقت بڑھانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سکھ گردی کے باعث پنجاب کا وہ حال ہوا کہ بلھے شاہ کو کہنا پڑا:

برا حال ہویا پنجاب دا

بلھے شاہ بچپن میں مویشیوں کی دیکھ بھال کا کام کرتے تھے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ عالم باعمل بھی تھے۔ باپ کو ان کی تعلیم و تربیت کا بھی بے حد خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ان کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو انہیں ایک مقامی مدرسے میں داخل کرایا گیا۔ پہلے ہی روز استاد نے ابتدائی قاعدہ کا سبق دینا چاہا تو آپ استاد کو یہ شعر سنا کر گھر آ گئے کہ

الف پچھاتا ب پچھاتی ت تلاوت ہوئی
جو کوئی ساڈے اندر وسدا ذات اساڈی ہوئی

(یعنی ہم نے الف ب کو پہچان لیا ہے' ت کی تلاوت بھی کر لی ہے اور ان سب حروف سے یہ جان لیا ہے کہ صرف اللہ ہی کی ذات کا جلوہ ہمارے اندر موجود ہے)۔

اس چھوٹی عمر میں بھی گھریلو ماحول کے باعث بلھے شاہ ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ جب استاد کو یہ شعر سنا کر آپ گھر آئے اور والد ماجد کو اس کا حال معلوم ہوا، تو انہوں نے آپ کو بہت سمجھایا اور کہا کہ بیٹا! یہ ظاہری تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔ یہ سن کر آپ نے والد کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور دل لگا کر علم حاصل کرنا شروع کیا۔

اوچ گیلانیاں سے ہجرت

بلھے شاہ کی عمر چھ یا سات سال کی تھی کہ بعض مجبوریوں کے باعث ان کے والد سید شاہ محمد کو اوچ گیلانیاں سے ہجرت کر کے ملک وال (ضلع ساہیوال) آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ ملک وال کے ایک نواحی گاؤں "پانڈو کے بھٹی" میں آ گئے اور یہیں ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دینے لگے اور درس و تدریس کے سلسلے کا آغاز کیا۔

بلھے شاہ کا لڑکپن اسی گاؤں میں گزرا۔ یہیں سے وہ اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مسجد کوٹ قصور چلے گئے۔ اس درس گاہ کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا۔ یہاں حضرت خواجہ حافظ غلام مرتضیٰ قصوری رحمتہ اللہ علیہ حدیث اور تفسیر پڑھاتے تھے۔ حضرت بلھے شاہ نے بھی اسی مدرسے سے انہیں حافظ غلام مرتضیٰ رحمتہ اللہ علیہ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ حافظ صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے دو شاگرد عجب ملے ہیں۔ ایک سید بلھے شاہ، جس نے اعلیٰ علم حاصل کر کے سارنگی پکڑ لی اور دوسرا سید وارث شاہ، جو عالم فاضل بن کر "ہیر رانجھا" کے گیت گانے لگا۔"

ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد بلھے شاہ کو کسی مرشد کامل کی تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں بھاٹی گیٹ لاہور کی اونچی مسجد کے امام حضرت شاہ عنایت قادری شطاری کا بڑا شہرہ تھا، اور لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ لاہور میں مسند ولایت پر جلوہ افروز ہیں۔ حضرت بلھے شاہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرشد کامل کی ایک ہی نگاہ اپنا کام کر گئی اور بلھے شاہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

یہ بیعت جہاں حضرت بلھے شاہ کی زندگی میں ایک عظیم انقلابی واقعہ تھا، وہاں ان کے اہل خاندان کے لیے ناگواری کا باعث بھی بنا، وہ یوں کہ حضرت بلھے شاہ حسنی حسینی

گیلانی سید تھے اور ان کے مرشد حضرت شاہ عنایت ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے عزیز رشتہ داروں نے اس رابطہ کو اپنے خاندانی وقار اور مرتبہ سے فروتر جانا۔ اس واقعہ کا ذکر حضرت بلھے شاہ کے کلام میں اس طرح ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

بلھے نوں سمجھاون آئیاں' بھیناں تے بھرجائیں
آل نبی' اولاد علی دی' توں کیوں لیکاں لائیاں

من لے بلھیا ساڈا کہنا' چھڈ دے پلہ ارائیاں
بلھے نالوں چلھا چنگیرا' جس تے روٹیاں لائیاں

(یعنی حضرت شاہ عنایت کی بیعت کے بعد بلھے شاہ کو اس کی بہنیں اور بھاوجیں سمجھانے کے لیے آئیں کہ تم آل نبی ﷺ اور اولاد علی رضی اللہ عنہ ہو کر اپنے خاندانی وقار کو کیوں بٹہ لگا رہے ہو' ہمارا کہنا مان لو اور ارائیں پیر کا دامن چھوڑ دو۔ تم بظاہر تو بڑے عقلمند بنے پھرتے ہو لیکن تم سے تو وہ چولھا بہتر ہے جو کم از کم روٹیاں پکانے کے کام تو آتا ہے۔)

حضرت بلھے شاہ کو حضرت شاہ عنایت کی صورت میں ایک عظیم مرشد کامل مل چکا تھا' انہوں نے اپنے اہل خانہ کے ان اعتراضات کا کچھ اثر نہ لیا اور فرمایا: ذات پات کا گھمنڈ اچھا نہیں' جو سید آنحضور ﷺ کی اتباع نہیں کرتے' وہ سیدھے دوزخ میں جائیں گے اور جو غیر سید سچے دل سے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔ آخرت کی زندگی کا دار و مدار سید یا غیر سید ہونے پر نہیں' بلکہ انسان کے نیک یا بد ہونے پر ہے۔ پھر اپنے عزیزوں کو اپنے مرشد کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

میں ویکھاں آ عنایت سائیں' جس مینوں شوہ ملایا اے

(یعنی میں تمہارے مشورے سنوں' یا اپنے مرشد کو دیکھوں' جس نے مجھے اللہ سے ملا دیا ہے۔)

بیعت کے بعد مرشد نے بلھے شاہ کو حکم دیا کہ وہ جنگلوں میں جا کر ریاضت و عبادت کریں۔ بلھے شاہ نے اس حکم کی تعمیل کی اور دریائے چناب کے نواح میں یاد الٰہی اور وظائف میں مستغرق رہنے لگے۔ جب بھوک لگتی تو درختوں کے پتے کھا لیتے۔ آخر

مرشد کی نظرِ عنایت سے روحانیت کے درجہ کمال پر فائز ہوئے اور مرشد کامل نے آپ کو خلافت سے نوازا اور حکم دیا کہ اب قصور جا کر خلق خدا کو ہدایت کی راہ دکھاؤ۔ بلھے شاہ نے عرض کی: حضرت! وہاں کے پٹھان بہت خود سر ہیں وہ درویشوں کو ٹھہرنے نہیں دیتے۔ مجھے کسی اور جگہ بھیج دیں' لیکن پیر روشن ضمیر نے فرمایا: بلھے شاہ! تمہیں قصور ہی جانا ہے۔ آخر بلھے شاہ قصور آ گئے اور شہر سے باہر ایک تالاب کے کنارے ڈیرے لگا دیئے۔ اس وقت قصور کی اخلاقی و معاشرتی حالت کیسی تھی۔ اس کا ذکر وہ ایک شعر میں یوں کرتے ہیں۔

بلھیا قصور بے دستور' اوتھے جانا بنیاں ضرور
نہ کوئی پن' نہ دان ہے' نہ کوئی لاگ دستور

کہتے ہیں نیکی خوشبو کی طرح پھیلتی ہے۔ قصور آ کر بلھے شاہ کے اخلاق و محاسن کا چرچا ہونے لگا۔ آپ بیشتر وقت عبادت الٰہی اور گریہ و زاری میں گزارتے' اکثر خاموش رہتے۔ یہاں آپ نے لنگر کا بھی انتظام کیا' جس سے عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔

رفتہ رفتہ حضرت بلھے شاہؒ کی شہرت قصور کے پٹھان حکمران کے ایوانوں تک جا پہنچی اور محلات کی ایک بیوہ خاتون ان کی معتقد ہو گئی۔ اس نے شہر کے اندر بلھے شاہؒ کے لیے دو پختہ مکان تعمیر کروائے' اور ان سے درخواست کی کہ اب وہ شہر کے اندر آ کر رہیں۔ بلھے شاہؒ نے یہ درخواست قبول فرمائی اور شہر کے اندر رہائش اختیار کر لی' لیکن آپ صرف ایک حجرہ میں قیام کرتے تھے' باقی تمام جگہ مریدوں اور مہمانوں کے لیے وقف تھی۔ اس کے علاوہ انہیں ایک مربع زمین بھی مل گئی' جہاں آپ حاضرین کو نصیحتیں فرماتے۔ لوگوں کے لیے دعائے خیر فرماتے۔ ان کی دلجوئی کرتے اور سماع سے محظوظ ہوتے۔ طبعاً انتہائی سخی تھے' جو روپیہ پیسہ حاصل ہوتا' وہ سب کا سب غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔

تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا

قصور میں حضرت بلھے شاہؒ کے استاد حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ بھی موجود تھے' جن کا وہ انتہائی احترام کرتے تھے۔ حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ کی دختر کی شادی کا موقع آیا' تو حافظ صاحب نے بلھے شاہؒ کے ذمے یہ فرض سونپا کہ وہ براتیوں کی مہمانداری کے کام کی

نگرانی کریں۔ برات آئی تو بلھے شاہؒ اس کام میں مشغول ہوئے' اتفاق سے اسی روز ان کے روحانی مرشد حضرت شاہ عنایتؒ کے حقیقی بھتیجے اور داماد مولوی ظہور محمد انہیں ملنے کے لیے قصور آئے۔ بلھے شاہ براتیوں کی مہمانداری میں مصروف تھے' انہیں جب مولوی ظہور محمد کے آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے چند خاص خادموں کو حکم دیا کہ وہ مولوی ظہور محمد کی ہر طرح خاطر مدارات کریں۔ وہ اگلے روز صبح سویرے فارغ ہوتے ہی مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔

ادھر بلھے شاہ رات بھر براتیوں کی خدمت میں مشغول رہے' اور ادھر مولوی ظہور محمد ہر لحہ بلھے شاہ کے منتظر کہ وہ انہیں ملنے کے لیے آئیں۔ صبح بلھے شاہ واپس آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ مولوی ظہور محمد صبح ہونے سے قبل ہی لاہور واپس چلے گئے ہیں۔ یہ سن کر بلھے شاہ کو بہت افسوس ہوا۔ ادھر مولوی ظہور محمد نے حضرت شاہ عنایتؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں قصور میں بلھے شاہ کو ملنے کے لیے گیا' لیکن انہوں نے مجھے ملنا کسرِشان سمجھا۔ حضرت شاہ عنایتؒ کو اس بات سے بہت دکھ ہوا اور جلال میں آ کر فرمایا' اب بلھے شاہ کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ آئندہ وہ میرے پاس نہ آئے۔

روحانی سلسلہ بھی عجیب ہے۔ بلھے شاہؒ کو فوراً معلوم ہو گیا کہ ان کے مرشد ان سے ناراض ہو گئے ہیں اور وہ روحانی فیض سے محروم ہو گئے ہیں۔ بے قراری کے اس عالم میں سیدھے گوالیار (بھارت) گئے' جہاں حضرت شاہ عنایتؒ کے سلسلہ شطاری کے بزرگ حضرت شیخ محمد غوثؒ کا مزار مبارک تھا' یہاں آپ نے مراقبہ کیا اور حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کی کہ پریشانی کے اس ہنگام میں وہ روحانی طور پر ان کی مدد فرمائیں تاکہ ان کے مرشد ان پر مہربان ہو جائیں۔ وہاں سے روحانی اشارہ پاتے ہی وہ لاہور آئے اور ان قوالوں سے ملے' جو حضرت شاہ عنایتؒ کی خدمت میں عارفانہ کلام گایا کرتے تھے۔ آپ نے انہیں بتایا کہ وہ مغنیہ کے بھیس میں اپنے مرشد کی بارگاہ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

قوالوں نے ان کی مدد کا وعدہ کیا اور حضرت شاہ عنایتؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک مغنیہ عارفانہ کلام سنانے کے لیے باریابی کی اجازت چاہتی ہے۔ حضرت شاہ عنایتؒ نے فرمایا کہ ہم اس مغنیہ کو جانتے ہیں' جمعہ کے روز وہ آ کر ہمیں عارفانہ کلام سنائے۔ جمعہ کے روز بلھے شاہ نے مغنیہ کا بھیس بدلا۔ ان کی آواز میں بلا کی تاثیر تھی۔ وہ فن

موسیقی کے ماہر تھے۔ پھر ان کے عشق و معرفت میں ڈوبے ہوئے اپنے اشعار۔ سبحان اللہ۔ آخر قوالوں کے ساتھ وہ مرشد کی محفل میں جا پہنچے۔ اب مقصود نظر سامنے تھا' جس کی خاطر انہوں نے دور دراز گوالیار کا سفر کیا تھا۔ اجازت ملتے ہی انہوں نے گانا شروع کیا۔

تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا
چھیتی بوہڑیں وے طبیبا
نئیں تے میں مرگیاں

پھر جب گاتے گاتے یہاں تک پہنچے

بلھے شاہ عنایت آئے میرے بوہے
شکر کیتا اج اوہ میرے ہوئے
میں بھل گیاں تیرے نال نہ گیاں
تیرے عشق نچایا کر تھیا تھیا

یہ شعر سنتے ہی مرشد نے نظر اوپر اٹھائی' فرمایا: تو بلھا ہے؟ عرض کیا نہیں بھولا ہوں یعنی مجھ سے بھول ہو گئی ہے۔ مرشد نے گلے سے لگا لیا اور فرمایا: معرفت حقیقی کی یہ دولت تم سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔

بلھے شاہؒ کا سارا کلام توحید باری تعالیٰ' فنا فی اللہ' وحدت الوجود' صلح پسندی' ریاکاری کی مخالفت اور دنیا کی ناپائیداری جیسے موضوعات پر مشتمل ہے۔ وہ شریعت پر عمل بہت ضروری سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کے بغیر طریقت پر عمل ممکن نہیں۔ اپنی ایک کافی میں فرماتے ہیں۔

شریعت ساڈی دائی اے
طریقت ساڈی مائی اے
اگوں حقیقت آئی اے
اتے معرفتوں کجھ پایا اے

پنجابی زبان کا یہ بے مثال شاعر اور جہان معرفت کا یہ باکمال انسان 1171ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ یہی سال وفات آپ کے لوح مزار پر درج ہے' لیکن ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے لکھا ہے کہ وہ 1181ھ کے بعد کسی سال میں فوت ہوئے کیونکہ ایک قلمی

نسخہ ملا ہے، جس میں اجازت نامہ پر ان کی مہر کے ساتھ 1181ھ کا سن درج ہے۔
اللہ تعالیٰ ان کی قبر مبارک پر ہر آن رحمتوں کی بارش برسائے
اب کہاں پیدا ہیں ایسی ہستیاں

حضرت شیخ حامد حسن قاری سہروردی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1166ھ / 1753ء)

شیخ حامد حسن قاری سہروردی کے والد ماجد کا اسم گرامی حسن تھا۔ صوفیائے پنجاب (از عبدالقدوس ہاشمی) میں ہے کہ شیخ حامد علوم ظاہری و باطنی، زہد و تقویٰ اور قرات تجوید میں پورے پنجاب میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت 1071ھ مطابق 1660ء میں عہد عالمگیر میں ہوئی۔

آپ نے سلسلہ سہروردیہ میں مولانا تیمور لاہوری کے دست حق پر بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ سلسلہ طریقت اس طرح ہے:

شیخ حامد" ، مولانا تیمور لاہوری" ، مولانا عبدالکریم" ، مخدوم طیب" ، شیخ برہان الدین" ، مخدوم چنن شیخ میلون" ، شیخ حسام الدین متقی ملتانی" ، شیخ صدر الدین عارف" ، شیخ بہاء الدین زکریا" ، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی" ، شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی" ، شیخ وجیہہ الدین" ، محمد بن عمویہ" ، احمد اسعود دینوری" ، حضرت جنید بغدادی" ، حضرت سری سقطی" ، حضرت معروف کرخی" ، حضرت داؤد طائی" ، حضرت امام علی موسیٰ رضا" ، حضرت خواجہ حسن بصری" ، حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ (بحوالہ مدینتہ الاولیاء)

آپ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور اپنے زمانے میں مرشد زمانہ اور استاد یگانہ تھے۔ حکام وقت آپ سے غایت درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ آپ سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ جس مقام پر آپ درس دیتے تھے، وہیں آپ کا مزار مبارک بنا۔ مسجد قدیم اب تک موجود ہے۔ جو آپ نے 1727ء میں بنوائی تھی، لیکن ریلوے ورکشاپس کے اندر آجانے کی وجہ سے غیر آباد ہے۔

آپ نے 95 سال کی عمر میں 17 جمادی الاخری 1166ھ مطابق 21 اپریل

1753ء میں وفات پائی۔

خزینۃ الاصفیاء میں آپ کی تاریخ وفات اس طرح درج ہے۔

حامد آں قاری قرآن عظیم
بود محبوب جناب ذوالمنن
"افضل اقطاب والا جاہ" گو

1071ھ

سال تولیدش باقوال ضمن
بہر تاریخ وصال آں جناب
گفت سرور "حافظ و حامد حسن"

1166ھ

آپ کا مزار مبارک مغلپورہ میں دیٹ مین روڈ پر ہے۔ آپ نے ایک تالیف "حرمت حقہ و تمباکو" بھی تحریر کی' "حدیقۃ الاولیاء" کے مولف کے مطابق آپ کے ایک مرید نے آپ کے ملفوظات اکٹھے کئے تھے۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں لاہور میں آپ ہی کا فتویٰ چلتا تھا۔

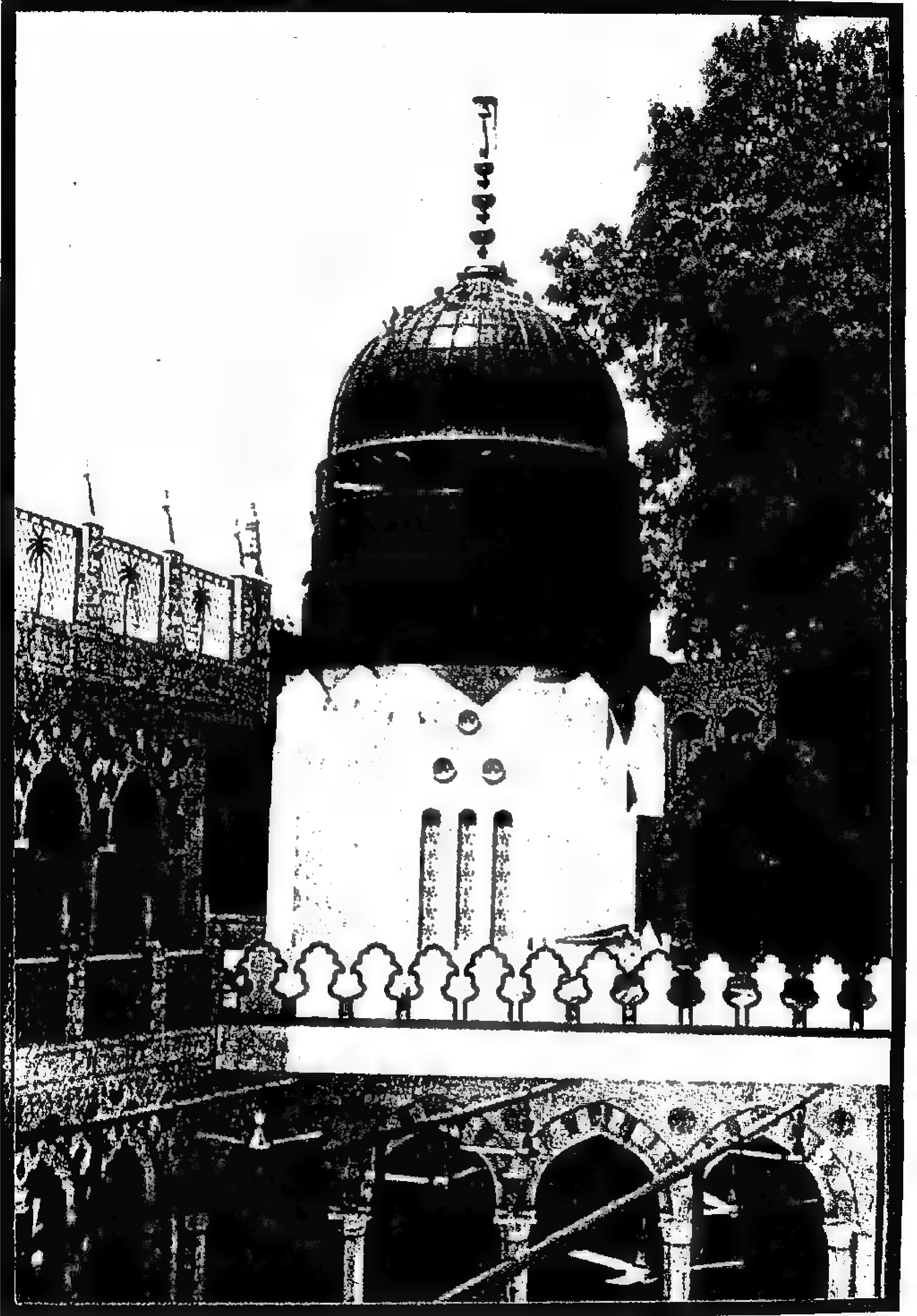
حضرت شاہ محمد غوث رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1173ھ/ 1759ء)

اسم گرامی محمد غوث' والد ماجد کا نام نامی ابوالبرکات سید حسن تھا۔ سلسلہ نسب سولہ پشتوں کے بعد حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی" سے' اور اٹھائیسویں پشت کے بعد امام الاولیاء حضرت سید علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت 1091ھ میں موضع سلطان پور (علاقہ بگرام پشاور) میں ہوئی۔

آپ کا خاندانی ماحول علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے معمور تھا۔ خاندان کا ہر فرد کتاب و سنت کی اطاعت میں مشغول رہتا تھا۔ سات برس کی عمر میں آپ نے والد ماجد کی نگرانی میں دینی تعلیم کا آغاز کیا اور اٹھارہ برس کی عمر میں تمام کتب متداولہ سے فارغ ہو گئے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے سلسلہ عالیہ قادریہ میں اپنے والد گرامی سے بیعت کی۔ خود تحریر فرماتے ہیں: "جب یہ فقیر اٹھارہ برس کی عمر میں علم کی تکمیل کر چکا تو اپنے والد گرامی سے معرفت کے راستے کی طلب کی۔ انہوں نے میری اس گزارش کو قبول کیا اور مجھے طریقہ عالیہ قادریہ میں بیعت کر کے ذکر اور اشغال کے طریقے عطا فرما کر خلوت میں بٹھا دیا۔ اس عرصے میں ذکر لسانی' ذکر جہر' ذکر خفی' ذکر قلبی اور مراقبات کو پورا کیا۔ جو کچھ میری استعداد کے مطابق تھا' وہ مجھے ملا۔ عجیب و غریب واقعات و حالات رونما ہوتے تو میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں عرض کرتا۔ جو بات صحیح ہوتی اس پر شاباش فرماتے' اور جس بات میں کچھ کمی رہ جاتی' اس کی اصلاح فرماتے۔" (قلمی نسخہ در کسب سلوک و بیان حقیقت و معرفت بحوالہ محدث کبیر حضرت شاہ محمد غوث" : مؤلفہ ڈاکٹر ام سلمہ گیلانی)

چھ برس کے بعد والد ماجد نے آپ کو منشور و خلافت سے نوازا۔ اسی سال یعنی



مزار حضرت شاہ محمد غوثؒ

بادشاہان وقت کی دولت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دو
اور نان جویں پر گزر بسر کرنا باعث فخر سمجھو۔

(حضرت شاہ محمد غوثؒ)

بروز جمعہ 21 ذی قعدہ 1115ھ میں آپ کے والد ماجد نے انتقال فرمایا۔

اس زمانے میں بخارا' افغانستان اور ترکستان علوم اسلامی کے مراکز تھے' والد صاحب کی وفات کے بعد آپ افغانستان چلے گئے' جہاں اخوند مولوی محمد نعیمؒ سے آپ نے توضیع و تلویح پڑھی۔ پھر آپ نے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور اور دہلی کے علماء و فضلاء سے کسب علوم کیا۔ علم حدیث کی اجازت آپ نے لاہور میں رہ کر حاصل کی۔

علوم سے فراغت کے بعد آپ نے پنجاب' ہندوستان' افغانستان اور کشمیر کا سفر اختیار فرمایا اور بڑے بڑے اکابر' مشائخ' صوفیاء' مجاذیب اور علماء سے ملاقاتیں کیں اور اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری دے کر فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے۔ اس سفر میں جن بزرگوں سے آپ نے استفادہ و استفاضہ کیا' ان کا ذکر مدینۃ الاولیاء کے مصنف نے اس طرح کیا ہے۔

پشاور

پشاور میں حافظ عبدالغفور کاشمیری نقشبندیؒ سے اکثر ملاقات رہی۔ پشاور کے قریب قصبہ لنڈی میں ایک مرتاض متقی بزرگ سے ملاقات کی۔

اٹک

پشاور سے اٹک گئے وہاں شیخ یحییٰؒ سے ملے جو ایک نہایت باکمال بزرگ تھے' چند روز ان کی خدمت میں بھی رہے۔ اٹک میں شاہ محمد فاضلؒ سے بھی صحبت رہی جو ایک نہایت صاحبِ تاثیر بزرگ تھے اس کے علاوہ شاہ زندہ فقیرؒ سے بھی ملاقات کی جو انتہائی عبادت گزار اور صاحب کشف و کرامت تھے۔

مضافاتِ اٹک

اٹک کے گرد و نواح میں ایک بزرگ میاں نور محمدؒ سے بھی اکتساب فیض فرمایا۔ پنڈی نزد اٹک میں شاہ لطیف مجذوبؒ کے پاس بھی رہے اور فیض حاصل کیا۔

محمود کامہ (نزد جلال آباد۔ کابل)

جب آپ یہاں گئے تو اخوند محمد نعیمؒ سے ملے جو علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے زمانہ تھے ان صاحب سے کتاب تلویح اور توضیح پڑھی۔

چپکلی نزد پشاور

یہاں شاہ حسین سے جو شافی المذہب تھے ملاقات رہی۔

پوٹھوہار

اس علاقہ میں شاہ چراغ قادریؒ سے ملاقات رہی۔

نوشہرہ (گجرات)

حضرت شیخ پیر محمد پچیار قادری نوشاہی سے ملاقات کی جنہوں نے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی۔ دوسری مرتبہ جب یہاں آئے تو حضرت شاہ عصمت اللہ صاحبؒ نوشاہی کی خدمت میں مقام ساہنپال پہنچے جو حضرت حاجی نوشہ گنج بخشؒ کے پوتے تھے خود اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ میں بارہ سال تک ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ جذبہ اور رقت قلب ان سے حاصل ہوا۔

کنجاہ

یہاں محمد جعفر صاحب سے ملاقات ہوئی۔

لاہور

حضرت شاہ محمد غوث قادری لکھتے ہیں کہ اس کے بعد لاہور میں جو کہ ایک پرانا شہر اور بزرگوں کا مسکن ہے اولیاء اللہ کے بعض مقبروں پر راتیں کاٹیں۔ حضرت میاں میرؒ قادری لاہوری کے مقبرہ پر رات قیام کیا۔ یہیں شیخ حامد درویش کی زیارت گاہ پر حاضر ہوا جو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار کے پاس ہی دفن ہیں۔ یہاں آپ نے میاں جان محمد محدث سے بھی ملاقات کی۔ آپ لاہور کے محلہ قصاب پورہ میں مقیم تھے۔ اس

کے بعد میاں نور محمد مدقق لاہوری کی خدمت میں ایک ماہ رہا جنہوں نے مجھے باطنی اشغال سکھائے۔ اس کے علاوہ لاہور میں آپ نے شیخ جان محمد ثانی جن کی قبر حضرت میاں وڈا سہروردی" کی چار دیواری میں ہے' سے بھی ملاقات کی۔ قیام لاہور کے زمانہ میں آپ نے شیخ جان محمد حضوری" سے بھی جن کا مرقد منور گڑھی شاہو میں ہے۔ ملاقات فرما کر روحانی فیض حاصل کیا تھا۔

شاہ جہاں آباد

اس شہر میں شیخ محمد چشتی سے چند مفید باتیں حاصل کیں۔ شیخ حکیم اللہ چشتی سے بھی ملاقات ہوئی ان کے علاوہ سید بھیک چشتی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ جب آپ اجمیر سے دہلی آئے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکی" چشتی اور دوسرے بزرگان کے مزارات پر حاضری دی۔

سرہند شریف

اس شہر میں حضرت مجدد الف ثانی" کے پوتوں میں ایک بزرگ صبغت اللہ" نقشبندی مجددی سے ملاقات کی اس کے بعد حضرت میاں عبدالاحد المشہور بہ میاں گل کی زیارت حاصل ہوئی۔ یہ بزرگ بھی امام ربانی کی اولاد سے تھے۔ یہ مجھ پر بہت مہربانی فرماتے اور اپنے دادا کے مقبرہ پر لے جا کر توجہ فرماتے۔

سیام چوراسی

یہ شہر دو آبہ میں واقع ہے۔ اس قصبہ میں شیخ عبدالغنی نقشبندیؒ سے ملاقات ہوئی۔ یہ بزرگ بہت کم گفتگو کرتے تھے۔

اکبر آباد

اس جگہ شاہ مشتاق مجذوب خادم شاہ مرتضیٰ سے ملا۔

اجمیر شریف

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری" کے مرقد منور پر حاضر ہوا۔

ورود لاہور

اپنے تصنیف کردہ رسالہ غوثیہ میں لکھتے ہیں کہ جب میں تلاش حق کے سلسلہ میں لاہور پہنچا تو حضرت میاں میرؒ کے مقبرہ میں کئی راتیں گزاریں۔ ایک رات حضرت میاں میرؒ ظاہر ہوئے اور میری طرف توجہ فرمائی۔ پھر اگلے روز آپ لاہور کے ایک قادری درویش شیخ حامد کی خدمت میں حاضر ہوئے جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے مرقد منور کے متصل رہائش پذیر تھے انہوں نے فرمایا کہ حضرت میاں میرؒ نے جو شغل آپ کو عطا فرمایا ہے وہی کافی ہے۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد حکومت میں آپ لاہور میں اقامت گزیں ہوئے۔ اس دوران آپ کے اہل وعیال بھی یہاں آ گئے۔ کتاب "بزرگان لاہور" میں مرقوم ہے کہ لاہور میں بہت سے لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ آپ کے معتقد لاہور سے پشاور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

نادر شاہ ایرانی کی حاضری

آپ کے ایک ہم نام بزرگ جو آپ کے مرید بھی تھے پشاور میں رہتے تھے۔ جب نادر شاہ ایرانی نے کابل پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا اور پشاور پہنچا تو ان سے دعا و استمداد کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا' حضرت شاہ محمد غوث لاہوریؒ کی طرف رجوع کرو۔ اس نے آپ کو پشاور بلا بھیجا۔ آپ نے جواب لکھ بھیجا کہ ہمارے پیروں کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ بادشاہوں کے پاس جائیں اور ان کی مدد کریں۔ اللہ ہی مددگار کافی ہے۔ نادر شاہ یہ جواب پا کر بڑا برہم ہوا اور کہا: اچھا لاہور پہنچ لوں تو اس گستاخی کا مزا معلوم ہو جائے گا۔ جب پشاور سے کوچ کیا تو راستے میں ایک ندی کی طغیانی نے ایسا راستہ روکا کہ اس کو عبور کرنا دشوار ہو گیا۔ کئی روز انتظار کیا' مگر طغیانی کسی طرح کم نہ ہوئی بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ آخر پریشان ہو کر شاہ محمد غوث پشاوری سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے جواب بھیجا: یہ طغیانی تمہارے اس ارادۂ بد کا نتیجہ ہے جو تم نے حضرت شاہ محمد غوث لاہوریؒ کی نسبت کیا ہے۔ یہ سن کر وہ تائب ہوا اور لاہور پہنچ کر عقیدت و خلوص کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معذرت چاہی۔

کتاب "محدث کبیر حضرت شاہ محمد غوث" کی فاضل مؤلفہ ام سلمہ گیلانی نے

تحقیق کے بعد آپ کی تاریخ وفات 1173ھ (مطابق 1759ء) لکھی ہے۔

آپ کے تذکروں میں آپ کی جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

(1) جواز ذکر جہر (قلمی)

(2) رسالہ اسرار التوحید (قلمی)

(3) رسالہ در کسب سلوک و بیان حقیقت و معرفت (قلمی) مدینۃ الاولیاء کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا دوسرا نام رسالہ غوثیہ ہے۔

(4) شرح صحیح بخاری (شرح غوثیہ)

(5) شرح قصیدہ غوثیہ

آپ کے چار فرزند تھے۔

(1) سید میر محمد عابد شاہ

(2) سید میر شاکر شاہ

(3) سید شاہ میر

(4) سید میر باقر شاہ

یہ چاروں فرزند آپ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے علاوہ خلفاء میں حافظ محمد سعید، حافظ محمد صدیق، محمد غوث، شیخ وجیہہ الدین المعروف پیر زہدی لاہوری زیادہ معروف ہیں۔

حضرت شیخ عبداللہ شاہ بلوچ قادری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1212ھ/ 1797ء)

ایک ہندو کو کسی نے بتایا کہ مسلمان فقراء کو کیمیا سازی کا علم ہوتا ہے۔ جس شخص کو یہ علم سکھا دیں' اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ یہ ہندو بڑا لالچی تھا۔ پیسے پیسے پر جان دینے والا۔ آخر کیمیا سازی کے شوق میں ایک صوفی درویش کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: باباجی! میں علم کیمیا کا شائق ہوں۔ اس راہ میں بڑی محنت اور روپیہ صرف کر چکا ہوں۔ لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائیں۔

صوفی درویش نے فرمایا: لالہ جی! میرے پاس تو وہ علم ہے کہ اگر آپ اسے جان جائیں تو جس چیز پر بھی نظر ڈالیں گے' وہ سونا بن جائے گی۔ لالہ بولا: باباجی! فی الحال تو میں کیمیاگری کا علم سیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ جس علم کی بات کر رہے ہیں' وہ بعد میں سیکھ لوں گا۔

یہ سن کر درویش نے کہا: اچھا تو جاؤ' بازار سے کچھ تانبے کے پیسے' سم الفار اور گندھک لے آؤ۔ ہندو لالہ بھاگا بھاگا بازار گیا اور جھٹ یہ چیزیں لے آیا۔ بزرگ نے ایک مرید سے کہا کہ جس پیالے میں' میں کھانا کھاتا ہوں' وہ لے آؤ' وہ پیالہ لے آیا' تو فرمایا: دس پیسے' سم الفار اور گندھک ڈال دو۔ پھر اس کے اوپر کوئلے ڈلوا کر آگ لگوا دی۔ کچھ دیر کے بعد درویش نے لالہ سے فرمایا: چمٹے سے ایک پیسہ باہر نکالو۔ اس نے پیسہ باہر نکلا تو اس پر ایک سیاہ پردہ سا تھا۔ درویش نے کہا: اس پیسے پر اینٹ کی ایک دو ضربیں لگاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا تو اس سے اوپر کا سیاہ پردہ الگ ہو گیا اور نیچے سے جگمگ جگمگ کرتا زر خالص نکل آیا۔

لالہ نے یہ دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں لیکن چند لمحے حضرت کی

خدمت میں رہنے سے اب اس کے دل کی کیفیت تبدیل ہو چکی تھی۔ بولا: یا حضرت! مجھے تو وہ علم سکھا دیجئے کہ علم جاننے والا جس شے پر بھی نظر ڈالے وہ سونا بن جائے۔ پھر لالہ نے بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور مسلمان ہو کر درویش کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔

کیمیا گری کے شوقین اس ہندو لالہ پر نگاہ کیمیا اثر ڈالنے والے یہ بزرگ حضرت شیخ عبداللہ شاہ بلوچ تھے۔ جو لاہور کے موضع مزنگ میں کوٹ عبداللہ شاہ میں رہتے تھے اور اپنے علم و عمل' زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں ممتاز تھے۔ خزینۃ الاصفیاء اور کئی دوسری کتابوں میں یہ روایت درج ہے اور لکھا ہے کہ یہ کوٹ عبداللہ خود انہی بزرگ نے بسایا تھا اور انہی کے نام سے مشہور تھا۔

ابتدا میں حضرت عبداللہ شاہ بلوچ کا پیشہ ساربانی تھا۔ بہت مالدار آدمی تھے اور تعمیرات سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ لاہور میں کئی بستیاں اور قلعے انہوں نے تعمیر کئے لیکن جب شیخ شرف الدین قادری پانی پتیؒ کے مرید ہوئے تو فکر کا رخ دنیا کے بجائے آخرت کی طرف مڑ گیا۔ سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔

آپ کا سلسلہ طریقت چار واسطوں سے حضرت میاں میر لاہوری رحمتہ اللہ علیہ سے مل جاتا ہے۔ تکمیل سلوک کے بعد مرشد کے حکم کے مطابق کوٹ عبداللہ شاہ (مزنگ) میں لوگوں کی ظاہری و باطنی تہذیب و تربیت میں مشغول ہو گئے۔ یہیں آپ تمام عمر درس و تدریس اور ہدایت خلق میں مصروف رہے اور ایک خلق کثیر کو اپنے علمی و روحانی فیوض و برکات سے مستفیض فرمایا۔

آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں' خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ ایک دنیا دار صوفی نے عمل سے ایک جن کو مسخر کر لیا۔ وہ جن کو زمین کے نیچے چھپا دیتا اور جو چاہتا اس سے کہلواتا۔ لوگوں میں اس کی اس شعبدہ بازی کا بہت چرچا ہوا۔ بے شمار خلقت کو اس نے گمراہ کر کے اپنے پیچھے لگا لیا۔ ایک روز یہ شخص حضرت شیخ شاہ عبداللہ بلوچؒ کے پاس آیا اور کہا تم نے بہت خلقت کو اپنا مرید بنا لیا ہے اور مشیخت کی دوکان خوب گرم کر رکھی ہے۔ اگر مجھے کچھ مال دو' تو میں خاموش رہوں گا' ورنہ تیری اس شہرت کو ختم کر کے رکھ دوں گا۔ شیخ عبداللہ شاہ یہ بات سن کر مسکرائے اور اپنے مرید خاص شیخ فیض کو حکم دیا کہ اسے دس روپے دے کر رخصت کر دو۔ مرید نے تعمیل ارشاد کی' لیکن وہ دنیا دار صوفی

بولا: یہ تو بہت کم ہیں۔ پھر وہ زبان درازی پر اتر آیا اور براہ راست شیخ عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا: اگر تجھ کو فقیری کا دعویٰ ہے تو کوئی کرامت دکھا' یا پھر میری کرامت دیکھ کر اور میرا مرید ہو جا۔ میں سو سال کے مردے کو گویا کر سکتا ہوں اور مسیحائی کی یہ کرامت مجھ سے کئی بار ظاہر ہو چکی ہے۔ جب کافی سمجھانے سے بھی وہ شخص باز نہ آیا' تو شیخ عبداللہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: اچھا دکھاؤ اپنی کرامت۔ میرے ساتھ قبرستان چلو۔

شیخ عبداللہ اسے قبرستان میانی صاحب لے گئے۔ خلقت کا ایک ہجوم ان کے ساتھ تھا' جو تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا تھا۔ حضرت شیخ نے ایک قبر پر نشان لگا کر کہا کہ اس قبر کے مردے کو حکم دو کہ وہ بولے اور اپنا حال بتائے۔ اگر مردہ نے اپنا حال بتایا' تو میں تمہارا مرید ہو جاؤں گا۔ شعبدہ باز قبر کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور پکار کر کہا: یاسین! جواب میں قبر سے آواز آئی: والقرآن الحکیم۔

اس پر شعبدہ باز نے حضرت شیخ سے کہا: دیکھ لو' قبر کا مردہ زندہ ہو گیا ہے۔ اب تم اس سے جو پوچھنا چاہتے ہو' پوچھ لو۔ یہ تمہاری ہر بات کا جواب دے گا۔

یہ سن کر حضرت شیخ عبداللہ نے اپنا پاؤں زمین پر مارا اور فرمایا کہ جس شخص کو اس شعبدہ باز نے زمین میں داخل کیا ہے' وہ اللہ کے حکم سے باہر نکل آئے۔ اسی وقت ایک چودہ سالہ لڑکا زمین سے نکل کر سامنے آن کھڑا ہوا۔ شیخ نے پوچھا: تم کون ہو؟ بولا: یا حضرت! میں کویت کا رہنے والا ہوں۔ میرا تعلق جنوں کی قوم سے ہے۔ گزشتہ ایک برس سے اس شخص کی قید میں ہوں۔ اس کے حکم کے مطابق زمین کے اندر چلا جاتا ہوں' اور جو کچھ یہ کہتا ہے' وہی کلام کرتا ہوں۔

شیخ عبداللہ شاہ نے فرمایا: تم فکر نہ کرو۔ میں نے اس بدعمل شخص کا عمل باطل کر دیا ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ یہ سن کر جن نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور غائب ہو گیا۔

اب حضرت عبداللہ شاہ نے بلند آواز سے فرمایا: یٰسٓ۔ اس پر سارے قبرستان سے آواز آئی۔ والقرآن الحکیم۔ اس کے بعد حضرت نے اس بدباطن نام نہاد صوفی سے کہا: تم جس صاحب قبر سے چاہو' اس کا حال پوچھ لو۔ یہ دیکھ کر وہ شخص سخت شرمندہ ہوا' قدموں میں گر پڑا اور توبہ کر کے حضرت کا مرید ہو گیا۔

حضرت کے نامور خلفاء

آپ کے نامور خلفاء میں حضرت امام غلام محمد (المشہور امام گاموں) امام مسجد وزیر خاں لاہور' حضرت حافظ اللہ یار پشاوری (جن کو آپ نے ایمائے ربانی سے خود پشاور جا کر مرید کیا تھا) اور حضرت شیخ فیض بخش قریشی بہت مشہور ہیں۔

حضرت شیخ عبداللہ شاہ بلوچ 7 جمادی الاول 1212ھ مطابق 1797ء میں فوت ہوئے۔ اس وقت عمر مبارک 80 برس تھی۔ آپ کا مقبرہ مزنگ محلہ چاہ جنڈی میں زیارت گاہ خلق ہے۔ موجودہ گنبد مزار سردار خاں بلوچ نمبردار مزنگ نے 1275ھ مطابق 1858ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس نے مزار کے قریب ایک وسیع مسجد بھی بنوائی۔ اس کا ارادہ چار مینار بنوانے کا تھا' لیکن دو مینار تعمیر ہوئے تھے کہ وہ فوت ہو گیا۔

حضرت شیخ عبداللہ شاہ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ پنجابی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے۔ آج بھی اکثر لوگوں کو آپ کے پنجابی اشعار یاد ہیں۔ شیخ عبداللہ شاہ بلوچ نے سہ حاکمان لاہور (گوجر سنگھ' لہنا سنگھ' سوبھا سنگھ) کے عہد میں بہت عروج پایا۔ سردار گوجر سنگھ (جو ایک حصہ لاہور کا حاکم تھا) آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس کے عہد میں آپ نے قلعہ گوجر سنگھ اور قلعہ غوث متصل کو بھرپور تعمیر کرائے' نیز کئی نئی آبادیاں مثلاً کوٹ عبداللہ شاہ' نواں کوٹ' نیاز بیگ وغیرہ آباد کر کے بسائیں۔

آپ کا شمار ممتاز ترین رؤسائے لاہور میں ہوتا تھا۔ لیکن جب جاذب حقیقی نے انہیں اپنی طرف کھینچا تو سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا اور ولیوں کے اس گروہ میں شامل ہو گئے جن کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ لاخوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

خزینۃ الاصفیاء میں آپ کا قطعہ تاریخ وفات اس طرح تحریر ہے:

چو عبداللہ شاہ مرد عجیب
شد ز دنیا بسوئے دوست قریب
جستم از دل چو سال تاریخش
گفت ہاتف بگوش ہوش: "غریب"

1212ھ

حضرت سید فرید الدین شیرازی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1284ھ/1867ء)

تیرھویں صدی ہجری اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان میں انگریز تیزی کے ساتھ اپنے قدم مضبوط بنا چکے تھے۔ ان حالات میں لاہور میں ایک درویش خدامست اپنی چشم بصیرت سے مستقبل کے تمام فتنوں کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فرنگی اقتدار کی یہ آندھی جو تیزی کے ساتھ مغرب سے آئی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا۔ طویل غور و فکر کے بعد بالآخر یہ درویش اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمانوں کو درس نظامی کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہئے تاکہ مسلمان ہندوستان میں دنیاوی ترقی کے معاملے میں ہندوؤں سے پیچھے نہ رہ جائیں کیونکہ اس طرح وہ انگریزوں کی غلامی کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر ہندوؤں کے بھی دست نگر بن جائیں گے۔ اس لئے کہ انگریزوں کے ہندوستان میں آتے ہی ہندوؤں نے ان کی کاسہ لیسی شروع کر دی تھی اور سرکاری ملازمتوں میں بھرتی ہونے لگے تھے۔ اپنی اسی فکر اور بصیرت کے مطابق اس مرد درویش نے اپنی ہمت کے مطابق کئی مدارس قائم کئے' جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم پڑھانے کا بھی بندوبست تھا۔

اس دور اندیش صوفی بزرگ کا نام نامی سید فرید الدین" تھا جو یکم ربیع الاول بروز جمعہ 1201ھ مطابق 22 دسمبر 1786ء شیرازی (ایران) میں پیدا ہوا۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید معزالدین تھا' جو بڑے نیک اور پارسا بزرگ تھے۔ سید فرید الدین نے تمام دینی علوم اپنے والد ہی سے پڑھے۔

سید فرید الدین کا ابھی لڑکپن تھا کہ ان کے والد ماجد سید معزالدین کو کسی وجہ سے

ایران سے ہجرت کرنا پڑی اور وہ مشہد سے ہوتے ہوئے قریہ بہ قریہ تکلیفیں سہتے پنجاب میں وارد ہوئے۔ اس وقت پنجاب میں سکھ گردی کا دور تھا اور ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

سید فرید الدین پنجاب میں آئے تو سب سے پہلے درگاہ حضرت داتا گنج بخش" میں چلہ کش ہوئے۔ وہاں سے فیض حاصل کرکے آپ اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی" کے مزار پرانوار پر حاضر ہوئے' پھر پاک پتن میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر" کے آستانہ پر کچھ روز قیام کے بعد آپ دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے دربار میں پہنچے اور عرض کی کہ راہ سلوک کے لئے مرشد کامل کا متلاشی ہوں۔ یہاں سے روحانی اشارہ پانے کے بعد آپ حضرت شاہ غلام علی دہلوی" کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور وہاں حضرت شاہ عبدالرشید" کے دست حق پرست پر بیعت کرلی۔

پنجاب میں آنے کے بعد آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل کرلی تھی نیز ہندی اور سنسکرت زبانوں پر بھی خوب دسترس حاصل کرلی تھی کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ تبلیغ اسلام کے لئے یہاں کی مقامی زبانوں کا جاننا ازبس ضروری ہے۔ لاہور میں آپ نے مزنگ کے علاقہ میں قیام فرمایا اور یہیں مسجد ابواسحاق میں ایک مدرسہ قائم کرکے درس وتدریس کا آغاز کیا۔

جب آپ کے مدرسہ کی شہرت دور پہنچی اور حصول تعلیم کے لئے طلبہ بڑی تعداد میں آنے لگے تو مہارانی جنداں نے (جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کی والدہ تھی) آپ کو طلب کیا اور کہا کہ آپ کے مدرسہ میں بہت رونق ہے۔ حصول تعلیم کے لئے طلبہ دور دور سے آتے ہیں' میری خواہش ہے کہ آپ کے مدرسہ کے تمام تر اخراجات میں اپنے ذمہ لوں' تاکہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ لیکن حضرت فرید الدین نے شکریہ کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ فقیر کے تمام اخراجات اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے پورے فرماتا ہے' انہیں مزید کسی اعانت کی ضرورت نہیں۔ اس غیر متوقع انکار پر مہارانی جنداں بگڑ گئی اور آپ کے درپے آزاد رہنے لگی۔ اس دوران بعض مخلص اصحاب نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ مہارانی کی بات مان لیں' لیکن آپ نے فرمایا کہ دینی مدارس سرکاری اخراجات سے نہیں چلا کرتے' سرکاری امداد قبول کرنے سے کئی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس کے ذریعے سرکار اپنی کئی باتوں کو زبردستی منوانے کی کوشش کرتی ہے

جبکہ اللہ تعالیٰ کے تمام کام اسی پر توکل سے ہونے چاہئیں۔ پھر آپ نے اپنے ان ساتھیوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ مہارانی جنداں کی ان تکالیف کا سلسلہ بہت جلد ختم ہونے والا ہے اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد سکھوں کی بادشاہی ختم ہوگئی اور ان کی جگہ انگریز حکمرانوں نے سنبھالی۔

لاہور میں چونکہ آپ کی علمی حیثیت بہت ممتاز تھی' اس لئے انگریزوں نے یہاں قابض ہونے کے بعد آپ سے درخواست کی کہ آپ صیغۂ عدالت میں خدمات انجام دیں' لیکن اپ نے انکار کردیا۔ جب انہوں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے عدالت میں اسلامی شریعت کے مطابق صرف مشورہ دینے کا فریضہ قبول فرمایا' لیکن اس کے لئے آپ کوئی مشاہرہ نہیں لیتے تھے۔

اس زمانے میں لاہور اسلامی تعلیمات کا مرکز تھا۔ انگریزوں کی عملداری کا سلسلہ شروع ہوا تو انگلستان سے دھڑا دھڑ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پادری آنا شروع ہوئے۔ یہ عیسائی پادری لاہور میں جگہ جگہ عوام کو اکٹھا کرتے اور پھر ان کے سامنے عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مکتی فوج کے نام سے ایک مستقل تبلیغی ادارہ قائم کیا جس کا ہیڈکوارٹر کوئنز روڈ (شارع فاطمہ جناح) پر تھا۔ اس نازک وقت میں لاہور کے جن غیرت مند اور اہل علم مسلمان بزرگوں نے اپنے آپ کو تحفظ اسلام کے لئے وقف کیا' ان میں حضرت سید فرید الدین کا نام نامی بھی بڑا اہم ہے۔ مزنگ اور اس کے نواح میں جب مکتی فوج کے کوئی عیسائی پادری آتے' تو آپ کا تعاقب کرتے۔ ایک روز آپ نے مکتی فوج کے ہیڈ کوارٹر میں اطلاع بھجوائی کہ عیسائی پادری اپنے ساتھیوں سمیت جہاں چاہیں کھلے بندوں ان سے مناظرہ کرلیں اگر عیسائی پادری اسلام کو (نعوذباللہ) جھوٹا ثابت کردیں تو وہ اپنے تمام ارادت مندوں سمیت عیسائیت قبول کرلیں گے' لیکن اگر ہم اسلام کو آخری اور سچا مذہب ثابت کردیں' تو عیسائی پادری اور ان کے تمام ساتھیوں کو اسلام قبول کرنا ہوگا۔ پادریوں نے یہ بات مان لی۔ اس مناظرے کے لئے وقت اور دن طے ہوگیا اور کنک منڈی مزنگ کا علاقہ مناظرہ کی جگہ طے ہوئی وقتِ مقررہ پر حضرت سید فرید الدین اپنے مریدوں سمیت کنک منڈی میں پہنچ گئے دوسری طرف عیسائی پادری بھی اپنے بے شمار علماء کے ساتھ وہاں جمع ہوگئے۔ پنڈال میں تمام مذاہب کے لوگ جمع تھے۔ حضرت فرید الدین نے زبردست دلائل کے ساتھ ثابت کردیا کہ حضور اکرم ﷺ نبی

آخر الزماں ہیں' ان کی بعثت کے بعد اب کسی دوسرے دین کی ضرورت نہیں۔ عیسائی پادری ان دلائل کا جواب نہ دے سکے۔ پنڈال میں موجود لوگوں نے کہا کہ معاہدہ کے مطابق عیسائی پادری اور ان کے ساتھی اسلام قبول کریں۔ لیکن تمام عیسائی پادری بھاگ کھڑے ہوئے' البتہ جاتے جاتے یہ کہہ گئے کہ ہم آئندہ کبھی مزنگ کے علاقہ میں تبلیغ کی غرض سے داخل نہ ہوں گے۔

حضرت فرید الدینؒ تبلیغ اسلام کی غرض سے اور مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کی خاطر اکثر لاہور کے نواحی دیہات کا دورہ فرماتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ جہاں بھی جاتے عموماً اپنے کسی مرید کے ہاں قیام فرماتے۔ ایک دفعہ وہ ہربنس پورہ کے علاقہ میں گئے۔ وہاں ایک مرید کے مکان پر فروکش تھے کہ اس دوران انہیں معلوم ہوا کہ وہ جس مرید کے ہاں ٹھہرے ہیں وہ آج کل غربت کے ہاتھوں سخت تنگ ہے اور اس نے حضرت اور ان کے ساتھیوں کے لئے کھانے پینے کا انتظام بھی ایک ہندو بنئے کے پاس اپنے گھر کے برتن گروی رکھ کر اور اس سے رقم حاصل کرکے کیا ہے۔ اس انکشاف نے حضرت کو بہت پریشان کیا اور آپ نے عہد کیا کہ آئندہ کسی مرید کے ہاں قیام نہیں کریں گے' بلکہ تبلیغی سفر کے دوران ہمیشہ کسی مسجد میں قیام کریں گے۔ پھر آپ نے ہندو بنئے کو پیسے دے کر اس مرید کے تمام برتن واپس منگوائے اور اس غریب مرید کو سود در سود کی مصیبت سے نجات دلائی۔ پھر اپنے خلفاء سے بھی عہد لیا کہ وہ سفر کے دوران کبھی کسی مرید کے ہاں قیام نہ کریں گے' نہ کسی مرید سے کوئی نذرانہ قبول کریں گے۔

مضمون کے آغاز میں حضرت کی تعلیمی سرگرمیوں کا اشارۃً ذکر ہوچکا ہے۔ آپ کے حالات میں (جو آپ کے روضہ کے سجادہ نشین سید افتخار علی شاہ نے شائع کئے ہیں) لکھا ہے کہ جب انگریزوں نے برصغیر میں اچھی طرح قدم جمالئے اور انگریزی تعلیم کے لئے جگہ جگہ سکول قائم کردیئے تو آپ نے لاہور کے چند اہل علم حضرات کو مسجد بوکن خاں (اندرون موچی گیٹ لاہور) میں مشورے کے لئے بلایا اور ان کے سامنے تجویز پیش کی کہ انگریزوں کی حکمت عملی سے نبٹنے کے لئے ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو انگریزی پڑھانی چاہئے۔ اس تجویز سے بعض روشن خیال ساتھیوں نے اتفاق کیا چنانچہ اس مقصد کے لئے آپ نے کناری بازار (اندرون شہر لاہور) اور کئی دوسرے مقامات پر دینی مدارس قائم کئے جن میں درس نظامی کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔

حضرت سید فریدالدین فارسی کے لغز گو شاعر تھے۔ 1278ھ میں جب نور محمد سادھو نے حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار مبارک پر گنبد تعمیر کروایا تو آپ نے اس کا تاریخی قطعہ لکھا۔

نور محمد چو بنائے نونہادہ
مقبرۂ مکرم مرحوم ما
گفت فرید ازپئے تاریخ او
مقبرۂ منعم مخدوم ما

اس طرح جب مسجد بوکن خاں (دھل محلّہ موچی گیٹ لاہور) کی دوبارہ تعمیر مکمل ہوئی تو آپ نے اس کی تعمیر نو پر بھی قطعہ تاریخ لکھا جو آج بھی ایک سنگ مرمر پر مسجد کے دروازے پر لگا ہوا موجود ہے۔ اس طرح بعض دوسرے مقامات پر بھی آپ کے لکھے ہوئے قطعات تاریخ موجود ہیں۔ آپ کے علمی کاموں میں حضرت شاہ محمد غوثؒ کی تصنیف "رسالہ غوثیہ" کی شرح بھی ہے۔ اس شرح سے آپ کے تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت کا وصال 17 ربیع الاول 1284ھ (مطابق 20 جولائی 1867ء) کو ہوا مزار مبارک عطاء اللہ سٹریٹ مزنگ میں مرجع خلائق ہے۔

آپ کے اقوال وارشادات

1۔ اللہ سے زیادہ نزدیک وہ ہے جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہے۔
2۔ ہر شخص کو سلام میں پہل کرو مگر کسی سے سلام کی امید نہ رکھو
3۔ دنیا میں پھل دینے والے عمل کا حصہ آخرت میں نہیں ہے
4۔ دنیا کی طرف رغبت اللہ تعالیٰ سے غافل کردیتی ہے۔
5۔ دنیا کو محبوب رکھنے والے کو نجات نصیب نہیں ہوتی۔
6۔ لالچ سے ذلت اور قناعت سے عزت ملتی ہے۔
7۔ خوف الٰہی سے عاری دل محض ایک ویرانہ ہے
8۔ مسلمان کو اپنا مال راہ حق میں خرچ کرنا چاہیئے

9۔ فقیر کے پاس سوائے اللہ تعالیٰ کے کچھ نہیں ہوتا۔
10۔ دوسروں کو دینا بہترین عمل ہے۔
11۔ جہاں تک ہو سکے مخلوق کی خدمت کرو۔
12۔ بخیل کو دیکھنے سے دل سخت ہوتا ہے۔
13۔ منافقت بُرے انجام تک پہنچا دیتی ہے۔
14۔ دل کی بات برملا کہہ دینا صدق کی علامت ہے۔
15۔ خوشامد سے فتنہ بڑھتا ہے' لہٰذا اس سے کنارہ کش رہو۔

مناظر اسلام حضرت حافظ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1296ھ / 1879ء)

انیسویں صدی کے آغاز میں جب پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہوا تو خطہ کشمیر خاص طور پر ان کے ظلم کا نشانہ بنا۔ اس صورت حال کے پیش نظر کشمیری مسلمان وہاں سے ہجرت پر مجبور ہوگئے۔ مہاجرین کے ان قافلوں میں حضرت حافظ ولی اللہ کا خاندان بھی تھا' جو لاہور آکر پناہ گزین ہوا۔

حافظ صاحب کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا' لیکن کشمیر کی سیاسی ابتری کی وجہ سے ان کا یہ شوق تشنہ رہا۔ اس وقت ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ ان کے والد کا خیال تھا کہ وہ لاہور میں انہیں دینی تعلیم دلائیں گے' لیکن اتفاق دیکھئے کہ لاہور پہنچتے ہی وہ ایسے بیمار ہوئے کہ ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی زائل ہوگئی۔ آخر وہ حفظ قرآن کے لئے ایک مکتب میں بٹھا دیئے گئے' جہاں انہوں نے چند ماہ میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔

بینائی سے محروم ہوجانے کے بعد ان کا حافظہ مثالی تھا' جس بات کو ایک بار سن لیتے ہمیشہ یاد رکھتے۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد انہوں نے ابتدا۔ی دینی کتابیں سن کر یاد کرنا شروع کردیں۔ اس دوران ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی کے سپرد ہوئی' لیکن بدقسمتی سے ان کی بھاوج بہت ہی بدمزاج اور سنگدل عورت تھی۔ اس نے حافظ صاحب پر سوتیلی ماں سے بڑھ کر ستم ڈھانے شروع کئے۔ اس ناروا سلوک سے تنگ آکر آخر ایک روز حافظ صاحب گھر سے بھاگ نکلے اور سیدھے قلعہ میہاں سنگھ میں مولانا غلام رسول کے پاس جا پہنچے' جو بڑے اجل عالم اور دیندار بزرگ تھے۔ ان کے حلقہ درس میں شامل ہوکر حافظ صاحب نے علم دین پڑھنا شروع کیا' حافظہ بلا

کا تھا جو بات ایک مرتبہ سن لیتے تھے' وہ ذہن سے محو نہ ہوتی تھی مولانا غلام رسول کی خدمت میں رہ کر انہوں نے تفسیر' حدیث اور فقہ کی تمام کتب ازبر کرلیں۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو آپ کا شمار بہت بڑے مناظروں میں ہونے لگا۔

حافظ صاحب کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کے حافظہ کا یہ حال تھا کہ کوئی ملنے والا سالہاسال کی غیر حاضری کے بعد ملتا' تو آواز سے اسے پہچان لیتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کسی سے مصافحہ کرتے تو ہاتھ کے لمس سے پہچان لیتے کہ یہ فلاں شخص کا ہاتھ ہے۔

ان دنوں لاہور میں مولوی نور احمد اور مولوی احمد دین بگوی کا بڑا شہرہ تھا۔ لاہور آکر آپ ان کے درس میں بھی شریک ہوئے اور ظاہری علوم سے مالامال ہونے کے ساتھ باطنی نعمت سے بھی سرفراز ہوئے۔

حافظ صاحب 1835ء میں کشمیر میں پیدا ہوئے تھے 1849ء میں جب پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آیا' تو اس وقت ان کی عمر 14 برس کی تھی اور وہ قلعہ میہاں سنگھ میں طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر لاہور آئے تو دیکھا کہ انگریز پادری کھلے بندوں عیسائیت کا چرچا اور اسلام پر رکیک حملے کر رہے ہیں یہ صورت حال دیکھ کر ان کی غیرت ایمانی کو جوش آیا اور وہ حفاظت اسلام کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

اسی زمانے میں انہوں نے انجیل حفظ کی اور عیسائی پادریوں سے مناظرے شروع کئے۔ عیسائی پادریوں کو وہ انہی کی کتابوں سے حوالے دے کر لاجواب کر دیا کرتے تھے۔

مولانا علم الدین سالک مرحوم نے ایک دفعہ راقم الحروف کو بتایا تھا کہ جب پنجاب انگریز کے قبضے میں آیا تو عیسائی پادریوں کو گویا عیسائیت کے پرچار کی کھلی چھٹی مل گئی۔ بڑے بڑے پادری لوگوں کے دین وایمان پر ڈاکے ڈالنے کیلئے پنجاب چلے آئے۔ پولیس ہر جگہ ان کی حفاظت کرتی تھی۔ ان پادریوں میں پادری فورمین' پادری فنڈر اور پادری عماد الدین خاص شہرت اور خاص مقام کے حامل تھے۔ بڑے بڑے مناظران سے گفتگو کرتے ہوئے گھبراتے تھے' لیکن حضرت حافظ صاحب نے تحریری اور تقریری مناظروں میں ان سب کو شکست فاش دی۔

استاذی مولانا مظہر میرٹھیؒ نے ایک بار مجھے بتایا کہ حافظ صاحب کے تبلیغ اسلام کا

طریقہ یہ تھا کہ ڈاکٹر فورمین (جس کے نام پر لاہور میں دو مشہور درسگاہیں فورمین کرسچین کالج اور فورمین مشن سکول رنگ محل موجود ہیں) لاہور کے جن چوراہوں پر میز کرسی لگا کر عیسائیت کا پرچار کرتا' وہیں اس کی میز کرسی کے عین مقابل حافظ صاحب اپنا اسلامی اکھاڑہ جماتے اور لوگوں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ کرتے۔ اس دوران ڈاکٹر فورمین سے مناظرہ بھی ہوجاتا' لیکن حافظ صاحب کے علمی مقام و مرتبہ کے باعث وہ جلد ہی بھاگنے پر مجبور ہوجاتا۔

حافظ صاحب کے پاس ہر روز بے شمار خطوط آتے تھے' جن میں عیسائیت کے بارے میں مختلف سوالات مندرج ہوتے اور حافظ صاحب سے ان کے بارے میں پوچھا جاتا۔ حافظ صاحب ایسے تمام خطوط کے جوابات بڑی احتیاط سے لکھواتے۔ اس سلسلے میں ان کے شاگرد مولانا فقیر محمد جہلمی (صاحب حدائق الحنفیہ) ان کے خصوصی معاون تھے۔ مولانا جہلمی خود لکھتے ہیں کہ جب میں دہلی سے فارغ التحصیل ہوکر آیا تو حضرت حافظ ولی اللہ کی ڈاک اور دیگر سوالات کے جوابات کی املا لینا میرے ذمہ تھا۔ حافظ صاحب مسئلہ سن کر جواب لکھوا دیتے اور ساتھ ساتھ کتابوں کے حوالے بھی لکھواتے جاتے۔ بعض اوقات مجھے شک گزرتا اور میں یہ کتابیں دیکھتا تو سطر بہ سطر عبارات صحیح ہوتیں۔ مولانا فقیر محمد کا کہنا ہے کہ مجھے آپ کی صحبت میں رہ کر عیسائیت کے خلاف اتنا مواد مل گیا کہ میں ردعیسائیت میں کئی ایک کتابیں لکھنے کے قابل ہوگیا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی ؒ نے (جو خود بہت بڑے مناظر تھے اور بعض سیاسی وجوہ کی بناپر ہندوستان سے ہجرت کرکے مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے) جب مکہ مکرمہ میں حافظ صاحب کے مناظروں کی دھوم اور علمی تبحر کی خبریں سنیں تو انہوں نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہوکر بہ چشم نم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں کیں۔ انہوں نے مکہ مکرمہ سے اپنی عربی تصنیف "اظہار حق" بھی حافظ صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ بھجوائی۔

حافظ صاحب نے عیسائی پادریوں سے بے شمار مناظرے کئے' جو ایک الگ موضوع ہے اور اس لائق ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ لکھا جائے' لیکن ان صفحات میں ان کی گنجائش نہیں۔ یہاں صرف ایک دلچسپ مناظرے کا حال درج کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ پادری کنڈر نے اعلان کیا کہ میں مسلمان علماء سے مناظرہ کرنا چاہتا ہوں۔

"سرائے سلطان" میں اس نے اپنا اکھاڑہ جمایا اور تین روز تک برابر وہاں اس کا اعلان کرتا رہا۔ حافظ صاحب کو معلوم ہوا تو فوراً وہاں پہنچے۔ مسلمانوں نے آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ آپ پادری فنڈر کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ میں نابینا ہوں' چاہتا ہوں کہ اپنے مدمقابل مناظر کو قریب سے دیکھوں۔ یہ سن کر لوگ پادری فنڈر کو آپ کے قریب لے گئے' اس نے سر پر ایک بڑا سا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ حافظ صاحب نے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو ٹٹولا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کردیا۔ فنڈر کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اس سے بھگدڑ مچ گئی اور مناظرہ درہم برہم ہو گیا۔ پولیس نے حافظ صاحب کو گرفتار کرلیا۔

حکومت نے اسی خوف سے کہ کہیں معاملہ بڑھ نہ جائے' حافظ صاحب کو اگلے ہی روز ایک مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کردیا۔ پادری فنڈر بھی وہاں موجود تھا۔ انگریز مجسٹریٹ نے حافظ صاحب سے کہا کہ آپ نے ارادہ قتل سے پادری صاحب پر حملہ کیا ہے اور انہیں تھپڑ مارا ہے۔ حافظ صاحب نے فرمایا ایسا نہیں ہے۔ میں تو پادری صاحب سے مناظرہ کرنا چاہتا تھا۔ تھپڑ مارنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں اطمینان کرلوں کہ پادری فنڈر انجیل پر ایمان بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی تمہیں ایک رخسار پر تھپڑ مارے' تو فوراً دوسرا رخسار اس کے آگے کردو۔ لیکن پادری فنڈر نے انجیل پر عمل کرنے کے بجائے الٹا مجھ پر مقدمہ دائر کردیا ہے۔ یہ کہہ کر حافظ صاحب نے انجیل کے تقریباً دو درجن نسخے عدالت میں پیش کردیئے اور ہر نسخے کا صفحہ نمبر بتا کر انجیل میں مذکورہ مقام دکھایا۔

اس پر عدالت نے پادری فنڈر کو جواب دینے کے لئے کہا۔ فنڈر نے اعتراف کیا حافظ صاحب درست کہتے ہیں۔ انجیل میں یہی لکھا ہے۔ میں یہ مقدمہ واپس لیتا ہوں۔
حافظ صاحب کے بے شمار شاگرد تھے' جن میں خان صاحب منشی سراج الدین' میر منشی ریذیڈنس کشمیر کے والد منشی محمد اسمٰعیل وکیل' میاں عبدالعزیز سابق صدر لاہور کارپوریشن کے والد مولوی الٰہی بخش مولوی فتح محمد ہوشیارپوری' منشی عبدالکریم لاہور اور مولوی اسمٰعیل پٹی والے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تحصیل علم کے بعد آپ اپنے شاگردوں کو دین کی تبلیغ کے لئے دوسرے شہروں میں بھیج دیتے تھے۔

مولانا علم الدین سالک کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے شاگرد مولوی محمد اسمٰعیل

کا ہوشیار پور میں مناظرہ ہوا' جس میں پادریوں کو قدم قدم پر شکست ہوئی۔ ان پے در پے شکستوں سے تنگ آکر پادریوں نے مولوی صاحب موصوف کو جھوٹے مقدموں میں پھنسانے کی کوشش کی۔ شاگرد نے صورت حال سے حافظ صاحب کو مطلع کیا۔ آپ فوراً ہوشیار پور پہنچے۔ وہاں کے مسلمانوں کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے پر جوش استقبال کیا۔ مولوی الٰہی بخش وکیل نے آپ کو اپنے ہاں ٹھہرایا۔ آپ نے پادری فورمین کو کہلا بھیجا کہ یا تو میرے شاگرد کے خلاف جھوٹے مقدمات واپس لو' یا پھر کھلے مناظرے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پادری فورمین آپ سے مناظرہ کرتے ہوئے گھبراتا تھا' اس کی تو حافظ صاحب کا نام سنتے ہی جان نکلتی تھی' اسے جب معلوم ہوا کہ حافظ صاحب نے اسے مناظرہ کا پیغام بھجوایا ہے تو فوراً مولوی محمد اسمٰعیل پر قائم مقدمات واپس لینے کا بندوبست کیا۔

حافظ صاحب کو عوام میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ آپ کے معاصرین میں خلیفہ حمیدالدین' مولوی نور احمد (مسجد نیلا گنبد) مولوی غلام قادر بھیروی (بیگم شاہی مسجد) مولوی حافظ سعد الدین (مسجد کمان گران) مولوی حسام الدین (ستھاں والے) اور مولوی غلام محمد بگوی آسمان علم و عرفان کے آفتاب وماہتاب تھے' مگر عوام میں جو اثر ورسوخ آپ کو حاصل تھا' وہ کسی اور کو نہ تھا۔ شرعی معاملات میں لوگ بالعموم آپ ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ حافظ صاحب ایک عرصہ تک بادشاہی مسجد لاہور کے نائب خطیب رہے۔ وہیں صحن میں بیٹھ کر آپ قرآن پاک کا درس بھی دیتے' جس میں اہل ذوق بڑی کثرت سے شریک ہوتے۔

حافظ صاحب کو عربی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ لاہور میں کوئی عرب آتا تو آپ گھنٹوں اس سے عربی میں گفتگو کرتے۔ آپ صاحب اولاد تھے' لیکن آپ کے سب بیٹے آپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔

آپ کی تبلیغ سے بے شمار غیر مسلم اسلام کے دامن میں آئے۔ مولانا علم الدین سالک مرحوم کے مطابق ایک بار آپ کے وعظ سے متاثر ہو کر ایک تعلیم یافتہ عیسائی نوجوان حلقہ بگوش اسلام ہوا اور آپ کی خدمت میں رہ کر اسلام کا زبردست مبلغ بن گیا۔

حافظ صاحب نے بروز جمعہ 24 جمادی الاول 1296ھ مطابق 1879ء کو لاہور میں وصال فرمایا۔ عیسائیت کے رد میں بہت سی کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ جن میں مباحثہ دینی' صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان اور ابحاث ضروری زیادہ مشہور ہیں۔ مولوی فقیر

محمد جہلمی (صاحب حدائق الحنفیہ) نے ان کتابوں پر حواشی تحریر کئے ہیں۔ "حدائق الحنفیہ" میں آپ کا قطعہ تاریخ وصال اس طرح درج ہے۔

آں حافظ شیریں زباں' واں واعظ خوشتر بیاں
شدروز آدینہ رواں' زیں دار پر رنج و عنا
بود از جمادی اولیں' تاریخ بست و چار میں
پنہاں شدہ زیر زمیں' آں صاحب فہم وزکا
یاسیں پئے سالش ورق بگرفت دل گفتن سبق
بنولیس جاں دادہ بہ حق حافظ اللہ ولی

اسلام کے اس عظیم فرزند کا مزار مبارک لاہور میں (عقب فاروق سنٹر) فلیمنگ روڈ پر ہے۔ پہلے آپ کے مزار سے ملحق بہت سی زمین خالی تھی اور ہر سال عرس بھی ہوتا تھا' لیکن اب لوگوں نے زمین پر قبضہ کر کے مکانات اور دوکانیں تعمیر کرلی ہیں۔

حضرت شاہ نظام الدین گیلانی بودیانوالے رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1311ھ/ 1894ء)

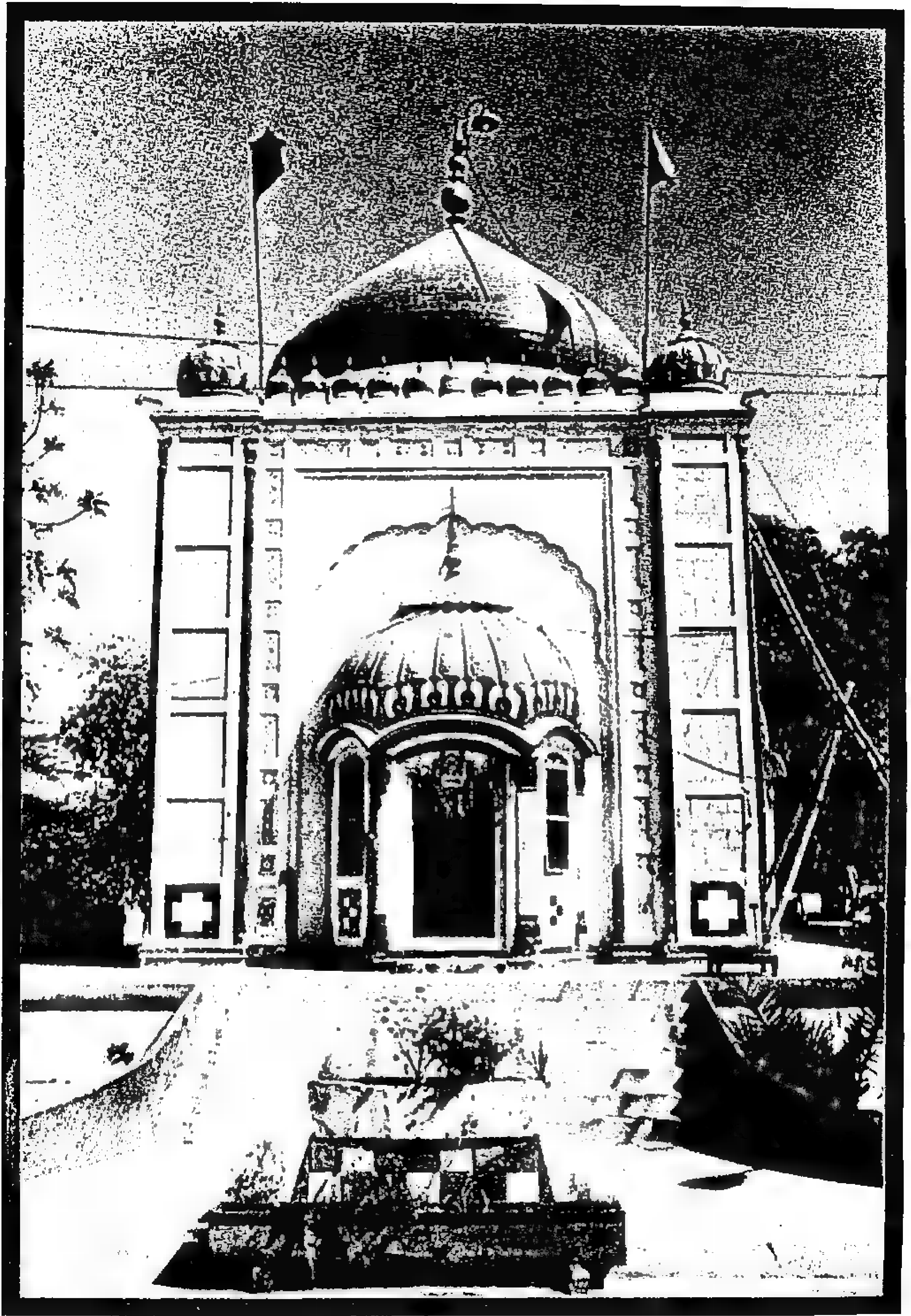
سلسلہ قادریہ کے نامور بزرگ ہیں۔ لاہور (اندرون شہر) محلہ پیر گیلانیاں آپ ہی کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں ان کی حویلی اب بھی موجود ہے۔

لاہور میں آپ کے خاندان کا فیضان کئی پشتوں سے جاری رہا۔ حضرت میر میران سید ایوب صابر تک آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ملتا ہے۔ سید نظام الدین بودیاں والے بن سید احمد شاہ بن سید قائم شاہ بن سید جانی شاہ بن سید احمد شاہ بن سید رسول شاہ بن سید المشہور بالوشاہ بن سید عبدالواحد بن سید نظام الدین حسن بن سید میر میراں ایوب صابر (رحمتہ اللہ علیہم اجمعین)

آپ کا وصال 91 برس کی عمر میں 22 رجب بروز جمعہ 1311ھ مطابق 1894ء کو ہوا انگریزوں کے عہد حکومت میں آپ کے بھانجے امیر سید اصغر علی شاہ نے 1346ھ مطابق 1927ء میں آپ کا روضہ مبارک تعمیر کرایا۔

آپ کا مزار مبارک قبرستان میانی شریف میں لٹن روڈ کی طرف سے غازی علم الدین شہید کے مزار کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔ قبر کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے۔

مرقد پرنور حضرت پیر گیلانی ولی
شہ نظام الدین سید بودیانوالا سخی
کرد ازیں دنیا بعمر نودویک سالش سفر
روز جمعہ بست و دوماہ رجب وقت سحر
بہر سال ہجری آں مہ جبینِ مومنیں



مزار حضرت نظام الدین بودیانوالے ؒ

حضرت شاہ نظام الدین گیلانی انیسویں صدی عیسوی کے معروف
بزرگ، جن سے اہل لاہور فیضیاب ہوئے۔

حضرت نظام الدین بودیانوالے

گفت شائق "ماہ جبیں شد رونق خلد بریں"

1311ھ

شد بنا ایں روضہ در عہد جناب محترم

پیر سید حضرت اصغر علی شاہ ذی کرم

1346ھ

حضرت میر جان کابلی نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1319ھ/ 1901ء)

نام نامی سید میر جان اور والد گرامی کا نام سید میر حسن بن عبیداللہ تھا۔ کابل میں پیدا ہوئے اور وہیں اس زمانے کے اکابر علماء سے تفسیر' حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

آپ کا سلسلہ نسب ننھیال کی طرف سے حضرت سید خاوند محمود نقشبندی (حضرت ایشاں) تک پہنچتا ہے۔ اسی لئے تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور تشریف لائے۔ بیعت ہونے کی غرض سے آپ سوادبیز (سوات) میں حضرت اخوند صاحب قادری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت ہونے کی درخواست کی۔ انہوں نے فرمایا۔ آپ کا حصہ امرتسر (پنجاب) میں سید احمد یار بخاری کے پاس ہے۔ وہاں تشریف لے جائیں۔ اس ارشاد کی تعمیل میں آپ پشاور اور لاہور سے ہوتے ہوئے امرتسر پہنچے اور حضرت سید احمد یار بخاری اوچی کی کدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے' فرمایا۔ میں تو آپ کا منتظر تھا۔ پھر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت سے مشرف فرمایا۔

آپ کے خلافت نامہ سے (جس کی عبارت مصباح الحقیقت مصنفہ مولانا محمد باقر کے حوالہ سے حدیقتہ الاولیاء میں نقل ہوئی ہے) معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی خلافت کئی سال مرشد کی خدمت میں مجاہدات کے بعد حاصل ہوئی۔ خلافت نامہ کی تحریر اس طرح ہے۔ "جب میں نے ان کو (حضرت میر جان کابلی) سیر سلوک میں خوب آزما لیا اور کئی بار مشائخ کرام کی طرف سے اجازت دینے کا حکم ہوا تو تب میں نے اجازت نامہ ان کو لکھ کر دیا۔"

آپ کا سلسلہ طریقت حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سے اس طرح ملتا ہے۔

سید میر جان کابلی سید احمد یار بخاری' مولانا محمد شریف قندھاری' شاہ ابو سعید' شاہ غلام علی' حضرت شمس الدین حبیب' سید نور محمد بداؤنی' خواجہ شیخ سیف الدین' حضرت خواجہ محمد معصوم' حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔

لاہور میں آپ نے درگاہ حضرت ایشاں رحمتہ اللہ علیہ کو مرکز ارشاد و سلوک بنایا اور یہاں 30 سال تک تلقین وہدایت میں مصروف رہے۔ ایک خلق کثیر نے آپ سے علمی و روحانی فیض حاصل کیا۔ حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ اور حضرت مولانا غلام قادر بھیرویؒ عموماً جمعرات یا جمعہ کے روز آتے اور مسجد کی محراب کے پاس بیٹھ کر آپ کے ارشادات سے مستفید ہوتے۔

آپ کی مادری زبان فارسی تھی' لیکن اہل لاہور کو سمجھانے کے لئے آپ پنجابی میں تقریر فرماتے تھے۔ "خفتگان خاک لاہور" میں ہے کہ حضرت سید میرجان کابلیؒ نے حضرت ایشاںؒ کی خانقاہ کو دوبارہ آباد کیا۔ ان کا شمار گزشتہ صدی کے نصف آخر میں لاہور کے اکابر نقشبندی اولیاء اللہ میں ہوتا تھا۔

حضرت سید میرجان کابلیؒ نے حضرت ایشاںؒ کی خانقاہ میں بہت سے حجرے تعمیر کرائے اور ایک حویلی اور مسافر خانہ بھی بنوایا' جہاں مسافر اور طالب علم قیام کرتے تھے۔ یہاں آپ نے جو مدرسہ قائم فرمایا اس میں آپ خود قرآن پاک' حدیث' فقہ اور عقائد حقہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

موسم گرما میں آپ کا معمول تھا کہ کشمیر میں تشریف لے جاتے اور وہاں کے لوگوں کو اپنے مواعظ حسنہ سے نوازتے۔ کشمیر میں آپ کا قیام عموماً خانقاہ حضرت شاہ ہمدانؒ یا خانقاہ حضرت خواجہ خاوند معین الدین نقشبندیؒ میں ہوتا۔

تذکرہ اولیائے لاہور میں مصباح الحقیقت کے حوالہ سے آپ کی شادی کے بارے میں تحریر ہے کہ آپ ہر سال حج کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جاتے تھے' انہی سالوں میں آپ نے ایک نیک خاتون سے نکاح کیا اور اس سے اولاد بھی ہوئی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے جو سفر حرمین شریفین سے واپسی پر آپ کے ساتھ تھے' راستے میں جہاز طوفان کی نذر ہوگیا۔ آپ کی زوجہ محترمہ اور دونوں بچے مسافروں کے ساتھ ڈوب گئے' لیکن آپ ایک لکڑی کے تختہ پر تین یوم تیرتے رہے اور اللہ کے فضل سے بمبئی کے ساحل تک پہنچ گئے۔ وہاں سے لاہور تشریف لائے۔

آپ کی وفات یکم شعبان المعظم 1319ھ مطابق 13 نومبر 1901ء کو ہوئی۔ آپ حضرت ایشاںؒ کے روضہ اقدس کے ساتھ جانب مشرق محو استراحت ہیں۔ لوح مزار پر تاریخ وفات کے علاوہ یہ شعر تحریر ہے۔

کاملاں را نور دیدہ جان جاناں عارفاں
نور چشم خواجگان نام باکش میر جاں
رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا غلام قادر چشتی بھیروی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1327ھ/1909ء)

بھیرہ (ضلع سرگودھا) کے معروف عالم دین مولانا غلام حیدر بھیروی کے صاحبزادے تھے۔ بھیرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں بچپن گزرا۔ بزرگان لاہور کے مؤلف کے مطابق ابھی سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انہی کے ارشاد کے مطابق تحصیل علوم کے لئے لاہور آئے۔ یہاں مولانا غلام محی الدین بگوی" اور مولانا احمد الدین بگوی" سے معقول و منقول کی کتب پڑھیں۔ پھر دہلی جاکر حضرت مولانا مفتی صدر الدین خاں آزردہ سے اکتساب فیض کیا اور فقہ' حدیث اور تفسیر کے علوم کی تکمیل کی' علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی" سے سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت کی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ پھر لاہور آکر اونچی مسجد (بھاٹی دروازہ) میں درس و تدریس اور خطابت کا سلسلہ شروع فرمایا۔ آپ کے وعظ میں لوگ کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ ایک روز مسجد بیگم شاہی لاہور کی متولیہ مائی جیواں بھی آپ کا وعظ سننے کے لئے آئی وہ اس درجہ متاثر ہوئی کہ آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ آپ مسجد بیگم شاہی کو اپنا تبلیغی مرکز بنالیں۔ آپ نے یہ درخواست قبول فرمائی اور مسجد بیگم شاہی میں تشریف لے گئے۔ مائی جیواں مرحومہ نے آپ کو اپنا متبنیٰ بنا کر مسجد کی تولیت آپ کے سپرد کردی۔

حضرت مولانا غلام قادر بھیروی" نے مدرسہ نعمانیہ (اندرون ٹکسالی گیٹ) اور اورینٹل کالج لاہور میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ وحدت الوجود کے زبردست حامی تھے۔ اس فلسفہ کی تائید میں آپ نے ایک معرکہ آرا کتاب "شمس الحنفیہ" تالیف فرمائی۔ اس طرح نوجوانوں اور بچوں کی دینی اور اعتقادی تعلیم و تربیت کے لئے اسلام کی

گیارہ کتابیں تحریر فرمائیں جو انتہائی عام فہم اور مفید ہونے کے باعث بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کے علاوہ آپ کی مندرجہ ذیل کتب بھی بہت مقبول ہیں۔

1۔ نماز حضوری
2۔ نماز ضروری
3۔ ختم خواجگان
4۔ حقیقت انوار محمدیہ
5۔ جوہر ایمانی
6۔ نور ربانی فی مدح محبوب سبحانی
7۔ عکازہ در صلوہ جنازہ
8۔ شوارق حمدیہ (ترجمہ بوارق محمدیہ)
9۔ شمس الضحیٰ فی مدح خیر الوریٰ
10۔ فاتحہ خوانی

آپ کے خلفاء

چشتیہ نظامیہ سلسلہ میں آپ کے کئی خلفاء تھے' جن میں یہ حضرات زیادہ معروف ہیں۔

1۔ حاجی الٰہی بخش ؒ
2۔ خلیفہ محمد اکرم ؒ
3۔ مولوی شہاب الدین ؒ

ان کے علاوہ آپ کے شاگردوں میں پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری ؒ' مولانا غلام حیدر پونچھی ؒ مولانا نبی بخش حلوائی ؒ' مولانا محمد عالم آسی امرتسری ؒ اور مولانا مفتی غلام احمد ؒ اول مدرس نعمانیہ لاہور بہت معروف ہیں۔

آپ کی وفات 19 ربیع الاول 1327ھ مطابق 11 اپریل 1909ء کو ہوئی۔ بیگم شاہی مسجد کے مشرقی جانب آپ کا مزار اقدس مرجع خلائق ہے۔ آپ کے شاگرد مولانا محمد

عالم آسی" نے آپ کے مادہ ہائے تاریخ نکالے

منبع فیض رب جلیل

1327ھ

در خلد بریں قبلہ من

1327ھ

حضرت پیر سید عبدالغفار شاہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1340ھ/ 1911ء)

آپ کے بزرگوں کا تعلق جنت نظیر کشمیر سے تھا۔ جہاں ان کے اسلاف بغداد سے آکر آباد ہوئے تھے۔ کشمیر میں آپ کے بزرگ شیخ مسعود مزوری تھے' جن کی اولاد ہندوستان کے کئی شہروں میں آباد ہے۔ ان میں سے جو لوگ لاہور آباد ہوئے ان میں آپ کے والد ماجد پیر احمد شاہ کاشمیریؒ تھے' جب آپ والد ماجد کے ساتھ لاہور آئے تو اس وقت آپ کی عمر گیارہ سال تھی دینی علوم آپ نے لاہور ہی میں حاصل کیے۔

1329ھ مطابق 1900ء میں آپ نے مسجد تکیہ کشمیری سادھواں (اندرون اکبری گیٹ) میں مدرسہ غوثیہ قائم کیا' جہاں قرآن' حدیث' فقہ اور عربی صرف و نحو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خود آپ مثنوی مولانا رومؒ کا درس دیتے تھے۔ مدرسہ میں طلبہ کی مفت خوراک و رہائش کا انتظام تھا اور انہیں دینی کتابیں بھی مفت ملتی تھیں۔ مسجد تکیہ کشمیری سادھواں میں امامت و خطابت کے فرائض بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔

پیر صاحب درود شریف کے عاشق تھے۔ خود بھی کثرت سے پڑھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہتے۔ مختلف درود شریف ہزارہا کی تعداد میں شائع کروا کر مفت تقسیم کرتے۔

انسانی قلوب میں عشق مصطفیٰ ﷺ کا احیاء آپ کی زندگی کا مقصد اولین تھا۔ آپ کبھی مدرسے یا کسی دینی کام کے لئے کسی سے کچھ نہ لیتے بلکہ ہمیشہ دینی اداروں اور اسلامی اخبار و رسائل کی زر نقد سے امداد فرماتے۔ خود نقشبندی سلسلہ کے پیر ہونے اور بہت بڑے پیر کے بیٹے ہونے کے باوجود کسی کو مرید نہ کرتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کے بے شمار عقیدت مند پورے پنجاب میں موجود تھے۔ منشی محمد دین فوق کے مطابق زمانہ

ساز اور بدنام پیروں اور عالموں کی اصلاح کے زبردست حامی تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ پیروں کو مریدوں کی گرداوری کرنے کی بجائے اپنی محنت سے رزق حلال کمانا چاہئے۔

آپ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے اور نہایت سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے' سر پر سادہ سی کپڑے کی کشمیری ٹوپی اور کرتا پاجامہ پہنتے۔ تسبیح ہاتھ میں پکڑ کر بازاروں میں اس کی نمائش کے سخت خلاف تھے۔ آپ نے تمام عمر مسجد کے بالائی حجرہ میں گزاری۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح سویرے احباب کے ساتھ حضرت داتا گنج بخش" یا حضرت میاں میر" یا حضرت ایشان" یا حضرت میراں حسین زنجانی" کے مزار اقدس پر چلے جاتے اور تلاوت قرآن' دلائل الخیرات اور اپنے دیگر وظائف پڑھتے۔ اس مقصد کے لئے قرآن پاک کے سپارے' دلائل الخیرات وغیرہ وظائف کا صندوقچہ' خوشبودار اگربتیاں اور چائے وغیرہ کا سامان آپ کے ساتھ ہوتا۔ تین گھنٹے تک کامل دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ ختم شریف پڑھتے اور ارواح بزرگان سے استفادہ کرتے۔ (مآثر لاہور)

آپ نے 17 جمادی الثانی چہارشنبہ 1340ھ مطابق 1911ء میں وفات پائی۔ وفات کا واقعہ اس طرح ہے کہ آپ عشاء کے لئے اپنی مسجد میں وضو کر رہے تھے' دایاں پاؤں دھو چکے تھے' ابھی بایاں پاؤں دھونا باقی تھا کہ یکایک آپ کو اختلاج قلب کا دورہ ہوا۔ ڈاکٹر محمد دین ناظر کا مکان قریب تھا۔ ان کو اطلاع ہوئی تو وہ دوائی وغیرہ لے کر فوراً پہنچ گئے' لیکن آپ نے دوائی نہ پی' فرمایا اب دوست سے ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ وفات کے وقت عمر مبارک 63 برس تھی۔

آپ کا مزار لاہور میں باغ گل بیگم کے متصل ہے۔ ڈاکٹر محمد دین ناظر نے آپ کی تاریخ وفات یوں لکھی ہے۔

بشنو حال وصال عبداللہ
عبد غفار : پیر عالی جاہ
در وضوئے نماز' وقت عشاء
ناگہاں داد جاں بحکم اللہ
بہر سال وصال او ناظر
گفت : سرمستِ جام عشقِ اللہ

حضرت مولوی حاکم علی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1344ھ/ 1925ء)

مولوی صاحب 1869ء میں موضع کیریاں (ضلع ہوشیار پور متحدہ ہندوستان) میں سکھوں کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سردار پنجاب سنگھ اور والدہ کا نام مائی گولاں تھا۔ آپ کے والد مائی سدا کور کے ملازم تھے جو قلعہ کیریاں کی رانی تھی۔ آپ کی پیدائش پر بڑی خوشی منائی گئی اور حاکم سنگھ نام رکھا گیا۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ کیریاں کے عالم دین اور عارف ربانی حضرت مولوی خدا بخشؒ کے وعظ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوگئے۔ اس پر خاندان میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا لیکن اسلام ان کے دل میں گھر کر چکا تھا' ارادے کے بھی نہایت مضبوط تھے' اس لئے کسی مخالفت کی پروانہ کی۔ اس دوران میں سکول کی تعلیم بھی جاری رکھی اور مولوی خدا بخشؒ سے قرآن مجید بھی پڑھ لیا۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اپنا نام خود ہی حاکم علی تجویز کیا۔ 1887ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت عمر 18 برس تھی۔

میٹرک کرنے کے بعد وہ لاہور آگئے اور مشن کالج لاہور (ایف سی کالج) میں داخل ہوگئے۔ یہیں سے 1889ء میں ایف اے اور 1891ء میں بی اے کے امتحانات پاس کئے۔ تعلیم کے دوران آپ نے تمام امتحانات امتیازی حیثیت سے سرکاری وظائف لے کر پاس کئے۔ میٹرک میں یونیورسٹی بھر میں دوم' ایف اے میں اول اور بی اے میں دسویں پوزیشن حاصل کی۔ اپنے کالج میں ان کی اول پوزیشن تھی۔ اس لئے رزلٹ نکلا تو کالج کی طرف سے آپ کو اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ ریاضی کی پیشکش ہوئی' جو آپ نے قبول کرلی اور انہی اساتذہ کے ہمراہ جن سے خود بھی پڑھتے تھے' کالج میں پڑھانا شروع کیا۔

آپ 1897ء تک مشن کالج لاہور سے وابستہ رہے۔ پھر جب چند دردمند اہل

دل مسلمانوں نے (جن میں مولوی صاحب بھی شامل تھے) لاہور میں "انجمن حمایت اسلام" قائم کی اور پھر اس کے زیراہتمام مسلمانوں کے لئے اسلامیہ کالج کا آغاز کیا تو مولوی صاحب وائس پرنسپل کی حیثیت سے اس کالج میں آگئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے وابستہ رہ کر انہوں نے مسلمان نوجوانان برصغیر کی تعلیمی ترقی اور ذہنی بالیدگی کے لئے شاندار خدمات انجام دیں۔ اس کالج میں وہ ریاضی اور سائنس کے پروفیسر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حصول تعلیم کے بغیر مسلمان اقوام عالم میں بلند مقام حاصل نہیں کرسکتے۔

مولوی حاکم علی بچپن میں اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ دوسرے لوگوں کے تاریک سینے بھی اسلام کے نور سے منور ہوں چنانچہ زمانہ تدریس کے دوران بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہے۔ انہوں نے بے شمار لوگوں کو مسلمان کیا۔ جن میں ان کے بعض رشتہ داروں کے علاوہ ان کی اپنی دو سگی بہنیں بھی تھیں۔ مولوی صاحب کی بدولت یہ سب راسخ العقیدہ مسلمان بنے۔

مولوی صاحب نے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد سب سے پہلے قرآن مجید پڑھا' پھر وہ ہمیشہ حدیث' تفسیر اور فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ وہ انتہائی متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی' مولانا اصغر علی روحی اور علامہ اقبال سے ان کے نہایت قریبی مراسم تھے۔ مولانا احمد رضا خاں انہیں "مجاہد اکبر" کہا کرتے تھے۔ مولانا حاکم علی کو جب معلوم ہوا کہ مولانا احمد رضا خاں سائنس سے خصوصی شغف رکھتے ہیں تو انہوں نے اس سلسلے میں ان سے خط و کتابت کی اور پھر کالج سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر بریلی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور الجھے ہوئے سائنسی مسائل پر رہنمائی حاصل کی۔ مولانا بریلوی کی کتاب "نزول آیات فرقان' سکون زمین و آسمان' مولوی حاکم علی ہی کے ایک طویل خط کے جواب میں لکھی گئی اس کتاب میں مولانا لکھتے ہیں۔

"محب فقیر! سائنس یوں مسلمان نہ ہوگی کہ اسلامی مسائل کو آیات و نصوص میں تاویلات دوراز کار کرکے سائنس کے مطابق کر لیا جائے' یوں تو معاذ اللہ اسلام نے سائنس قبول کی۔ نہ کہ سائنس نے اسلام؟ وہ مسلمان ہوگی' تو یوں کہ جتنے مسائل سے اسے اختلاف ہے' سب میں مسئلہ اسلامی کو روشن کیا جائے۔ دلائل سائنس کو مردود پامال کردیا جائے۔ جابجا سائنس ہی کے

اقوال سے مسئلہ اسلامی کا اثبات ہو۔ سائنس کا ابطال واسکات ہو۔
یوں سائنس قابو میں آئے گی اور یہ آپ جیسے فہیم سائنس دان کو
باذنہ تعالیٰ دشوار نہیں۔"

مولانا اصغر علی روحی اسلامیہ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے' راسخ الاعتقاد اور ہم مسلک ہونے کی وجہ سے دونوں میں بڑی محبت تھی' مولانا روحی کے بیٹے صوفی ضیاء الحق بیان کرتے ہیں کہ ایک روز مولوی حاکم علی کیمسٹری کی تجربہ گاہ میں کسی تجربہ میں مصروف تھے۔ مولانا روحی بھی اس وقت پاس ہی تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک نالی پھٹی اور کیمیائی مادہ اڑ کر مولانا روحی کی آنکھ میں پڑ گیا۔ جس سے ان کی ایک آنکھ کی بینائی شدید متاثر ہوئی۔ پھر وہ ساری عمر اس آنکھ سے ٹھیک طرح نہ دیکھ سکے۔ (بحوالہ کتاب "مولوی حاکم علی اور اقبال از پروفیسر محمد صدیق صفحہ 26)

1920ء میں مولوی صاحب نے لاہور سے ایک رسالہ "قامع المرتدین والفجار" کے نام سے جاری کیا جسے وہ لالہ دونی چند کے سٹیم پریس سے طبع کروایا کرتے تھے۔ یہ رسالہ مفت تقسیم ہوتا تھا۔ اس میں مولانا کے مضامین اور فارسی اردو کلام بھی شائع ہوتے تھے۔ مولانا اپنے دستخط کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ کا اضافہ فرماتے تھے

"خادم الاسلام فقیر حاکم علی غلام مصطفیٰ دلدادہ مرتضیٰ
دوست دار چاریار کبار"

مولوی صاحب اسلامی احکام پر بڑی سختی کے ساتھ عمل کرتے تھے۔ 1908ء میں جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں تھے تو سر لوئیولیم ڈین لیفٹیننٹ گورنر پنجاب ریواز ہوسٹل اسلامیہ کالج کا افتتاح کرنے کے لئے آئے' ان کے ہمراہ ان کی لیڈی ڈین بھی تھی۔ استقبالیہ کمیٹی کے تمام ممبران نے فرداً فرداً ڈین اور لیڈی ڈین سے مصافحہ کیا' لیکن جب مولوی صاحب سے مصافحہ کے لئے لیڈی ڈین نے ہاتھ بڑھایا' تو انہوں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس واقعہ سے فضا خاصی مکدر ہوئی' گورنر پنجاب مسٹر ڈین نے برا مانا' مگر مولوی صاحب نے فرمایا کہ میرا مذہب اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی نامحرم عورت سے مصافحہ کروں۔ (بحوالہ کتاب مولوی حاکم علی اور اقبال صفحہ 29)

مولوی صاحب معاملات زندگی میں سنت نبوی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی نشست و برخاست اور کھانا پینا اسی کے مطابق ہوتے۔ انہوں نے اپنے مکان پر جو نیم پلیٹ

(نام کی تختی) لگا رکھی تھی' اس کے ساتھ یہ عبارت بھی درج تھی کہ میرا کوئی ملاقاتی مجھے تین سے زیادہ آوازیں نہ دے۔ اگر میں گھر میں موجود ہوں' تو تیسری آواز سے پہلے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔

مولوی صاحب نے جس طرح اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کر رکھا تھا' اس طرح وہ اپنے گھر میں بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ اسلامی احکام کی پوری طرح پاسداری ہو۔ پردہ کے وہ سخت پابند تھے۔ اس سلسلے میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ان کی کبھی نوک جھونک بھی ہو جاتی۔ ایک دفعہ اس بات پر معاملہ بڑھ گیا حتیٰ کہ ان کی اہلیہ نے تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کر دیا۔ مولوی صاحب اسے طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ یہ مقدمہ ایک سکھ مجسٹریٹ کی عدالت میں تھا۔ پیشی کے روز دونوں کے بیانات قلم بند ہونے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے بیان میں کہا کہ میں کسی حالت میں بھی طلاق نہیں دوں گا۔ مولوی صاحب کے بعد جب ان کی بیوی سے کہا گیا کہ وہ اپنا بیان قلم بند کرائیں' تو انہوں نے بیان دینے سے قبل اپنے چہرے سے برقع کا نقاب الٹ دیا۔ ان کا نقاب ہٹانا تھا کہ مولوی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور عدالت کو خطاب کرتے ہوئے کہا میں ابھی طلاق دیتا ہوں۔ عدالت نے سوال کیا کہ ابھی تو آپ طلاق نہ دینے پر مصر تھے' یہ اس قدر جلد کیسے رضامند ہو گئے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اس خاتون نے نامحرم لوگوں کے سامنے اپنا چہرہ روز روشن کی طرح کھول دیا' یہ میں کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے کی یہ کیسی عمدہ مثال ہے۔

پیرو مرشد سے محبت

مولوی حاکم علی' حضرت سید میر جان کابلیؒ (م 1319ھ مطابق 1901ء) سے بیعت تھے۔ حضرت کابلیؒ کا مزار حضرت سید خاوند محمود المعروف حضرت ایشاں کے روضہ شریف میں ہے۔ ان کے حالات آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں) مولوی حاکم علیؒ کو اپنے مرشد سے اس قدر محبت تھی کہ زندگی میں بھی ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کی وفات کے بعد بھی ہر روز مزار شریف پر حاضری دیتے۔ آخر 1917ء میں مستقلاً حضرت ایشاںؒ کے دربار میں آ گئے اور ایک حجرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ میاں اخلاق احمد نے "تذکرہ حضرت ایشاںؒ" میں لکھا ہے کہ مولوی حاکم علی' حضرت

سید میر جان کابلی رحمتہ اللہ علیہ کے صفِ اول کے مرید تھے۔ آپ کو مرشد سے والہانہ عقیدت تھی۔ ان کے وصال کے بعد تقریباً تین سال (یعنی 1920ء کے بعد) خانقاہ حضرت ایشاںؒ کی تولیت و نگرانی کے فرائض آپ ہی انجام دیتے رہے۔ آپ بے حد شفیق' مہمان نواز' عابد اور زاہد بزرگ تھے۔ پیر بھائیوں سے نہایت محبت رکھتے تھے اور ان کی خدمت اپنا فرض سمجھتے تھے' وہ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ مسلمان طلبہ کی امداد اور خانقاہ حضرت ایشاںؒ کی مرمت اور لنگر کی ضروریات میں صرف کردیا کرتے تھے۔

> مولوی حاکم علیؒ "پیسہ اخبار" لاہور (3 دسمبر 1920ء) میں مطبوعہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ 35 سال کی عمر میں میں نے بیعت طریقت کی۔ میں امامت کرانے سے تامل کیا کرتا تھا ایک وقت آگیا کہ میرے مرشد (حضرت سید میر جانؒ نے مجھے امامت نماز سپرد کی اور خود میرے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ ایک وقت مجھے اپنے ضمن میں لے لیا۔ یعنی وصیت مجھے فرما کر وصی مقرر فرمایا اور آخر میں میری داڑھی دست مبارک میں لے کر فرمایا۔

> توں میں ہیں میں تینوں اللہ دی سپرد کیتا

پھر تمام شجرۂ شریف مجھے عطا فرمائے۔ کچھ عرصہ بعد جب میری رسائی ایک خاص مقام تک ہو گئی' تو میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے روضہ مبارک میں حاضر حضور پر نور ہوا' تو القاء فرمایا کہ تجھ کو ہم نے پاک کیتا۔ (بحوالہ کتاب حضرت ایشاں صفحہ 126)

مولوی حاکم علیؒ کا شجرہ طریقت اس طرح ہے۔

(1)سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ (2)حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (3)حضرت سلیمان فارسیؒ (4)امام قاسم بن محمدؒ (5)حضرت جعفر صادقؒ (6)حضرت بایزید بسطامیؒ (7)حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ (8)حضرت قاسم گورگانیؒ (9)ابوعلی فارمدیؒ (10)ابویوسف ہمدانیؒ (11)عبدالخالق غجدوانیؒ (12)محمد عارف ریوگریؒ (13)خواجہ محمود (14)بوعلی رامیتنیؒ (15)محمود بابا سماسیؒ (16)خواجہ میر کلالؒ (17)حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ (18)خواجہ علاء الدین عطارؒ (19)حضرت یعقوب چرخیؒ (20)خواجہ عبید اللہ احرارؒ (21)محمد زاہد ولیؒ (22)مولانا درویش محمدؒ (23)خواجہ امکنگیؒ (24)حضرت باقی باللہؒ (25)امام ربانی حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ (26)خواجہ محمد معصومؒ (27)شیخ سیف

الدینؒ (28) سید نور محمد بداؤنیؒ (29) حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ (30) شاہ غلام علیؒ (31) شاہ ابوسعیدؒ (32) شاہ احمد سعیدؒ (33) مولوی محمد شریف قندھاری (34) مولوی احمد یار نجاریؒ (35) سید میر جان کابلیؒ (36) مولوی حاکم علیؒ۔ مولوی حاکم علی کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی ساری عمر تعلیم و تعلم اور صوفیاء کی مجالس میں گزری۔ دنیا داری اور ظاہر پرستی سے انہیں دور کا تعلق نہ تھا۔ اپنے عقیدہ کے اظہار کے لیے اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

بندہ پروردگارم امت احمد نبی ﷺ
دوستدار چار یارم، تابا اولاد علیؓ
مذہب حنفیہ دارم، ملت حضرت خلیل
خاکپائے غوث اعظمؒ زیر سایہ ہر ولی

احاطہ درگاہ شریف حضرت ایشاں میں آپ کا مزار ہے۔ کتبہ پر سال وفات 1925ء درج ہے۔

حضرت مولانا تاج الدین قادری رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1347ھ/ 1929ء)

اپنے وقت کے جید عالم زاہد مرتاض اور انتہائی راسخ العقیدہ بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ضلع گجرات کے ایک قصبہ "میانوالی راجیال" میں ہوئی۔ والد بزرگ شیخ محمد عیسیٰ چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت تاج الدین کی عمر جب پڑھنے کے قابل ہوئی تو انہیں گاؤں کے ایک مدرسہ میں داخل کردیا گیا۔ یہیں آپ نے ناظرہ قرآن مجید اور چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر والد ماجد کی اجازت سے لاہور آئے اور مسجد پٹولیاں (اندرون لوہاری گیٹ) میں حضرت مولانا شہاب الدین کے درس میں شامل ہوئے۔ مدینۃ الاولیا کے مؤلف نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں اوہاں پیر مہر علی شاہ' پیر جماعت علی شاہ اور مولانا غلام قادر بھیروی (رحمہم اللہ) بھی آپ کے ہم درس تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ مانکی شریف (صوبہ سرحد) گئے اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت پیر صاحب مانکی شریف کی بیعت کی۔ کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے اور پھر انہی کی ہدایت پر لاہور تشریف لائے۔

لاہور میں آپ ریلوے گاف گراؤنڈ (گڑھی شاہو) کے قریب مسجد قصاب خانہ میں مقیم ہوئے اور یہیں وعظ و تلقین اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

اس زمانے میں لاہور تا امرتسر ریلوے لائن تعمیر ہو رہی تھی۔ ریلوے کے انگریز انجینئروں نے جو نقشہ بنایا' اس کے مطابق مسجد قصاب خانہ کا انہدام ضروری تھا' اس مقصد کے لئے جب آپ کو نوٹس دیا گیا' تو آپ نے فرمایا کہ تم قیامت تک اللہ کے اس گھر کو نہیں گرا سکتے۔ بعض لوگوں نے اس خیال سے کہ بدیسی حکمران مولانا کو نقصان نہ پہنچائیں' انہیں سمجھایا کہ یہ عام لوگوں کے فائدہ کی بات ہے' آپ مسجد خالی کردیں تاکہ

حکومت ریلوے لائن بنا سکے' لیکن مولانا نے انکار کیا اور کہا کہ وہ کسی طور انگریزوں کو مسجد نہیں گرانے دیں گے' اس معاملے نے بہت طول کھینچا۔ آخر چند مسلمان عمائدین شہر نے وائسرائے ہند کو ایک یاد داشت بھجوائی' جس پر خان بہادر مولوی محرم علی چشتی' نواب زادہ سعادت علی خاں' نواب محمد علی خاں' محمد امین ایڈووکیٹ کے علاوہ سینکڑوں مسلمانوں نے دستخط کئے۔ وائسرائے نے اس خیال سے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہونے کے باعث نقض امن کا مسئلہ پیدا نہ ہو' ریلوے حکام سے کہا کہ وہ ریلوے لائن بناتے وقت مسجد کی حرمت کا خیال رکھیں یوں حضرت مولانا تاج الدین رحمتہ اللہ علیہ کی جرات و کوشش سے مسجد منہدم ہونے سے بچ گئی۔

مسجد قصاباں میں حضرت مولانا کی تبلیغ وہدایت سے ہزاروں گم گشتگان راہ نے ہدایت پائی۔ آپ نے 25 شعبان المعظم 1347ھ مطابق 26 فروری 1929ء کو وصال فرمایا۔

مسجد قصاباں کے صحن سے ملحق ایک وسیع وعریض کمرہ میں آپ کا مزار ہے۔ فرش سنگ مرمر کا ہے' جس پر پختہ لینٹر کی چھت ہے۔

حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1354ھ)

آپ کے بزرگ مشہد (ایران) کے رہنے والے تھے' آپ کے پردادا سید خلیل شاہ مشہد سے ہندوستان آئے اور ریاست الور میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم" سے ملتا ہے۔ آپ 1273ھ مطابق 1865ء کو الور کے محلّہ نواب پورہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید نجف علی تھا۔

آپ کے عم مکرم سید نثار علی شاہ" نے آپ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ کو بشارت دی کہ بیٹی! عنقریب تیرے ہاں ایک سعادت آثار بیٹا پیدا ہوگا' وہ ظلمت کدہ ہند میں عشق مصطفویٰ کا چراغ روشن کرے گا' اس کا نام دیدار علی رکھنا۔

آپ نے سب سے پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر الور میں مولانا قمر الدین سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر دہلی گئے اور مولانا کرامت اللہ خان سے درسی کتب اور دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ فقہ اور منطق کی تحصیل مولانا ارشاد حسین رام پوری سے کی اور سند حدیث مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے حاصل کی۔ حضرت شیخ الاسلام پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی اور مولانا وصی احمد محدث سورتی آپ کے" ہم درس تھے۔

آپ کے سوانح نگار مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ اور صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کے درمیان بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ایک مرتبہ حضرت صدر الافاضل نے اعلیٰ حضرت بریلوی کا ذکر کیا اور ملاقات کی رغبت دلائی تو مولانا سید دیدار علی شاہ نے فرمایا۔ بھائی! مجھے ان سے کچھ حجاب آتا ہے' وہ پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور سنا ہے طبیعت سخت ہے۔

لیکن حضرت صدر الافاضل دوستانہ روابط کی بناء پر انہیں کسی طرح بریلی لے ہی گئے۔ اعلیٰ حضرت سے ملاقات ہوئی' تو مولانا سید دیدار علی نے عرض کی حضور! مزاج کیسے ہیں؟ اعلیٰ حضرت نے فرمایا بھائی کیا پوچھتے ہو' پٹھان ذات ہوں۔ طبیعت کا سخت ہوں۔

کشف کی یہ حالت دیکھ کر مولانا سید دیدار علی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سر عقیدت نیاز مندی سے جھکا دیا۔ اس طرح بارگاہ رضوی سے نہ ٹوٹنے والا تعلق قائم ہوگیا۔ (ماہنامہ ضیائے حرم۔ اگست 1976ء)

بیعت وخلافت

آپ نے سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے دست مبارک پر بیعت کی اور انہی سے خرقہ خلافت پایا۔ سلسلہ چشتیہ میں حضرت سید علی حسین چشتی کچھوچھویؒ اور سلسلہ قادریہ میں حضرت مولانا احمد رضا خان قادری بریلویؒ سے خلافت حاصل کی۔

تکمیل تعلیم کے بعد آپ اپنے استاد مکرم مولانا ارشاد حسین کے حکم پر مدرسہ ارشاد العلوم رام پور میں مدرس اول مقرر ہوئے۔ چند برس بعد 1906ء میں بمبئی چلے گئے اور تقریباً ایک سال وہاں مقیم رہے۔ 1907ء میں الور تشریف لائے اور مسجد دائرہ میں دارالعلوم قوت الاسلام کی بنیاد رکھی۔ پھر لاہور تشریف لائے اور جامعہ نعمانیہ (اندرون ٹکسالی گیٹ) میں بطور شیخ الحدیث فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ 1335ھ / 1917ء میں مولانا ارشاد حسین رام پوری کے ایما پر آگرہ میں شاہی مسجد کے خطیب اور مفتی کی حیثیت سے تشریف لے گئے۔

1922ء میں مولوی محرم علی چشتیؒ' حضرت مولانا تاج الدین لاہوریؒ' مولوی مفتی سلیم اللہؒ اور مولوی نور بخش توکلیؒ کی درخواست پر دوسری بار لاہور تشریف لائے۔ مسجد وزیر خاں کی خطابت آپ کے سپرد ہوئی۔ یہاں آپ نے درس وتدریس کا آغاز کیا اور باقاعدہ دارالافتاء قائم کیا۔ 1925ء میں آپ نے مرکزی انجمن حزب الاحناف کی بنیاد رکھی' جہاں سے سینکڑوں علماء وفضلا پیدا ہوئے۔

مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری آپ کی ذات ستودہ صفات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "بے باکی وحق گوئی آپکی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ مخالفتوں کے طوفان آپ کے پائے

ثبات کو جنبش نہ دے سکے۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں مرعوب نہ کرسکتی تھی۔ علم وفضل کے تو گویا سمندر تھے۔ کسی مسئلے پر گفتگو شروع کرتے تو گھنٹوں بیان جاری رہتا۔ سورہ فاتحہ کا درس ایک سال میں ختم ہوا۔ آپ کے خلوص وایثار' زہد و تقویٰ' سادگی اور اخلاق عالیہ کے مخالف وموافق سبھی معترف تھے۔ اسلام کے تحفظ اور فروغ کے لئے آپ نے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ آپ کے صاحبزادگان غازی کشمیر مولانا سید ابوالحسنات قادری" اور مفتی اعظم حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری" آپ کے فضل وکمال کے عکس جمیل ہیں۔ (حوالہ ایضاً)

آپ بہت سادہ لباس پہنتے تھے۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی' تکملیے والا کرتہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ۔ پاؤں میں دیسی ساخت کا جوتا۔ یہ تھا ظاہری حلیہ اس شخص کا جو علم وفضل میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

آپ عربی' فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دیوان شعری کے علاوہ آپ کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔

(1) تفسیر میزان الادیان (2) ہدایۃ الغویٰ در ردِّ روافض
(3) اصول الکلام (4) تحقیق المسائل
(5) ہدایۃ الطریق (6) سلوک قادریہ
(7) علامات وہابیہ (8) فضائل رمضان
(9) فضائل شعبان (10) الاستغاثۃ من اولیا اللہ

آپ نے 22 رجب المرجب 1354ھ کو وفات پائی۔ دارالعلوم حزب الاحناف (اندرونی دہلی دروازہ) میں دفن ہوئے۔ آپ کے صاحبزادے علامہ ابوالحسنات نے تاریخ وفات کہی۔

حافظ پس سرکوبی اعداء شریعت
دیدار علی یافتہ دیدار علی را

1354ھ

حضرت ابو الرضا حاکم علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفیٰ 1358ھ/1940ء)

والد ماجد کا اسم گرامی شہاب الدین تھا۔ 1297ھ میں کوٹلی (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے نہایت ذہین تھے۔ حافظہ اس قدر تیز تھا کہ جو آیت یا سورت ایک بار سن لیتے وہ ذہن نشین ہوجاتی۔ چار پانچ سال کی عمر ہی میں آپ کو کلام پاک کے کئی سپارے حفظ ہوچکے تھے۔

بارہ برس کے تھے کہ والد ماجد انتقال کرگئے۔ اب آپ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ معاش کی فکر بھی لاحق ہوئی۔ چنانچہ دن بھر کام کرتے اور رات کو دینی علوم پڑھتے۔ اس طرح بہت جلد آپ نے دینی علوم کی تکمیل کرلی اور قرآن پاک بھی حفظ کرلیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ شرقپور شریف کے حضرت میاں شیر محمدؒ صاحب کا بہت شہرہ تھا۔ آپ بھی کشاں کشاں وہاں پہنچے اور حضرت میاں صاحب کے حسن اخلاق سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے ہاتھ پر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں بیعت کرلی۔

اس وقت لاہور آجکل کی طرح پھیلا ہوا نہ تھا' لاہور کی اصل آبادی اندرون شہر تک محدود تھی۔ قلعہ گوجر سنگھ' گڑھی شاہو' مزنگ' اچھرہ وغیرہ علاقے مضافاتی بستیوں کے نام سے معروف تھیں۔ ملتان روڈ پر چوک یتیم خانہ کے قریب جہاں اب آپ کا مزار ہے یہ علاقہ ان دنوں بالکل ویران اور بنجر تھا۔ اللہ والوں کو عبادت و ریاضت کے لئے ایسی ہی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ نے بھی اس ویرانے میں رہائش اختیار کی' لیکن تشنگان معرفت کا یہ عالم تھا کہ دور دور سے کھنچے آتے اور فیض یاب ہوتے آپ کا بیشتر وقت درس وتدریس اور تعلیم وتلقین میں صرف ہوتا۔ ورزش سے بھی شغف تھا۔ کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالتے۔ آپ کے تذکرہ میں ہے کہ دوڑنے' کشتی لڑنے اور فصل

کاٹنے میں آپ ہمیشہ ممتاز رہے۔ فرمایا کرتے تے کہ مسلمانوں کو کشتی لڑنے' تلوار چلانے' نیزہ بازی اور دوسرے حربی فنون میں ضرور کمال حاصل کرنا چاہیے تاکہ جب بھی ضرورت ہو وہ جہاد میں حصہ لے سکیں۔ جوانی کے دنوں میں بھی آپ کی راتیں عبادت وریاضت میں گزرتیں۔

آپ کے شوق عبادت کا یہ حال تھا کہ کئی کئی روز بغیر کچھ کھائے پیۓ مصلّیٰ پر گزار دیتے۔ قرآن پاک کی تلاوت سے خصوصی شغف تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میری خوراک' میری روح اور میرے دل کا سرور ہے۔ میں کھانے پینے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں' لیکن قرآن حکیم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک روز قرآن حکیم کی تلاوت میں مشغول تھے کہ اہلیہ نے پیغام بھجوایا کہ بیٹے کی طبیعت سخت علیل ہے' جلد گھر پہنچیں۔ لیکن آپ زیر تلاوت منزل ختم کر کے گھر پہنچے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ' جو اس وقت حیات تھیں بولیں بیٹا! اب آنے کا کیا فائدہ؟ تم قرآن کے' اور قرآن تمہارا۔

کلام پاک کے معانی و مطالب پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ میرے ایک بزرگ دوست ڈاکٹر محمد اقبال ہمدانی' جو اکثر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور جنہوں نے آپ کی عقیدت کے باعث اپنے مکان پر "رضا منزل" لکھوا رکھا تھا۔ بتایا کرتے تھے کہ قرآنی علوم سے آپ کی واقفیت کا یہ حال تھا کہ ہر آیت کی کئی قسم کی تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات سے رضائے الٰہی کی جھلک نمایاں تھی' اس لئے خلقت میں "ابو الرضا" کے نام سے معروف تھے۔

آپ کو عربی و فارسی پر عبور حاصل تھا' بہترین خوشنویس اور شاعر تھے' آخر عمر میں بہت زیادہ علیل ہو گئے۔ لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ بھی کم کر دیا۔ آخر تریسٹھ برس کی عمر میں بروز پیر 11 ذی الحجہ 1358ھ مطابق 22 جنوری 1940ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ جس حجرہ میں آپ عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ اسی میں تدفین عمل میں آئی۔

مزار مبارک ملتان روڈ (چوک یتیم خانہ) سے طبیہ کالج کو جانے والی سڑک پر زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت مولانا نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1363ھ/1944ء)

آپ کا شمار لاہور کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی عیسوی میں دینی اور اسلامی اقدار کی نشوونما میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی پوری زندگی اس میں صرف کردی۔

آپ 1850ء میں لاہور کے ایک متوسط ارائیں گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ والد ماجد میاں محمد وارث نے آپ کو ایک حلوائی کی شاگردی میں دے دیا تاکہ آپ اس کام میں مہارت حاصل کریں۔ لیکن آپ کو علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ آپ کی اس لگن کو دیکھ کر استاد نے اجازت دیدی کہ آپ کام کے ساتھ ساتھ قریبی مسجد میں قرآن مجید بھی پڑھ لیا کریں۔ جب ناظرہ قرآن ختم کرچکے تو اُستاد کی اجازت سے مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھواں میں داخل ہوگئے اور محنت اور لگن سے حدیث' تفسیر اور فقہ کے علوم کی تکمیل کی۔ اس مدرسہ کے ناظم و مہتمم کشمیر کے ایک بزرگ پیر عبدالغفار شاہ قادری تھے' جو شیخ طریقت بھی تھے اور معلم علوم دینیہ بھی۔ مولانا نبی بخش" نے اس مدرسہ میں دینی علوم کے مختلف مراحل طے کرنے کے ساتھ اپنے استاد مکرم پیر عبدالغفار شاہ قادریؒ کی روحانی مجالس میں بھی شریک ہوکر عرفان و تصوف کے ابتدائی رموز سے واقفیت حاصل کی۔ مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھواں کے علاوہ آپ نے لاہور کے بعض دیگر مدارس میں بھی تعلیم حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے مٹھائی بنانے اور دودھ بیچنے کا پیشہ اختیار فرمایا۔ اسی لئے حلوائی کہلانے لگے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ اشاعت و فروغ اسلام ہر مسلمان کا مشن ہے البتہ رزق حلال کے لئے محنت مزدوری کو شعار بنانا ضروری ہے۔

آپ نے اپنے دور کے کئی بزرگوں سے علم حاصل کیا۔ جن میں حضرت پیر سید عبدالغفار شاہ کے علاوہ مولانا حسین (خطیب بادشاہی مسجد لاہور) مولانا محمد ذاکر بگوی ' مولانا غلام محمد بگوی'' ' مولانا غلام قادر چشتی بھیروی اور حضرت مولانا غلام دستگیر نقشبندی قصوری'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ نے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمتہ اللہ علیہ کی بیعت کی اور انہی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ آپ نے اپنی تصنیف ''تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان'' میں سلوک و طریقت پر بڑی مفید باتیں لکھیں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تصوف کو ذکر الٰہی اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ آپ ان صوفیائے خام پر سخت تنقید فرماتے تھے جو مزامیر اور رقص و سرود کو اپنی مجالس میں روا رکھتے تھے۔ آپ ان نام نہاد صوفیاء کی بھی سخت مذمت کرتے جو عوام کو دھوکہ دینے کے لئے لباس فقر کا بہروپ بھرتے ہیں۔

آپ کے شاگرد مولانا اقبال احمد فاروقی نے آپ کا حلیہ لکھا ہے جس کے مطابق ''علامہ حلوائی سرخ و سپید رنگ کے مالک تھے۔ میانہ قد اور خوبصورت متوازن جسم سے متصف تھے۔ آپ لاہور کے آرائیں خانوادہ کا معروف لباس زیب تن کرتے اور اور مروجہ عالمانہ جبہ ودستار سے اجتناب فرماتے۔ آپ کے سر پر عمامہ خوب سجتا۔ عمامے کے نیچے سفید ٹوپی ہوتی اور بدن پر کھلے گلے اور ڈھیلے بازوؤں والی سفید قمیص ہوتی جسے آج کے الفاظ میں کھلا کرتہ کہا جاسکتا ہے۔

لباس سفید براق ہوتا۔ کھدر اور لٹھے کے لباس کو زیادہ ترجیح دیتے۔ پاؤں میں ''گامے شاہی'' جوتا' جو سرخ چمڑے سے بنا ہوتا' پہنتے۔ بڑھاپے میں ریش مبارک کو رنگ حنا سے مزین کرنے لگے۔ لیکن زندگی کے آخری ایام میں اسے ترک کردیا تھا' چہرے پر سفید داڑھی سجنے لگی۔ آپ نے حلوائی کی دوکانداری میں زندگی کا بیشتر حصہ بسر کیا۔ دوکانداری کے دوران بھی جو لوگ دینی مسائل کا حل دریافت کرنے آتے' آپ ان کو تشفی بخش جواب دیتے۔ زندگی کے آخری پندرہ سالوں میں آپ نے دوکانداری ترک کر دی تھی اور خود کو پوری طرح خدمت دین اور عبادت و ریاضت کے لئے وقف کردیا تھا۔

(ماہنامہ جہان رضا لاہور اپریل 1997ء صفحہ 23)

معمولات

آپ نماز تہجد سے فارغ ہو کر صبح کی نماز تک مسجد کے فرش پر بیٹھ کر درود شریف پڑھتے۔ نماز فجر کے بعد شاگردوں کے حلقہ میں بیٹھ کر ہزاروں بار درود شریف پڑھتے اور پڑھاتے۔ پھر تلاوت قرآن پاک کے بعد شاگردوں کو پڑھاتے۔ تدریس سے فارغ ہو کر تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو جاتے۔ نماز ظہر کے بعد عام لوگوں کے درمیان بیٹھ جاتے اور مختلف مسائل دینیہ پر گفتگو فرماتے۔ کوئی مسئلہ پوچھتا تو وہ بیان فرماتے۔ نماز عصر کے بعد مخصوص احباب کے ساتھ مل کر ختم خواجگان پڑھتے۔ ختم خواجگان میں سترہ آدمیوں سے زیادہ شرکت نہیں کرتے تھے۔ اس مجلس میں بیٹھنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ سارے دن میں کسی نماز کی قضا کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ حقہ یا سگریٹ پینے والے ختم خواجگان کی مجلس میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

آپ کو بعض وظائف و عملیات پر عبور حاصل تھا۔ ضرورت مند دور دور سے تعویزات حاصل کرنے کے لئے آتے۔ مولانا اقبال احمد فاروقی کا کہنا ہے کہ آپ کے پاس محبت کا نقش اور کسی گم شدہ فرد کی بازیابی کا عمل اتنا مجرب تھا کہ اس تیر کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا تھا۔

آپ کے شاگردوں میں حضرت مولانا باغ علی' مولانا اقبال احمد فاروقی' حافظ محمد عالم سیالکوٹی اور صوفی غلام حسین گوجروی بہت معروف ہیں۔

تفسیر نبوی

آپ اردو اور پنجابی میں بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔ تفسیر نبوی آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو پندرہ مضبوط جلدوں میں قرآن پاک کی منظوم تفسیر ہے۔ جو پنجابی زبان میں لکھی گئی۔ یہ عظیم الشان تفسیر چالیس سال کی محنت شاقہ سے لکھی گئی اور 1932ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمتہ اللہ علیہ نے جب اس تفسیر کا آغاز کیا تو آپ اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا غلام دستگیر قصوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس غرض سے بطور خاص اپنے لئے دعا کرائی۔ مرشد کامل نے دعائے خیر کے بعد بسم اللہ الرحمٰن

الرحیم کا جو ترجمہ خود کیا۔ وہ مولانا حلوائی نے "تفسیر نبوی" کی ہر سورہ کی تفسیر کی ابتدا میں بطور تبرک درج کیا ہے۔

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش دا سائیں
کامل مہر محبت والا' پالے آخر تائیں

یہ عظیم الشان تفسیر چار ہزار چار سو انتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ "تفسیر نبوی" کے علاوہ آپ نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں جو عوام میں مقبول ہوئیں۔

1۔ شفاء القلوب بالصلوۃ علی المحبوب (پنجابی اشعار)
2۔ خیر الہدی فی عدم الجمعۃ فی القری (اردو' عربی' فارسی)
3۔ الامتیاز بین الحقیقت والمجاز (اردو)
4۔ النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ (اردو)
5۔ مجموعۃ الرسائل اربعہ (اردو' پنجابی اشعار)
6۔ مجموعۃ الرسائل خمسہ (اردو' پنجابی اشعار)
7۔ رسالہ جامع الشواہد (اردو)
8۔ انتباہ المنکرین من الصلوۃ سید المرسلین (اردو)
9۔ احسان الاموات بالصدقات والاسقاط (اردو)
10۔ اطلاع الناس فی طلاق الثلاث (پنجابی' اردو)
11۔ اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ المحبین (اردو)
12۔ انواع نبوی (پنجابی اشعار)
13۔ سبیل الرشاد فی حق الاسناد (اردو)
14۔ تحصیل العرفان فی اداب المشائخ والاخوان (اردو)
15۔ مجموعہ نعت (غیر مطبوعہ)

حضرت مولانا نبی بخش حلوائیؒ نے چورانوے سال کی عمر میں 14 ذیقعدہ 1363ھ مطابق یکم نومبر 1944ء میں وفات پائی۔ آپ کو اپنی تعمیر کردہ دو منزلہ مسجد (نزد ٹی کوتوالی بیرون دہلی دروازہ لاہور) میں دفن کیا گیا "قد غفرلہ" سے آپ کی تاریخ وفات 1363ھ برآمد ہوتی ہے۔

حضرت مہر محمد صوبہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1364ھ/1945ء)

حضرت مہر محمد صوبہ" کے والد ماجد کا نام مہر نظام الدین تھا' جو لاہور کے آرائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے' تھوڑی سی زمین تھی جس پر کھیتی باڑی کر کے وہ بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

مہر محمد صوبہ" کا رجحان بچپن ہی سے اللہ کے دین کی طرف تھا۔ پانچ برس کے ہوئے تو مسجد میں قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے لئے بٹھا دیئے گئے۔ قرآن مجید کے بعد امام مسجد ہی سے اردو فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ آپ بچپن ہی سے نماز' روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ بالغ ہوئے تو والدین داغ مفارقت دے گئے۔ آپ کے دوسرے بھائی بھی ابھی چھوٹے تھے۔ آپ کو معاش کی فکر دامن گیر ہوئی تو آپ نے ملازمت اختیار کرلی۔

حضرت مہر محمد صوبہ" کے وصیت نامہ کے کچھ حصے "تذکرہ اولیائے لاہور" میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سے آپ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> "جس دن اللہ کریم نے مجھے پیدا فرمایا اور جو خاص فضل و کرم مجھ بندہ پر فرمائے۔ اگر میرا ہر بن ہزار ہزار زبان سے بھی اپنے مالک' رازق' مولائے کریم' ستار العیوب کا شکریہ ادا کرے' تو نہیں کر سکتا۔ جس اللہ نے مجھ جیسے بے ہنر' بے کس' مفلس' نادار' ناتواں اور بے یارومددگار عاجز بندے کو ہزاروں نعمتیں دین و دنیا کی عطا فرمائیں۔ جن کا میں کسی طرح بھی مستحق نہ تھا۔ ماں باپ وہ عطا فرمائے' جو مجھ پر بہت ہی مہربان تھے۔ مادر مہربان کی شفقت والی گود

میں پرورش پاتا رہا۔ والد کے سایہ عاطفت میں بالغ ہوا۔ کسی طرح کی تکلیف نہ دیکھی۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔"

اسی وصیت نامے میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

"میں آغاز زمانہ بلوغت میں "اورادِ فتحیہ" پڑھا کرتا تھا' اور میری یہ تین دعائیں تھی۔ پہلی یہ کہ مجھے صحت عطا ہو۔ دوسری یہ کہ مجھے کوئی پیر کامل ملے اور تیسری یہ کہ مجھے آبائی پیشہ میں سرفراز کیا جائے۔"

وصیت نامہ مملوکہ میاں نذیر احمد بیرہ)

حضرت مہر محمد صوبہ سکنہ شادباغ لاہور۔ بحوالہ تذکرہ اولیائے لاہور صفحہ (412-413) لاہور کے نواح میں آپ کے والد ماجد کی جو زمین تھی' وہ رہن رکھی ہوئی تھی' آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ وہ زمین انہیں مل جائے' تاکہ اس پر کاشت کاری کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور رہن پر رکھی ہوئی یہ زمین آپ کو واپس مل گئی' جس پر آپ نے کاشت کاری شروع کرائی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں خوب برکت دی۔ بعد ازاں آپ نے مزید زمینیں ٹھیکے پر لے کر کاشت کروائیں۔ اس شراکت میں آپ کے ساتھی مہر میراں بخش اور مہر محمد دین کا چھو تھے۔ علاقہ گھوڑے شاہ کے گردونواح کی تمام زمین آپ کے زیر کاشت رہی۔

مرشد کی تلاش

اس زمانے میں حضرت خواجہ غلام مرتضٰی نقشبندی" کا بڑا شہرہ تھا۔ جو شیرانوالہ گیٹ کے باہر محلّہ عثمان گنج میں رہتے تھے۔ بے شمار خلقت ان کے حلقہ ارادت میں داخل تھی۔ ایک روز آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حلقہ بیعت میں شامل ہوگئے۔ مرشد کامل نے آپ کو نقشبندی سلسلہ کے اوراد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ اس کے بعد آپ کا معمول ہوگیا کہ آپ ہر روز مرشد کامل کی خدمت میں حاضری دیتے۔ بہت جلد آپ اپنے ذوق وشوق اور ریاضت و عبادت کے باعث مرشد کامل کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ جب مرشد نے دیکھا کہ آپ سلوک میں کامل ہوگئے ہیں تو آپ کو خرقہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس کا ذکر اپنے وصیت نامے میں آپ اس طرح

کرتے ہیں۔

"ایسا پیر کامل' اعلیٰ عاشق رسول ﷺ جن کا درجہ فنائی الرسولؐ تھا۔ اللہ نے مجھے عطا فرمایا۔ جس کی نظر عنایت نے دونوں جہاں تار دیئے (یعنی دارین کی کامیابی عطا فرمائی) خداوند کریم نے ان کو مجھ پر ایسا مہربان کیا کہ تمام مریدین ماسلف ومابعد ہر اس عاجز کو اپنی کمال شفقت سے اس قدرت ممتاز فرمایا کہ مجھے خلیفہ مقرر فرمایا' سینکڑوں اشخاص امیر غریب' عالم فاضل' سید قریشی میرے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی حلاوت اور عبادت کی چاشنی عطا فرمائی۔ درد وسوز اور عشق رسولؐ حاصل ہوا اور یہ سلسلہ تاقیامت انشاء اللہ حضرت صاحب کی عنایت سے جاری رہے گا۔ (حوالہ ایضاً صفحہ 414)

معمولات

آپ روزانہ نصف شب کے بعد بیدار ہوتے اور نماز تہجد ادا کرتے۔ پھر فجر تک مراقبہ میں مشغول رہتے۔ نماز فجر کے بعد ذکر کرتے۔ جب سورج طلوع ہوتا تو اشراق کے بعد ناشتہ فرماتے۔ پھر عام لوگوں میں بیٹھ جاتے۔ ان کے لئے دعائے خیر کرتے اور جس کا جو مسئلہ بھی ہوتا' اسے حل فرماتے۔ ان سے فارغ ہوکر زمینوں پر جاتے۔ پھر اپنے پیر ومرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رات گئے تک ان کی خدمت اقدس میں حاضر رہتے۔ حاضری کا یہ معمول مرشد کے وصال تک جاری رہا۔

آپ تمام نمازیں محلہ کی مسجد میں ادا کرتے۔ آپ زیادہ تر اسم اعظم کا ورد کرتے' جو ہر سانس کے ساتھ جاری رہتا۔ قصیدہ بردہ شریف ہر روز باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے تھے اور خاص خاص احباب کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔

حج بیت اللہ

1919ء میں آپ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے بحری جہاز کے ذریعے حجاز حاضر ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد آپ مدینہ شریف کے لئے روانہ ہوئے۔ مدینۃ الاولیاء کے مؤلف نے لکھا ہے کہ مدینہ شریف جاتے ہوئے راستہ میں ڈاکوؤں نے آپ کو آلیا۔ پریشانی کے اس ہنگامہ میں آپ نے گنبد خضرا کی طرف منہ

کر کے بہ آواز بلند دعا کی کہ یاالٰہی! ان ڈاکوؤں کے شر سے ہمیں محفوظ رکھ۔ اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ سب ڈاکو آپ کے مطیع ہوگئے اور اس درجہ مہربان ہوئے کہ خود منزل مقصود تک پہنچا کر واپس ہوئے۔

شعروشاعری کا ذوق

اکثر صوفیائے کرام کی طرح آپ کو شعروشاعری سے شغف تھا۔ نعتیہ اور عارفانہ کلام سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ میرے دوست ابوظفر سید نازش رضوی مرحوم جنہیں اللہ تعالیٰ نے لحن داؤدی عطا فرمایا تھا۔ اکثر حضرت مہر محمد صوبہؒ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ موصوف مجھے بتایا کرتے تھے کہ حضرت مہر محمد صوبہؒ کو اکثر اردو اور فارسی شعراء کی نعتیں ازبر تھیں۔ آپ اپنے مکان (اندرون دہلی دروازہ) میں اکثر نعت کی محفل منعقد کراتے تھے۔ جن میں میں (نازش رضوی) بھی شریک ہوتا اور اپنی نعتیں سناتا۔ حضرت مہر محمد صوبہؒ خود بھی پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام (جو پنجابی شاعری کی مشہور صنف سی حرفی میں تھا) ملک سراج دین اینڈ سنز پبلشرز نے کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا تھا۔

حلیہ مبارک اور خوراک

آپ میانہ قد اور جسمانی اعتبار سے دبلے پتلے تھے۔ داڑھی شریعت کے مطابق تھی۔ بہت زیادہ لمبی داڑھی نہ رکھتے تھے۔ عموماً لمبا کرتا اور تہمد پہنتے۔ سر پر نقشبندی ٹوپی اور اس پر پگڑی باندھتے۔ کاندھے پر رومال رکھتے۔ خوراک بہت سادہ اور قلیل استعمال فرماتے۔ آپ کی پسندیدہ سبزی شلغم تھی۔ سونے سے پہلے تھوڑا سا دودھ ضرور پیتے تھے۔

آپ نے 8 فروری 1945ء مطابق 24 صفر 1364ھ میں وفات پائی۔ آپ کو کوٹ خواجہ سعید کے قبرستان میں دفن کیا گیا' لیکن ساڑھے پانچ برس بعد آپ کے عقید تمندوں نے رات کی تاریکی میں آپ کے جسد مبارک کو وہاں سے نکال کر قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا۔ اور قبر پر نہایت عالیشان گنبد تعمیر کرایا۔

قبرستان میانی صاحب (بہاولپور روڈ) میں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ لحد مبارک پر سنگ مرمر کی لوح نصب ہے۔ جس پر تاریخ وفات 8 فروری 1945ء درج ہے۔

آپ کے خلفاء میں شیر علی خان' میاں کرم الٰہی آپ کے (چھوٹے بیٹے) اور رجب

علی خاں نے آپ کے سلسلۂ طریقت کو آگے بڑھایا۔

خدا کی رحمتیں ان پاک بندوں کے مزاروں پر
کہ صبح وشام خلقت فیض پاتی ہے جہاں جاکر

حضرت آغا سید تجمل حسین رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1366ھ / 1947ء)

مزار مبارک آپ کا حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے سرہانے دائیں طرف ہے۔ آپ حضرت سید سکندر شاہ" کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ سید سکندر شاہ" حضرت شاہ محمد غوث" کی اولاد سے تھے اور سلسلہ قادریہ میں شیخ المشائخ سید اکبر شاہ المعروف آغا پیر جان پشاوری" سے بیعت تھے۔ انہی نے خلافت بھی حاصل کی تھی۔ سلسلہ چشتیہ کے فیوض و برکات حضرت شمس العارفین خواجہ شمس الدین سیالوی" سے حاصل کئے تھے۔ حضرت سید سکندر شاہ" کی خدمت میں حاضر ہونے والوں اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرنے والوں میں حضرت میاں شیر محمد شرقپوری" ' حضرت مولانا غلام قادر بھیروی" اور حضرت مولانا سراج الدین چشتی" جیسے نامور بزرگوں کے نام ملتے ہیں۔

حضرت آغا تجمل حسین المعروف آغا گل صاحب" اپنے بڑے بھائی حضرت آغا سید محمد سعید جان" کی وفات کے بعد صاحب سجادہ ہوئے۔ آپ کی پیدائش پشاور میں 1891ء میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے عالم' فقیہہ اور معقولی تھے۔ بڑے بڑے اکابر علماء سے تکمیل علوم کیا تھا۔ فقہ' منطق اور فلسفہ مولانا محمد احسن المعروف حافظ دراز صاحب سے پڑھے تھے۔ حدیث شریف شیخ المحدثین مولانا محمد ایوب اور صوبہ سرحد کے معروف محدث مولانا عبدالقادر سے پڑھ کر سند فضیلت حاصل کی۔ تفسیر خطیب مسجد اہل حدیث مولوی محمد عثمان سے پڑھی۔ آپ اپنے والد ماجد حضرت سید سکندر شاہ" کے مرید و خلیفہ تھے۔ چونکہ انہوں نے سلسلہ چشتیہ کے فیوض و برکات حضرت خواجہ شمس العارفین سیالوی" سے حاصل کئے تھے' اس لیے سماع سے بھی خصوصی شغف تھا۔ محفل سماع میں آپ پر عجیب کیفیت وارد ہوتی۔ آپ توحید وجودی کا مسلک رکھتے تھے۔ طبیعت مبارک پر سوز و گداز اور عشق الٰہی کا جذبہ غالب رہتا تھا۔ آپ کی زندگی کا اکثر حصہ استغراق اور محویت میں

گزرا۔ حضرت محمد امیر شاہ قادری گیلانی سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ محمد غوث" "تذکرہ مشائخ قادریہ حسنیہ" میں لکھتے ہیں کہ آخری مرتبہ 1946ء میں جب یہ عالم وارد ہوا' تو چھ ماہ تک نہ کھانے پینے کی خبر رہی' نہ ہی بول و براز کیا۔ (اس وقت آپ تبلیغ و ارشاد کے سلسلہ میں چونیاں ضلع قصور میں مقیم تھے۔) اسی جذب کے عالم میں حضرت نور المشائخ ملا صاحب شور بازار" کابل سے آپ کو ملنے کے لیے آئے' مگر آپ نے ان سے کوئی بات وغیرہ نہیں کی۔ حضرت نور المشائخ نے آپ کے لیے دعا کی اور واپس ہوئے۔ اسی استغراقی حالت میں 21 رمضان المبارک 1366ھ مطابق 8 اگست 1947ء کو چونیاں میں وصال فرمایا۔ وہاں سے آپ کی میت لاہور لائی گئی اور احاطہ درگاہ حضرت شاہ محمد غوث" میں تدفین ہوئی۔

"مدینۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ حضرت آغا سید تجمل حسین" نے سلسلۂ عالیہ قادریہ کی تبلیغ کے لیے پشاور اور لاہور میں لنگر کھول رکھے تھے۔ آپ زہد و ورع اور نیکو کاری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ آپ سے استفادہ کرنے والوں میں خواجہ محمد قاسم موہڑوی"' سید وارث حسن شاہ صابری لکھنوی" اور حضرت مجذوب گوالیاری" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (ص 254)

"خفتگان خاک لاہور" کے مصنف پروفیسر محمد اسلم نے لکھا ہے کہ تحریک پاکستان کے عظیم قائد اور پنجاب کے پہلے مسلمان گورنر سردار عبدالرب نشتر' آغا سید تجمل حسین" کے مرید تھے۔ (صفحہ 446)' لیکن کسی معاصر تذکرہ سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

مسجد درگاہ حضرت شاہ محمد غوث" کے امام حافظ محمد سلیم نے راقم الحروف کو یہ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ سردار عبدالرب نشتر (جب وہ پشاور میں وکالت کرتے تھے) آغا سید تجمل حسین المعروف آغا گل صاحب" سے ملنے کے لیے آئے' ان دنوں آغا گل صاحب" درگاہ حضرت شاہ محمد غوث" سے متصل ایک مکان میں مقیم تھے۔ اتفاق سے دوپہر کے وقت جب سردار عبدالرب نشتر" آئے تو آغا گل صاحب" صاحب سو رہے تھے۔ خادم نے بتایا کہ آغا گل صاحب قیلولہ فرما رہے ہیں' سردار نشتر وہیں ایک چارپائی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے' تھوڑی دیر کے بعد کسی دوسرے آدمی نے خادم کو یاد دلایا کہ یہ صاحب (سردار عبدالرب نشتر) بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں' آغا گل صاحب کو اطلاع کر دو۔ خادم نے اپنی دانی

سے کہا: اگر انتظار کر رہے ہیں' تو کیا ہے! یہ کوئی گورنر تو نہیں ہیں۔ اس اثناء میں آغا گل صاحب بیدار ہو چکے تھے' اتفاق سے خادم کا یہ جملہ انہوں نے سن لیا کہ "یہ کوئی گورنر تو نہیں ہیں۔" آغا گل نے فوراً خادم کو آواز دی: "عجب خان! سردار عبدالرب نشتر کو فوراً میرے پاس لاؤ۔" سردار نشتر اندر آئے تو آغا گل صاحب" نے عجب خاں سے کہا:

"عجب خان! تم نے کیا کہا تھا کہ "یہ کوئی گورنر تو نہیں ہیں۔" میری بات یاد رکھنا' سردار نشتر مستقبل کے گورنر ہیں۔"

سردار عبدالرب نشتر نے اپنی آپ بیتی "آزادی کی کہانی' میری زبانی" میں آغا سید تجمل حسین کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کیا ہے اور انہیں اپنا عظیم محسن قرار دیا ہے۔ اپنے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے سردار صاحب لکھتے ہیں:۔

"1920ء میں' میں نے ایف اے کا امتحان دیا' لیکن امتحان سے چند دن قبل بیمار ہو گیا' اس لیے نتیجہ نکلا تو تاریخ کے مضمون میں فیل تھا۔ اس کے بعد میں امتحان دینا چاہتا تھا' لیکن والد خفا ہو گئے اور مجھے مزید پڑھانے سے انکار کر دیا۔ کچھ عرصہ یونہی پھرتا رہا۔ والد کی خواہش تھی کہ مجھے کہیں سرکاری ملازمت مل جائے' لیکن میرے دل میں تعلیم کی خواہش تھی۔ میرے ایک نہایت شفیق دوست تھے' جن کا نام آغا سید تجمل حسین تھا۔ قادری چشتیہ سلسلہ کے تھے۔ گیلانی سید تھے' حضرت شاہ محمد غوث صاحب" جن کا مزار شریف لاہور میں ہے ان کی اولاد میں سے تھے.......... یہ میرے مخلص ترین دوست تھے۔ اگرچہ تعلق تو اس خاندان اور ان کے تمام مریدین سے تھا' لیکن آغا سید تجمل حسین صاحب اور لالہ عبدالرشید کے ساتھ میرے تعلقات حقیقی بھائیوں کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تھے۔ سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ منشی فاضل کا امتحان دے دو۔ چنانچہ دو تین ماہ میں تیاری کی اور منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔ پھر میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان 1923ء میں پاس کر لیا۔ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے بھیج دیا گیا۔"

سردار عبدالرب نشتر کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا گل صاحب مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ترقی کے میدان میں آگے بڑھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ انہیں ہمیشہ اچھے مشورے دیتے رہتے تھے۔ سردار نشتر مرحوم نے بھی ان کے

نیک مشورہ پر عمل کر کے کامیابی حاصل کی۔

حضرت آغا گل صاحب" کے مزار اقدس پر جو لوح مزار ہے، اس پر یہ عبارت درج ہے:۔

یا اللہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ہم یحزنون

قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، سند الواصلین

آفتاب اہل محبت، حضرت آقا سید تجمل حسین صاحب

حسنی حسینی قادری چشتی بن منبع صدق و صفا

معدن جود و سخا قطب زماں زینت الاولیاء حضرت سید

سکندر شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ پشاوری

چوں تجمل حسین آقا یم

پیکر فقر و مخزن عرفاں

جاں شیریں بحق سپرد آں روز

بود شنبہ و بست و یک رمضان

گفت تاریخ رحلتش نشتر

"مشعل معرفت دل ایماں"

1366ھ

در کوئے تو عاشقاں چناں جاں بدہند

کانجا ملک الموت نہ گنجد ہرگز

وصال شریف [redacted] اگست 1947ء / 21 رمضان 1366ھ

پنجاب کے نیک دل، پاک باز اور درویش صفت گورنر سردار عبدالرب نشتر کے اس قطعہ تاریخ کا لفظ لفظ محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، جس سے ان کا قلبی تعلق بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

آغا سید تجمل حسین رحمتہ اللہ علیہ نے وصال کے وقت دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔

(1) سید احمد شہ۔ (2) سید علی جواد۔

ابوالنجم ملک ایاز غزنوی ثم لاہوری رحمتہ اللہ علیہ

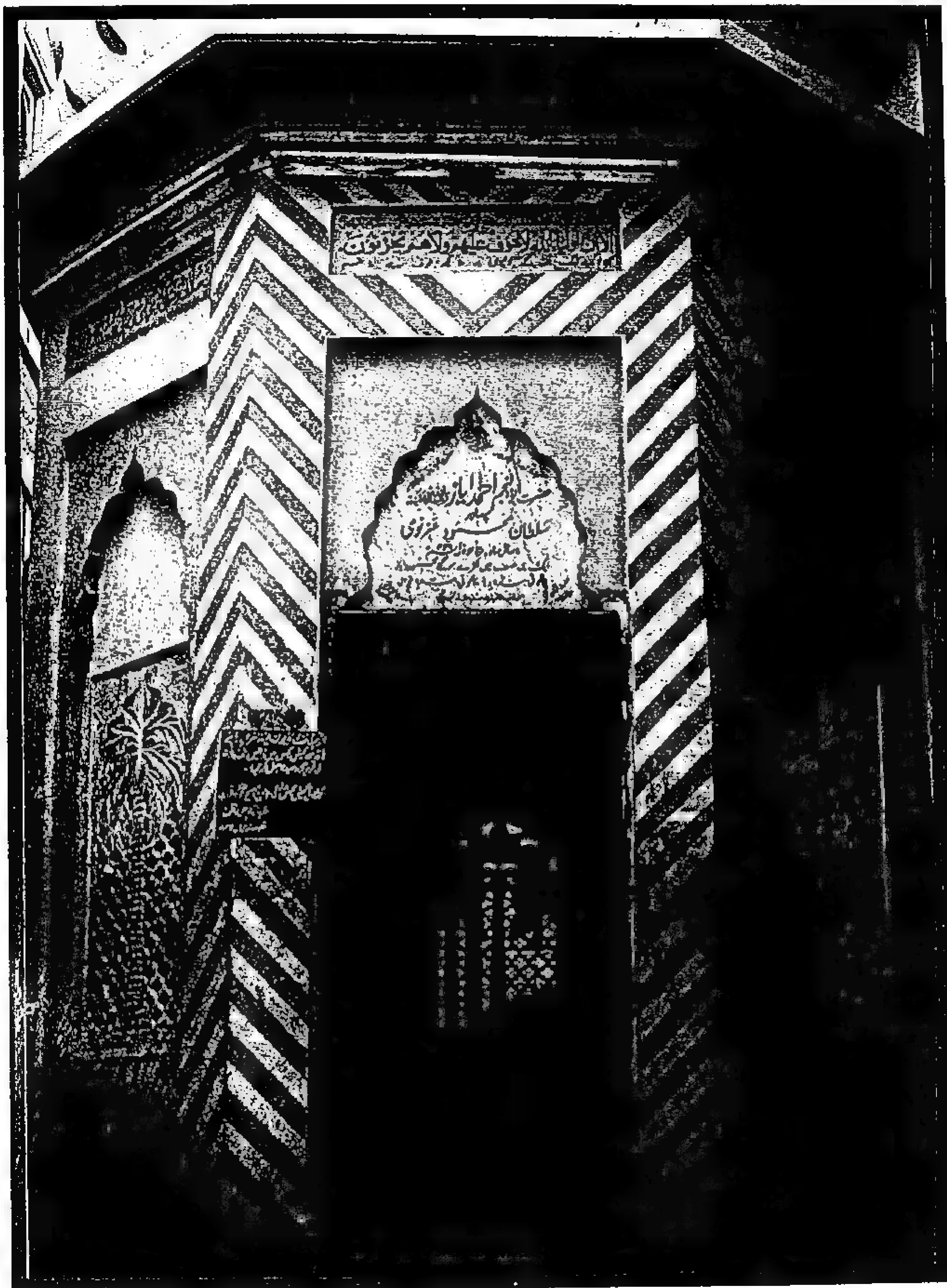
(المتوفی 449ھ)

سلطان محمود غزنویؒ اپنے دارالحکومت غزنی میں تخت شاہی پر جلوہ افروز تھا۔ امرائے شاہی ادب سے حاضر تھے۔ اطلاع ملی کہ ترکستان کے تاجر بہت سے غلام لے کر حاضر ہوئے ہیں' اور باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔ سلطان نے اجازت مرحمت فرمائی' تاجر حاضر ہوئے ان کے ساتھ نہایت خوبصورت اور کم عمر غلام تھے' سلطان نے ان سب غلاموں کو ایک نظر دیکھا پھر چند امرائے شاہی کو حکم دیا کہ غلاموں کو خرید لیا جائے اور تاجروں کو خزانہ شاہی سے منہ مانگی قیمت ادا کر دی جائے۔

یہ کل 120 غلام تھے۔ امرائے شاہی نے ان میں سے ایک سو انیس (119) غلام پسند کر لیے' ایک غلام جو بیمار تھا اور دوسرے غلاموں کی نسبت قدرے کمزور بھی تھا' اسے رد کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر بیمار اور کمزور غلام رونے لگا اور اسی طرح روتے روتے ترکستان کے تاجروں کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا۔

سلطان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایک غلام جسے شاہی گماشتوں نے رد کر دیا ہے زار و قطار روتا ہوا واپس چلا گیا ہے تو اس کا جی بھر آیا۔ فوراً شاہی سواروں کو تاجروں کے پیچھے دوڑایا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں' انہیں واپس بلا لائیں۔

تاجر حاضر ہوئے تو سلطان نے دیکھا کہ وہ بیمار غلام اب بھی زار و قطار رو رہا ہے۔ سلطان نے پوچھا: تم کیوں روتے ہو؟ غلام بولا۔ بادشاہ سلامت! اس لیے کہ میں بیمار اور کمزور ہونے کے باعث دربار شاہی کے لائق نہیں سمجھا گیا اور اس طرح آپ جیسے عادل سلطان کی خدمت سے محروم ہو گیا۔ یہ سن کر سلطان نے تاجروں سے فرمایا کہ میں نے 119 غلام تو اپنے لئے خریدے ہیں' لیکن اس غلام کو محض اللہ کی خاطر خریدتا ہوں۔



مزار حضرت ابوالنجم ملک ایازؒ

گر تو مرد طالبی و حق شناس
بندگی کردن بیاموز از ایاس

حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ

اللہ کی خاطر خریدے جانے والے اس کمزور اور بیمار غلام کا نام ایاز تھا۔ جو بعد میں سلطان محمود غزنوی" کا معتمد خاص بنا اور ابوالنجم اور امیر الملک جیسے معزز خطاب شاہی سے سرفراز ہوا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کا نسبتی رشتہ دار بھی بنا اور اسلامی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ بھی مقرر ہوا۔

محمود غزنوی کوئی معمولی حکمران نہ تھا۔ اس کے رعب و جلال اور ہیبت شاہی سے سلاطین زمانہ لرزہ براندام تھے۔ اس کی سلطنت منگولیا کے کناروں سے لے کر عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب اس نے ہندوستان کا رخ کیا تو قنوج اور سومنات جیسے ناقابل تسخیر علاقوں کی خاک اڑا دی۔ اس اولوالعزم اور بہادر سلطان کے غلام ایاز نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی اعلیٰ استعداد' بے مثل وفاداری اور خداداد خوبیوں کے باعث سلطان کے دل میں اپنا گھر بنا لیا۔ ایاز شکل و صورت کے اعتبار سے کوئی ایسا انسان نہ تھا کہ سلطان اسے اپنے دل میں جگہ دیتا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے جس حسین سیرت اور اعلیٰ دماغ سے نوازا تھا ان کے باعث وہ واقعی غیر معمولی انسان تھا۔

حضرت خواجہ فرید الدین عطار" "منطق الطیر" میں ملک ایاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آں ایاز خاص را محمود خواند
تاجدارش کرد بر تختش نشاند
ہر کسے می گفت شاہے با غلام
در جہاں ہرگز نداد ایں احترام
لیک آں ساعت ایاز ہوشیار
میگر یست از کار سلطاں زار زار

(یعنی سلطان محمود غزنوی نے اپنے غلام ایاز کو بلایا اور اس کے سر پر تاج رکھ کر تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت سب کی زبان پر یہی تھا کہ دنیا میں کسی بادشاہ نے اپنے غلام کی اس قدر عزت افزائی نہیں کی' لیکن ایاز اس وقت بھی کہ ہوشیار اور حقیقت آشنا تھا۔

سلطان کی اس عزت افزائی کے باوجود زار و قطار رو رہا تھا۔)

میدہد مشغولیم تا من ز شاہ
باز مانم دور و مشغول سپاہ
من چہ خواہم کرد ملک و کار او
مملکت من بس بود دیدار او

(وہ اس خیال سے رو رہا تھا کہ سلطان محمود نے مجھے سالار افواج بنا کر ایسے کام میں مشغول کر دیا ہے' جس کے باعث میں سلطان سے دور ہو جاؤں گا۔ مجھے مملکت کے دھندوں سے کیا غرض؟ میری دولت تو سلطان کا دیدار ہے۔)

اس کے بعد حضرت خواجہ عطارؒ اس حکایت سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتے ہیں:

گر تو مرد طالبی و حق شناس
بندگی کردن بیاموز از ایاس

(یعنی اگر تو اپنی طلب میں صادق اور واقعی مرد حق شناس ہے تو ایاز (ایاز) سے بندگی کا طریقہ سیکھ)

ایاز کے بلند مقام اور اعلیٰ صلاحیتوں کو جاننے کے لیے فرخی کے اس قصیدہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو اس نے ملک ایاز کی شان میں لکھا تھا۔ یہ قصیدہ اس وقت لکھا گیا' جب سلطان محمود غزنوی وفات پا چکا تھا۔ حافظ محمود شیرانی نے تنقید شعر العجم میں لکھا ہے کہ فرخی نے یہ قصہ 421ھ میں کہا تھا۔

امیر و جنگجو ایاز و او یماق
دل و بازوئے خسرو وقت پیکار
سوارہ کرد در میدان در آید
ز پا اندر فتد دلہائے نظار
یکی گوید کہ آں سروست بر کوہ
دگر گوید گل تازہ است ہر بار

دلیران از نہیبش روز کوشش
ہمی لرزند چوں برگ سپیدار
اگر بر سنگ خارا بر زند تیر
بسنگ اندر نشاند تا بہ سو فار
نہ بر خیرہ باو دل داد محمود
دل محمود را بازی پندار

(یعنی ایاز وہ جنگجو سردار ہے' جو جنگ کے وقت بادشاہ کا دل بھی ہے اور بازو بھی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں نکلتا ہے تو دیکھنے والے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دیکھو پہاڑ پر سرو کا درخت تنا کھڑا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ وہ ایسا گل ہے' جو ہر دم تازہ ہے۔ جنگ کے وقت اس کے حملوں اور مار دھاڑ کے باعث ہر دلیر پر یوں لرزہ طاری ہو جاتا ہے' جیسے وہ درخت سپیدار کا پتہ ہو۔ اگر وہ ٹھوس چٹان کو اپنا نشانہ بنائے تو تیر سو فار تک چٹان میں دھنس جاتا ہے۔ آخر سلطان محمود نے اسے یونہی بے سوچے سمجھے تو اپنا دل نہیں دے دیا تھا۔)

ملک ایاز 390ھ میں سلطان محمود کے دربار میں پہنچا تھا' جبکہ اس کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ محمود نے 421ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ملک ایاز کی عمر اڑتالیس سال کی تھی۔ گویا ایاز کا سن پیدائش 373ھ کے لگ بھگ ہے۔ ایاز کو سلطان محمود کی طبیعت میں اس قدر دخل حاصل ہو گیا کہ سلطان نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر بہت جلد اسے زمرۂ امراء میں شامل کر لیا اور اس سے نسبتی رشتہ بھی قائم کر لیا یعنی ایاز کی ہمشیرہ سے شادی کر لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایاز کا کنبہ بھی بعد میں غزنی ہی میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ سلطان محمود نے ایاز کو ابوالنجم اور امیر الملک کے خطابات سے نوازا اور ہندوستان میں اسے بارہ ہزار فرسنگ کی جاگیر بھی عطا فرمائی۔

سلطان محمود کی وفات کے وقت اس کا ایک بیٹا مسعود اصفہان میں تھا اور دوسرا بیٹا

محمد جوز جاناں میں۔ محمد چونکہ نسبتاً پایہ تخت کے قریب تھا' اس لیے اس نے فوراً غزنی پہنچ کر تخت و تاج پر قبضہ کرلیا۔ سلطان محمد نہایت عیاش تھا۔ پروفیسر مرزا منور نے سرگزشت ایاز میں "مجمع الانساب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود نے آخری عمر میں سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہند اور سندھ' غزنی' کابل وغیرہ کے علاقے محمد کو دے دیئے اور خراسان و عراق تاحد مغرب مسعود کے حوالے کر دیئے۔ (بحوالہ مضمون "سرگزشت ایاز" مطبوعہ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور مدیر خواجہ عابد نظامی' نومبر 1975ء)

سلطان محمد نے تخت پر قابض ہوتے ہی خزانوں کے منہ کھول دیئے اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ اس نے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو داد و دہش سے خوش کر دیا۔ یہ صورت حال ملک ایاز جیسے وفادار اور دیانتدار انسان کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ چنانچہ محمد کی حکومت کو ابھی پچاس دن ہی ہوئے تھے کہ ملک ایاز نے دوسرے امرائے دربار سے مل کر اس کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ اس کے نزدیک عیاش حکمران اسلامی سلطنت کا حکمران بننے کا اہل نہ تھا۔ ایک رات وہ چپکے سے چند ساتھیوں کے ساتھ مسعود کے پاس اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلطان محمد کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے اپنے ہندو جرنیل سوندھ روئے کو ایک لشکر جرار دے کر تعاقب میں بھیجا' لیکن ایاز کی قیادت اور شجاعت کے آگے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ سوندھ رائے خود بھی مارا گیا اور اس کے بے شمار ساتھی بھی کھیت رہے۔ جن کے سر اس نے سلطان محمد کے پاس بھجوا دیئے۔ ادھر مسعود کو یہ حال معلوم ہو چکا تھا اور وہ اصفہان سے نیشاپور تک آ چکا تھا۔ یہیں ملک ایاز نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلامی سلطنت کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس اثناء میں بعض دوسرے امرائے سلطنت نے سلطان محمد کی ناشائستہ حرکات سے تنگ آ کر اسے گرفتار کر لیا اور قید میں ڈال دیا۔ اب رستہ صاف تھا' چنانچہ سلطان مسعود نے غزنی واپس پہنچ کر تخت شاہی پر جلوس کیا۔

427ھ میں سلطان مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا حاکم بنا کر بھیجا' تو ایاز کو اس کا اتالیق و مشیر بنا کر ہمراہ روانہ کیا۔ مجدود نے ایاز کے صلاح مشورے سے تھانیسر اور ہانسی تک کے تمام علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اس کے ساتھ ہی ملک ایاز نے

لاہور کے استحکام اور عوام کی بہبود و خوشحالی کے لیے بھی بھرپور کوششیں کیں۔

مسعود غزنوی کی وفات کے بعد ملک ایاز کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے "حدیقۃ الاولیاء" کے مولف نے لکھا ہے: جب مسعود فوت ہو گیا' اور اس کا بیٹا مودود تخت نشین ہوا' تو مجدود نے اس کے خلاف بغاوت کر کے ہندوستان میں اپنی علیحدہ سلطنت قائم کر لی۔ ایاز نے مجدود کو سمجھایا' لیکن وہ نہ مانا' چنانچہ مودود فوج لے کر اس پر چڑھ آیا۔ جب لاہور کا محاصرہ ہوا تو بروز عید ناگاہ مجدود بمرگ مفاجات فوت ہو گیا اور مودود نے اپنا تسلط پنجاب پر قائم کر لیا۔ مودود نے بہت کوشش کی کہ وہ ایاز کو اپنے ہمراہ غزنی لے جائے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کرے' لیکن ایاز نے منظور نہ کیا اور تارک الدنیا ہو کر صحبت فقرا اختیار کی اور بزرگوں سے فیض کامل حاصل کیا' اور بے انتہا دولت جو اس کے پاس تھی' وہ اس نے براہ خدا غربا میں لٹا دی۔ یہ بزرگ (ایاز) بانی لاہور شمار کیا جاتا ہے' کیونکہ جب لاہور پر سلطان محمود غزنوی نے یورش کی اور راجہ اننگ پال (راجہ جے پال کا بیٹا) تھوڑے سے مقابلے کے بعد ہند کو بھاگ گیا' تو محمود کی فوج نے اس شہر کو لوٹ لیا اور رعایا جس قدر تھی' سب کی سب لاہور سے نکل گئی۔ شہر میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ اس وقت ملک ایاز نے اس شہر کو پھر آباد کیا' اور رعایا کو دور دور سے طلب کر کے اس میں قیام پذیر کیا۔

ابوالنجم امیر ملک ایاز کی وفات لاہور میں ہوئی۔ ابن اثیر نے تاریخ وفات ماہ ربیع الاول 449ھ (1057ء) لکھی ہے۔ (بحوالہ ماثر لاہور ص: 36)۔ اس وقت فرخ زاد جمال الدولہ غزنی کا بادشاہ تھا اور لاہور کا حاکم ایک غزنوی سردار تھا۔

امیر ایاز 427ھ میں مجدود کا اتالیق و مشیر بن کر ہندوستان میں آیا تھا۔ اس طرح اس نے 22 برس تک اپنے عربی سلطان محمود کی سلطنت کے ہندی مقبوضات کی حفاظت کی۔ وفات کے وقت اس کی عمر 70 برس تھی۔

ملک ایاز کا مزار رنگ محل لاہور میں ہے۔ اس کی وفات کے بعد لاہور میں مسلمان مبلغین کو اشاعت و فروغ اسلام کے لیے جو امن و امان کا ماحول میسر آیا' یقیناً یہ حالات پیدا کرنے میں ایاز کا نہایت اہم اور نمایاں حصہ ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے "گنج تاریخ" میں لکھا ہے کہ ایاز لاہور کے قدیم بزرگوں میں سے ہیں' ان کا تعلق سلسلہ جنیدیہ سے تھا۔ ماثر لاہور کے مصنف نے لاہور کے حوالے سے ایاز کی ایک کرامت بھی لکھی ہے۔ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ۔

سلطان قطب الدین ایبک رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 607ھ/ 1210ء)

لاہور میں دو بادشاہ پیوند زمین ہیں' یعنی قطب الدین ایبک اور نور الدین محمد جہانگیر۔ ان میں قطب الدین ایبک ایسا نیک دل' متقی اور عبادت گزار بادشاہ تھا' جس کو ہم بلا تامل اپنی اس کتاب میں شامل کر سکتے ہیں۔ یہ بادشاہ نہایت منصف مزاج اور سخی تھا۔ سخاوت کا تو یہ حال تھا کہ لوگ اسے "لکھ بخش" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس بادشاہ نے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ اس کا ایک ایسا طرۂ امتیاز ہے جو مجبور کرتا ہے کہ ہم اس کتاب میں اس کا ذکر خیر کریں۔

سلطان قطب الدین ایبک 607 ہجری مطابق 1210ء میں چوگان کھیلتے ہوئے لاہور میں گھوڑے سے گر کر جان بحق ہوا۔ اس کا مقبرہ ہسپتال روڈ سے انار کلی جانے والی سڑک پر موجود ہے۔ اس سڑک کا نام ایبک روڈ ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ سلاطین دہلی کی حکومت غلاموں کی بادشاہت سے شروع ہوئی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام حکومت کے لیے غلام اور آقا میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ خاندان غلاماں کے نام سے مشہور ہونے والے ان بادشاہوں نے جس تدبر اور ہوشمندی سے ہندوستان پر حکومت کی اس کے باعث آج بھی ان کا نام ادب و تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ خاندان غلاماں کا آغاز قطب الدین ایبک سے ہوتا ہے۔ قطب الدین نسلاً ترک تھا۔ بچپن میں ایک سوداگر اس کو ترکستان سے نیشاپور لے آیا اور یہاں قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ قاضی فخر الدین' حضرت امام ابو حنیفہ" کی اولاد سے تھے اور نیشاپور کے حاکم بھی تھے۔ اپنے علم و فضل' دینداری اور تقویٰ کی بناء پر انہیں ابو حنیفہ ثانی کہا جاتا تھا۔

قاضی فخرالدین نے اس ترک بچے کو اپنے بچوں کے ساتھ پہلے قرآن مجید پڑھایا' پھر حدیث اور فقہ کی دوسری کتابیں پڑھائیں۔ اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے قطب الدین نے بہت جلد اپنی تعلیم مکمل کرلی پھر قاضی فخرالدین نے اسے گھڑسواری اور تیراندازی کی تعلیم دلائی۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق قطب الدین نے بہت جلد یہ سپاہیانہ تربیت حاصل کر لی۔ لیکن اتفاق سے قاضی فخرالدین کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے کسی بیٹے نے قطب الدین کو ان کی لیاقت اور مہارت کی بناء پر اسے سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان نے اسے بڑی قیمت دے کر خرید لیا۔ قطب الدین کو ایبک اس لیے کہتے تھے کہ اس کی ایک انگلی ٹوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اسے "ایبک شل" یعنی شل انگلی والا کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ "ایبک شل" کے بجائے صرف ایبک اس کے نام کا جزو بن گیا۔

قطب الدین ایبک اپنے اوصاف و محاسن کی وجہ سے بہت جلد سلطان شہاب الدین غوری کے درباریوں میں شامل ہو گیا۔ ایک رات سلطان نے کسی فتح کی خوشی میں بزم نشاط منعقد کی اور خوشی میں تمام درباریوں کو انعام میں سونے اور چاندی کے ظروف اور سکے عطا کئے۔ اس موقعہ پر سب سے زیادہ قطب الدین ایبک کو نوازا گیا لیکن جب یہ محفل ختم ہوئی' تو قطب الدین ایبک نے وہ تمام انعامات جو سلطان سے ملے تھے' غریبوں اور ادنیٰ غلاموں میں تقسیم کر دیئے۔ سلطان کو جب خبر ہوئی' تو وہ اپنے غلام کی اس عالی ظرفی اور فیاضی سے بہت خوش ہوا اور اسے اپنے امراء میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد سلطان نے اسے جس مہم پر بھی روانہ کیا۔ وہ کامیاب و کامران لوٹا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اس کے درجات بڑھتے چلے گئے۔

1191ء میں شہاب الدین غوری نے جب اجمیر فتح کیا۔ تو قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا۔ قطب الدین ایبک نے اس جلیل القدر عہدہ کے فرائض انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور بہت جلد میرٹھ' دہلی اور رن تھنبور کے علاقے بھی فتح کر لیے۔ چنانچہ 1193ء میں سلطان نے اس کو غزنی بلا کر اس کے کارناموں کی داد دی اور بے شمار قیمتی تحائف بھی عطا کئے۔ قطب الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گجرات' راجپوتانہ' بہار اور بنگال میں بھی فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سلطان شہاب الدین غوری کا غلام ہی سمجھتا تھا۔

شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود بن غیاث الدین اس کا شرعی وارث بنا تو اس نے قطب الدین کی عزت اپنے چچا سے بھی بڑھ کر کی۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اسے سلطان کا خطاب دیا اور اسے آزادی کا فرمان بھی بھجوایا۔ قطب الدین ایبک اس خلعت اور فرمان کے استقبال کے لیے دہلی سے لاہور آیا اور اپنی وفاداری کی یہ قدر و منزلت دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا۔ 18 ذیقعدہ 602 ہجری مطابق جون 1206ء کو وہ لاہور میں تخت نشین ہوا جس کے بعد ہندوستان کی سیاسی' تمدنی اور علمی تاریخ کا ایک نیا اور شاندار باب شروع ہوا۔ اس نے ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی۔ نہ صرف حدود سلطنت کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا بلکہ اپنے عدل و انصاف اور بہترین نظم و نسق کے باعث عوام کے دلوں کو بھی فتح کیا۔

"فخر مدبر" کا بیان ہے کہ "قطب الدین ایبک نے تائید ایزدی' حسن تدبر اور اصابت رائے سے اس ملک میں ایسا نظم و نسق قائم کیا اور ایسے قوانین و قواعد بنائے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ برابر بادشاہی اور حکمرانی کرتا رہا ہے اور عدل کی ایسی بنا ڈالی کہ اس کے لشکر میں ترک' غوری' خراسانی' خلجی' ہندوستانی' راجے اور ٹھاکر وغیرہ سب ہی تھے۔ لیکن کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ گھاس کی ایک پتی' ایک چپاتی یا جنگل سے ایک بکری یا آبادی سے کوئی ایک چڑیا پکڑ لیتا' یا رعیت میں سے کسی کا گھر برباد کرتا۔ اس کی عدل نوازی کے باعث شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔"

"فخر مدبر" یہ بھی لکھتا ہے کہ "سلطان خلفائے راشدین کے نمونے پیش نظر رکھتا تھا' وہ دیانت میں حضرت ابو بکرؓ کی پیروی کرتا تھا' عدل میں حضرت عمرؓ کی تقلید کرتا تھا' سخاوت میں حضرت عثمانؓ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتا تھا اور شجاعت و مردانگی میں حضرت علیؓ کی مثال سامنے رکھ کر سپہ گری کے جوہر دکھاتا تھا۔"

(بحوالہ بزم مملوکیہ ص: 7)

سلطان قطب الدین ایبک نے تمام غیر شرعی ٹیکسوں کو ختم کر کے صرف عشر لینے کا حکم جاری کیا اور ملک سے تمام نامشروع بدعتیں دور کر کے سنت کی پیروی کو رواج دیا۔ تاج الماثر کے مولف کے مطابق وہ شرع و سنت کی ترویج میں حنفی احکام کا خاص لحاظ رکھتا تھا۔

"بزم مملوکیہ" کے فاضل مولف سید صباح الدین عبدالرحمان نے بالکل درست

لکھا ہے کہ یہی وقت تھا' جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان میں قدم رنجہ فرما کر اس سرزمین کو اسلام کے انوار و تجلیات سے معمور کر رہے تھے۔ گویا ایک طرف وہ اپنی بے نفسی' سیرت کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی جلالت و عظمت قائم کر رہے تھے' تو دوسری طرف قطب الدین ایبک اپنی نبرد آزمائی' عدل گستری' شریعت نوازی اور رعیت پروری سے اسلام کی سطوت و حشمت کا سکہ بٹھا رہا تھا۔ دونوں کی نیتوں میں اخلاص تھا' اس لیے جس دین اور سیاست کا پرچم دونوں نے لہرایا' وہ اس سرزمین پر برابر لہراتا رہا۔ (بزم مملوکیہ: صفحہ 8) مختلف تذکروں اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عہد سلطنت میں سلطان کئی بار اجمیر شریف گیا۔

قطب الدین ایبک جود و سخا میں مشہور تھا۔ اس کی فیاضی و سخاوت کے واقعات ضرب المثل ہیں۔ اس کی داد و دہش صرف دربار تک محدود نہ تھی' بلکہ ہر محتاج اور ضرورت مند اس کی سخاوت سے فیض یاب ہوتا تھا' اپنے عہد میں وہ اپنے نام سے زیادہ "لکھ بخش" کے نام سے مشہور تھا۔

حضرت سیدہ بی بی فاطمہ گیلانی رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1016ھ/ 1607ء)

حضرت سید جیون شاہ" المعروف سید عبدالقادر ثالث گیلانی" کی صاحبزادی تھیں۔ لاہور میں سید عبدالقادر ثالث گیلانی" کی رہائش گزر لنگر خاں میں تھی' جہاں آج کل ہائی کورٹ کی عمارات واقع ہیں۔ حضرت ثالث گیلانی" وفات کے بعد مقبرہ حضرت شاہ چراغ" میں دفن ہوئے۔

حضرت سیدہ بی بی فاطمہ کو "بی بی کلاں" بھی کہا جاتا ہے' ان کا نکاح حضرت میراں محمد شاہ المعروف حضرت موج دریا بخاری سہروردیؒ سے ہوا' جو شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں لاہور تشریف لائے۔ بی بی فاطمہ" بڑی عبادت گزار' خلیق اور متقیہ خاتون تھیں۔ شرافت و نجابت آپ نے اب و جد سے ورثے میں پائی تھی۔ آپ سے کئی کرامات ظاہر ہوئیں۔ جن میں سے یہ بہت زیادہ مشہور ہے کہ ایک روز آپ نے اپنی چادر دھو کر دھوپ میں ڈالنی چاہی تاکہ وہ سوکھ جائے' لیکن عصر کا وقت تھا اور دھوپ اس وقت صرف صحن میں بیری کے درخت کی چوٹی پر تھی۔ آپ نے درخت کے پاس جا کر کہا: اے درخت! نیچا ہو جا تاکہ میں تجھ پر اپنی چادر بکھیر دوں' اور وہ سوکھ جائے۔ اللہ کی قدرت درخت پستہ قد ہو گیا اور بی بی صاحبہ نے بہ آسانی اپنی چادر اس پر ڈال دی۔ اس کے بعد وہ درخت پھر اونچا ہو گیا۔

آپ کے شوہر حضرت موج دریا بخاری" نے گھر کے صحن سے دیکھا کہ بی بی کی چادر سوکھنے کے لیے درخت کے اوپر پڑی ہے تو انہیں شک گزرا کہ شاید بی بی نے درخت کے اوپر چڑھ کر یہ سکھانے کے لیے ڈالی ہے۔ سخت غصے کی حالت میں گھر کے اندر تشریف لائے اور بی بی سے فرمایا کہ درخت پر چڑھ کر چادر کیوں ڈالی ہے۔ بی بی صاحبہ نے کہا: میں تو درخت پر نہیں چڑھی تھی' میں چادر ڈالنے لگی تھی' تو درخت نیچا ہو

گیا تھا۔ حضرت نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو پھر اسی طرح درخت سے چادر اتار کر دکھاؤ۔ بی بی صاحبہ درخت کے پاس گئیں، تو درخت پھر پہلے کی طرح پست قد ہو گیا اور بی بی صاحبہ نے بڑی آسانی سے اپنی چادر اتار لی۔

حضرت موج دریا بخاریؒ نے حیرت سے پوچھا: یہ مرتبہ کس طرح پایا؟ بی بی صاحبہ نے فرمایا: اللہ کی اطاعت سے۔ حضرت نے فرمایا: سچ ہے، جو اللہ کا ہو جاتا ہے، ہر چیز اس کی غلام ہو جاتی ہے۔

حضرت بی بی صاحبہ کے بطن سے دو صاحبزادے تولد ہوئے۔ (ا) سید صفی الدین گیلانی اور (۲) سید بہاؤ الدین گیلانی۔

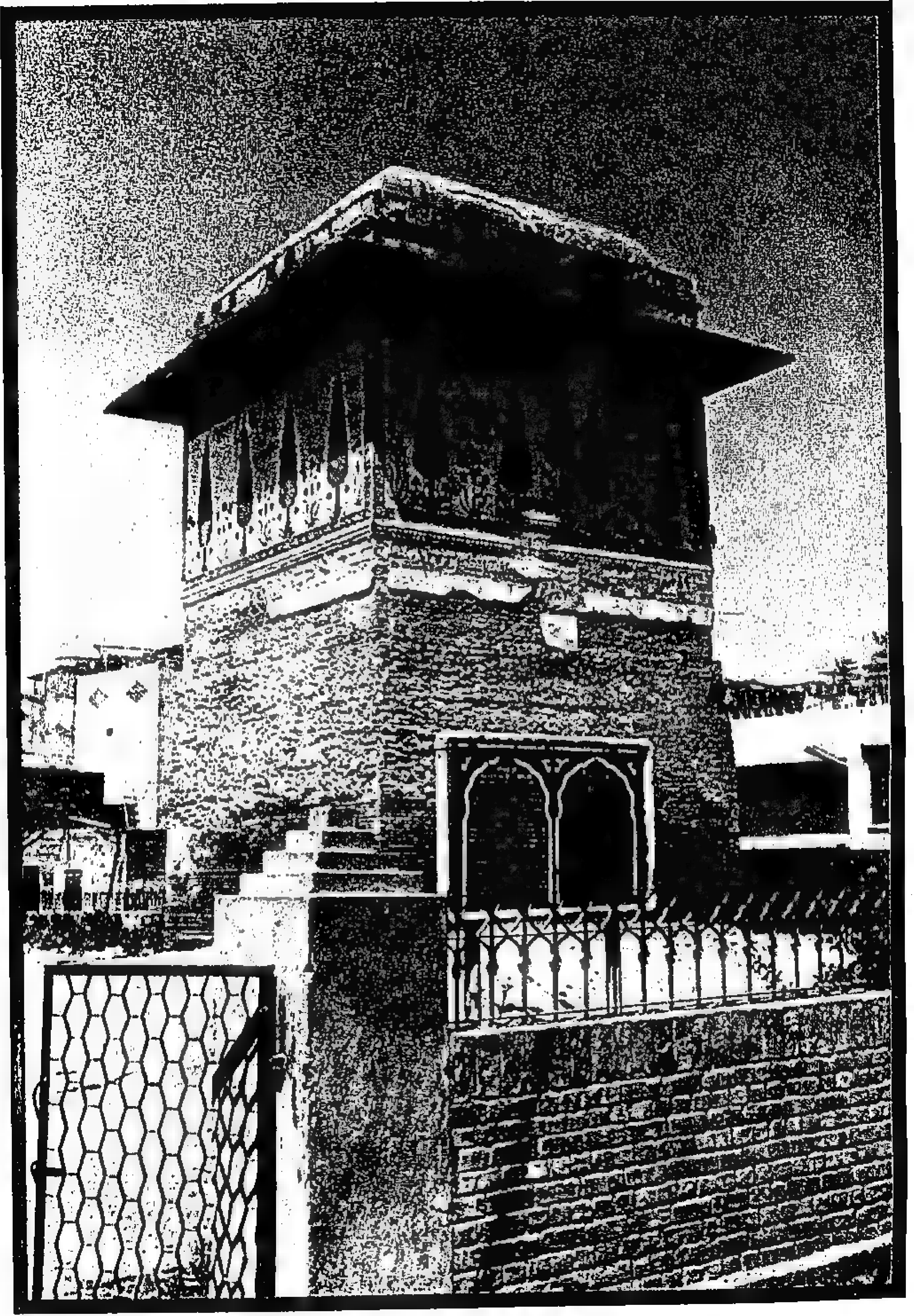
آپ کی وفات 1016ھ مطابق 1607ء بعہد سلطان نور الدین محمد جہانگیر ہوئی۔ آپ کا مزار اقدس لیک روڈ پر جین مندر اور کپور تھلہ ہاؤس کے درمیان اپنے رہائشی مکان میں بنایا گیا۔ آپ کے مزار کے ساتھ ایک مسجد اور مدرسہ بھی ہے۔ مزار مبارک پر سنگ مرمر کی تختی پر یہ عبارت تحریر ہے:

"مرقد منورہ حضرت بی بی کلاں اہلیہ حضرت موج دریا بخاریؒ اولاد پاک جناب غوث الثقلینؓ"

پیر غلام دستگیر نامی نے "بزرگان لاہور" میں آپ کے حالات میں مفتی غلام سرور لاہوری کا یہ منظوم قطعہ تاریخ وفات درج کیا ہے:

شد ز دنیا چوں جناب فاطمہؓ
سرمہ چشم جہاں شد خاک او
غوث اعظمؓ بود جد آں جناب
" اعظمے " آمد وصال پاک او

یعنی لفظ "اعظمے" سے آپ کا سال وفات 1016ھ برآمد ہوتا ہے۔



مقبرہ شرف النساء بیگم

روحانی منازل کی تکمیل شریعت کی پابندی سے ہوتی ہے۔

(شرف النساء بیگمؒ)

شرف النساء بیگم رحمۃ اللہ علیہا

شرف النساء بیگم، جس کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

خاک لاہور از مزارش آسماں

نواب بہادر خان حاکم لاہور کی ہمشیرہ تھی (تحقیقات چشتی۔ ص: 973) البتہ تاریخ لاہور کے مولف سید محمد لطیف نے لکھا ہے کہ نواب بہادر خاں کی منہ بولی بہن تھی۔ (صفحہ: 206) قرآن مجید اور شمشیر سے ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ان دونوں چیزوں کو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ خود بھی شمشیر زنی میں پوری مہارت رکھتی تھی، اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ہمیشہ یہی نصیحت کرتی تھی کہ وہ قرآن اور تلوار سے اپنا تعلق مضبوط سے مضبوط تر بنائیں کیونکہ یہی دو چیزیں ہیں جو مسلمانوں کی عزت و ناموس اور دین و وطن کی محافظ ہیں۔

شرف النساء بیگم کا بیشتر وقت قرآن مجید کی تلاوت اور اس کی تعلیمات میں غور و خوض کرنے میں گزرتا تھا۔ اس نے اپنے محل کے قریب اپنی عبادت کے لیے ایک بے زینہ چبوترہ بنوایا تھا۔ جو تقریباً ایک منزل اونچا تھا۔ وہ ایک سیڑھی کے ذریعے اس چبوترے پر چڑھتی اور اطمینان سے وہاں بیٹھ کر تلاوت قرآن میں مشغول رہتی۔ اس دوران اس کی مرصع تلوار بھی اس کے ساتھ رہتی۔

جب اس کا آخری وقت آیا تو اس نے اپنی والدہ کو وصیت کی کہ میری یہ دونوں چیزیں یعنی قرآن مجید اور شمشیر میرے ساتھ ہی قبر کے اندر رکھوا دینا۔ وفات کے بعد اسے وصیت کے مطابق اسی چبوترے پر دفن کیا گیا اور اس پر ایک گنبد بھی تعمیر کروایا گیا۔ اس چبوترے کی دیواریں روغنی منقش ٹائلوں سے مزین ہیں، جن کے تین اطراف میں سرد کے درختوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ اسی باعث عوام میں یہ "سرو والا مقبرہ" کے نام

سے مشہور ہے۔ مقبرے کے اوپر ایک کتبہ لگا ہے' جس پر خط طغریٰ میں یہ عبارت کندہ ہے:

"اللہ باقی و الکل فانی"

"سکھ گردی" کے زمانے میں ظالم اور لالچی سکھ حکمرانوں نے اس مقبرے کو کھود کر اس میں سے مرصع تلوار اور قرآن مجید نکال لئے۔ اس طرح مقبرہ کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ نور احمد چشتی (مصنف تحقیقات چشتی) اور سید محمد لطیف (مصنف تاریخ لاہور) نے لکھا ہے کہ شہزادی کی یہ دونوں اشیاء نہایت درجہ قیمتی تھیں۔ انگریزوں کے زمانے میں اس مقبرے کی مرمت کرائی گئی اور اسے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔

شرف النساء بیگم کا مقبرہ بیگم پورہ میں موجود ہے۔ اس مقبرہ کے بارے میں نور احمد چشتی لکھتے ہیں: "اس مقبرۂ سرو والا کے گوشہ شرقی و شمالی میں ایک حوض بڑا کشادہ موجود ہے۔ جس کے دو درجے ہیں۔ باہر والے درجے کی دیوار تا بہ کمر بلند اور درمیانہ آدھ گز۔ تمام چونہ گچ۔ اس کے میانہ میں ایک فوارہ شکستہ۔ جنوب رویہ اس تالاب کی بارہ دری تھی۔ وہ اب بوسیدہ ہو کر کھنڈر ہو گئی ہے۔ یہ تالاب خشت فروش اکھاڑنے لگے تھے' لیکن اولاد نواب خان بہادر سے احمد بیگ نے عرضی سرکار میں دے کر واگزار کرایا اور ایسا ہی ایک اور تالاب اس تالاب کے شمال رویہ ویران پڑا ہے۔ (تحقیقات چشتی: ص 973)

افسوس اس عظیم خاتون کے تفصیلی حالات کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ خاص طور پر حاکمان لاہور کے خاندان سے شرف النساء بیگم کا کیا تعلق تھا' اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں خاصا اختلاف ہے۔ البتہ مشہور مورخ سید عبدالقادر مرحوم (پروفیسر آف ہسٹری' اسلامیہ کالج لاہور) نے تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ یہ فخر ملت خاتون نواب عبدالصمد خان کی صاحبزادی تھیں۔ تمام عمر تارک الدنیا رہیں۔ اکثر وقت تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہتیں اور تلوار ان کے ساتھ رہتی۔ (زمیندار' لاہور مورخہ 16 مئی 1945ء)

علامہ محمد اقبالؒ مرحوم شرف النساء بیگم کے اسلامی کردار سے حد درجہ متاثر تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے جاوید نامہ میں اپنی معرکہ آراء نظم "قصرِ شرف النّساء" میں کیا ہے۔ یہ لازوال و بے مثال تمثیلی انداز میں لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبال اور مولانا رومؒ کو

جنت الفردوس کی سیر کے دوران ایک خوبصورت محل نظر آتا ہے جس کے بارے میں وہ پیر رومی سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ اس قدر خوبصورت محل کس کا ہے؟ جواب میں مولانا روم فرماتے ہیں کہ یہ بلند محل جو ہیروں اور جواہرات سے مرصع ہے' جس کے صدر دروازے پر خوبصورت حوریں ادب سے کھڑی ہیں' کس کا ہے؟ تو پیر رومی علامہ سے فرماتے ہیں کہ یہ عالی شان محل شرف النساء بیگم کا ہے۔ یہ وہ دختر اسلام تھی جس پر تمام کائنات فخر کرتی ہے۔ یہ وہ عظیم المرتبت خاتون ہے جس کے مزار سے لاہور کی سرزمین آسمان جیسا شرف رکھتی ہے۔

یہ نظم جاوید نامہ میں صفحہ 181 پر موجود ہے جسے اہل ذوق ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں میں اپنے محترم دوست نظیر لدھیانوی مرحوم کا وہ منظوم خوبصورت ترجمہ درج کر دوں جو انہوں نے "قصر شرف النساء" کا کیا ہے۔ یہ ترجمہ میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔ جو حاضر خدمت ہے:

"قصر شرف النساء"

میں نے پوچھا یہ مکان لعل ناب
باج ادا کرتا ہے جس کو آفتاب
یہ تجلی گاہ' یہ کاخ بلند
حوریں جس کے در پہ ہیں احرام بند
سالکوں کی رہبری کی آپ نے
اس کا مالک کون ہے فرمایئے
سن کے میری بات رومی نے کہا
یہ محل ہے منزل شرف النساء
اپنے دریا کو ہے اس گوہر پہ ناز
ہے ام گیتی کو اس دختر پہ ناز
یہ فضیلت اس کے مرقد نے ملی
آسماں ہے سرزمیں لاہور کی
فیض سے اس کے زمیں خلد بریں
کوئی اس کے راز سے محرم نہیں

وہ سراپا ذوق و شوق و درد و داغ
حاکم پنجاب کی چشم و چراغ
وہ فروغ دودۂ عبدالصمد
نقش فقر اس کا رہے گا تا ابد
رہتی تھی قرآن سے لو اس کی لگی
کوئی دم فارغ تلاوت سے نہ تھی
تھی نظر قرآن پر دل شوق زار
اور کمر میں اس کی تیغ آب دار
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز
زندگی بھر وہ رہی وقف نیاز
اس کا وقت واپسیں جب آ گیا
اپنی پیاری ماں سے اس نے یہ کہا
آپ ہیں گو رازِ دل سے باخبر
ڈالیے شمشیر و قرآں پر نظر
ہیں یہ دونوں پاسبان یک دگر
کائنات زیست کے شمس و قمر
وقت آخر ہے یہ میری التجا
تیغ اور قرآں نہ ہوں مجھ سے جدا
یاد رکھئے آخری درخواست کو
قبر پر میری کوئی گنبد نہ ہو
مومنوں کو تیغ اور قرآں ہے بس
اپنی تربت کو یہی ساماں ہے بس
مدتوں اس سقف نیلی کے تلے
تیغ و قرآں اس کی تربت پر رہے
اہل حق پاتے تھے پیغام حیات
عزم کو ملتی تھی تلقین ثبات

مسلم آخر ہو گئے نذر نشاط
الٹی ان کی شان و شوکت کی بساط
مرد حق نے باطل اندیشہ کیا
شیر نر نے روبہی پیشہ کیا
دل ہوا بے نور دیدہ بے نظر
برق بے درماں گری پنجاب پر
خالصہ شمشیر و قرآں لے گیا
حق یہ ہے جان مسلماں لے گیا
حرف رومی مجھ کو تڑپانے لگا
خطۂ پنجاب یاد آنے لگا
یاد ماضی سے مری آنکھیں تھیں نم
میں نے جنت میں خریدے کہنہ غم

راقم الحروف (عابد نظامی) نے اپنی وہ نظم شرف النساء بیگم ہی کے مزار بلند آثار کے سایہ میں بیٹھ کر لکھی تھی، جس کا آخری شعر یہ ہے:

یہ ہے خلاصۂ تعلیم سید الابرار ﷺ
کہ ایک ہاتھ میں قرآں ہو، ایک میں تلوار

غازی علم الدین شہید رحمتہ اللہ علیہ

(المتوفی 1929ء)

"اسی گلاں ای کردے رہے' تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔" (ملفوظات اقبال)
حکیم الامت حضرت علامہ اقبال ؒ نے یہ زبردست خراج عقیدت جس عظیم شخصیت کے حضور پیش کیا' اس کا نام نامی غازی علم الدین شہید ہے۔

غازی علم الدین 1908ء میں لاہور کے محلّہ چابک سواراں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام طالع مند تھا' جو بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ غازی علم الدین پانچ سال کے ہوئے تو انہیں محلّہ کی مسجد میں پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا' لیکن پڑھنے لکھنے میں ان کا جی نہ لگا۔ آخر ان کے والد نے انہیں اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ طالع مند کو بڑھئی کے کام میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ متحدہ ہندوستان میں وہ دور دور تک کام کے لئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں انہوں نے والئ حیدر آباد دکن نظام کے محل میں بھی کام کیا تھا۔ جس پر انہیں خصوصی سند دی گئی۔ علم الدین بھی اپنے والد کے ساتھ سیالکوٹ اور کوہاٹ وغیرہ شہروں میں والد کے معاون کے طور پر کام کے لئے گئے' لیکن بہت جلد وہ اپنے کام میں مشاق ہوگئے' اور وہ اکیلے ہی دوسرے شہروں میں کام کے لئے جانے لگے۔

یہ وہ وقت تھا' جب ہندوستان میں تحریک خلافت ناکام ہوچکی تھی اور انگریز اور ہندو مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کررہے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

انہی دنوں علم الدین ایک روز شام کے وقت اپنا کام ختم کرکے گھر واپس آرہے تھے کہ راستے میں مزار حضرت شاہ محمد غوث ؒ کے قریب انہوں نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ غازی بھی ہجوم میں داخل ہوگئے۔ جلسہ میں ایک مقرر انتہائی جذباتی انداز میں کہہ رہے

تھے۔" مسلمانو! راج پال نے "رنگیلا رسول" لکھ کر نبی آخر الزماںﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اٹھو' اپنی جانیں قربان کردو اور کمینہ خصلت راج پال کو اس کے انجام تک پہنچا دو۔" علم الدین نے دیکھا' مسلمان حاضرین شدت جذبات سے بار بار "یا رسول اللہ" کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ زار وقطار رو رہے ہیں۔ علم الدین جلسہ گاہ سے نکلے۔ تو ان کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی تھی' ان کا جی یہی چاہتا تھا کہ وہ ابھی جاکر بدبخت راج پال کا سر قلم کردے' جس نے دنیا کے سب سے عظیم انسان کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس حال میں بوجھل دل کے ساتھ وہ گھر آئے' گھر والوں کے ساتھ بھی انہوں نے اسی موضوع پر گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ ایک ظالم اور بدبخت ہندو لالہ نے ہمارے نبی پاکﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے اور ان کے خلاف کتاب شائع کی ہے رات کو بھی وہ سخت بے چین رہا' نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ جلد از جلد خبیث فطرت راج پال کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔

اگلے روز علم الدین کام پر نہ گئے۔ اس کا ذہن ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ راج پال کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوں اور اس کے ٹھکانے کا پتہ چلے' تاکہ وہ اس سے گستاخی رسولﷺ کا بدلہ لے۔ راج پال کا کھوج لگانے کا کام انہوں نے بڑی ہوشیاری اور عقلمندی سے کیا' کسی عزیز کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دی۔ دو تین روز اسی طرح گزر گئے۔ رات کو تھوڑی دیر کے لئے اس کی آنکھ لگتی' تو وہ خواب میں دیکھتا کہ وہ چھرا ہاتھ میں پکڑے راج پال کو قتل کررہا ہے۔ یا وہ یہ دیکھتا کہ راج پال کی لاش سڑک پر رکھی ہے اور بے شمار لوگ اردگرد جمع ہیں۔ کبھی وہ خواب میں دیکھتا کہ سبز لباس والے ایک بزرگ اسے کہتے ہیں کہ علم الدین! جلدی کرو' راج پال تمہارے ہی ہاتھوں قتل ہوگا' قدرت نے یہ سعادت تمہارے ہی مقدر میں لکھی ہے۔

پھر ایک صبح 6 اپریل 1929ء کو علم الدین جاگے' تو انہوں نے اپنی بھاوج سے کہا۔ آج میرے لئے میٹھے چاول پکا دیں میرا بہت جی چاہتا ہے۔ بھاوج چاول پکانے میں مشغول ہوئیں تو علم الدین نے غسل کیا' صاف ستھرے کپڑے پہنے اور خوشبو لگا کہ دستر خوان پر جا بیٹھا۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر علم الدین گھر سے باہر آگئے۔ اب ان کا رخ گنتی بازار کی طرف تھا' جہاں آتما رام کباڑیئے سے انہوں نے ایک روپے کے عوض ایک تیز

دھار چھری خریدی۔

راج پال کی دوکان کا محل وقوع تو وہ پہلے ہی معلوم کر چکے تھے۔ انار کلی میں ہسپتال روڈ پر راج پال کی کتابوں کی دوکان تھی۔ علم الدین نے وہاں ایک شخص سے راج پال کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کہیں باہر گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آجائے گا۔ علم الدین اس کے انتظار میں دوکان کے قریب ہی ایک تھڑے پر بیٹھ گئے۔ ابھی کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ہندو لالہ دوکان کے اندر داخل ہوا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہی راج پال ہے۔

راج پال ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ علم الدین بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے قریب جا پہنچا اور آن واحد میں نیفے سے چھری نکال کر راج پال کے سینے میں اتار دی۔ راج پال کے منہ سے "ہائے" کی آواز نکلی اور وہ فرش پر اوندھے منہ گر گیا۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی کے ساتھ ہوا کہ کسی کو کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔ "ہائے" کی آواز سن کر راج پال کے ملازم جو دوکان کے اندر کام کر رہے تھے بھاگے ہوئے آئے۔ علم دین کو یقین ہو گیا تھا کہ راج پال جہنم رسید ہو چکا ہے' اس لئے وہ چھری پھینک کر باہر کی طرف دوڑے۔ ملازموں نے شور مچایا کہ پکڑو' پکڑو راج پال قتل ہو گیا۔

علم الدین راج پال کے دفتر سے نکل کر ایک قریبی گلی کے اندر داخل ہو گئے' لیکن وہ گلی بند تھی' جس کے نتیجہ میں راج پال کے آدمیوں نے انہیں پکڑ لیا۔ علم الدین کی زبان پر اس وقت ایک جملہ تھا' جسے وہ بار بار دہرا رہا تھا کہ

اللہ شکر ہے' میں نے رسول ﷺ کی گستاخی کا بدلہ لے لیا۔

اللہ کا شکر ہے' میں نے رسول ﷺ کی گستاخی کا بدلہ لے لیا۔

غازی علم الدین کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ راج پال کی نعش میو ہسپتال بھجوا دی گئی' جہاں اس کا پوسٹ مارٹم کرنے سے معلوم ہوا کہ چھری کلیجہ کے اندر 7 انچ گہری اتر گئی ہے۔

راج پال پر اس سے پہلے دوبار قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ لیکن وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے اور مسلمانوں کی دل آزاری سے باز نہ آیا تھا۔ پہلا حملہ 24 ستمبر 1927ء کو ایک کشمیری نوجوان خدا بخش اکو جھا نے کیا' جس سے راج پال زخمی ہوا' لیکن جہنم واصل نہ ہو سکا' خدا بخش کو سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ پھر دوسرا حملہ 9

اکتوبر 1927ء کو عبدالعزیز نامی ایک افغان نوجوان نے کیا' جو تجارت کی غرض سے لاہور آیا تھا' یہاں آ کر اسے راج پال کی کمینگی کا علم ہوا تو وہ سیدھا اس کی دوکان پر جا پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت راج پال کی جگہ اس کا ایک دوست ستیانند دوکان پر بیٹھا تھا۔ عبدالعزیز اسے ہی راج پال سمجھا' اور اس پر حملہ کر دیا۔ ستیانند زخمی ہوا اور عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے بھی سات سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

غازی علم الدین نے راج پال کو قتل کیا' تو اس کی خبر بڑی تیزی کے ساتھ سارے شہر میں پھیل گئی۔ رات گئے تک اخبارات کے ضمیمے فروخت ہوتے رہے۔ ہندو میو ہسپتال کے باہر جمع ہوگئے جہاں راج پال کی نعش پوسٹ مارٹم کے لئے رکھی تھی' ادھر مسلمان پولیس اسٹیشن کے باہر عاشق رسول ﷺ علم الدین کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ دونوں طرف نعرہ بازی کا سلسلہ جاری تھا۔ شہر کی فضا کئی روز تک اسی طرح کشیدہ رہی۔

مسلمان اخبارات نے مطالبہ کیا کہ غازی علم الدین کو رہا کیا جائے کیونکہ اس نے حرمت رسول کی خاطر گستاخ رسول ﷺ راج پال کو اس کے حقیقی انجام تک پہنچایا ہے۔ ان خبروں نے پورے برصغیر کے مسلمانوں کے اندر جوش و جذبہ بھر دیا' ہر شہر میں غازی علم الدین کی رہائی کی قرار دادیں منظور ہونے لگیں' لیکن انگریز اور ہندوؤں کا رویہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ غازی علم الدین کو تختہ دار تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔

غازی علم الدین کو سنٹرل جیل لاہور منتقل کر دیا گیا۔ ان کے خلاف زیر دفعہ 302 تعزیرات ہند مقدمہ درج ہو چکا تھا۔ ان کے والد طالع مند کو بھی گرفتار کر لیا گیا' لیکن دوران تفتیش جب پولیس کو یقین ہو گیا کہ طالع مند راج پال کے قتل میں ملوث نہیں' تو انہیں چھوڑ دیا۔

10 اپریل کو صبح ساڑھے دس بجے علم الدین کے خلاف مسٹر لوئیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے ایشر داس کورٹ ڈی ایس پی پیروکار تھا' جبکہ علم الدین کی طرف سے کوئی بھی وکیل پیش نہ ہوا۔ عدالت نے گواہان استغاثہ کے بیان قلم بند کئے۔ یہ بیانات ابھی جاری تھے کہ دوپہر 12 بجے کے قریب مسٹر فرخ حسین بیرسٹر ایٹ لاء کمرہ عدالت میں داخل ہوئے اور انہوں نے عدالت کو بتایا کہ وہ علم الدین کی طرف سے وکیل ہیں۔ پھر انہوں نے علم

الدین سے کچھ دیر تنہائی میں باتیں کیں اور بعد ازاں عدالت سے استدعا کی کہ چونکہ یہ مقدمہ نہایت اہم ہے اس لئے ملزم کو صفائی کی تیاری کے لئے موقع دینے کے لئے ضروری ہے کہ مقدمہ کی سماعت کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کردی جائے۔ جس پر ایشرداس نے کہا کہ ملزم کے وکیل اگر چاہیں تو انہیں دو گھنٹہ کے لئے مثلیں دکھائی جاسکتی ہیں۔ مسٹر فرخ حسین نے کہا کہ یہ وقت صفائی کی تیاری کے لئے کافی نہیں۔ لیکن عدالت نے مسٹر فرخ حسین کی درخواست مسترد کردی۔ اس پر انہوں نے زیر دفعہ 526 ضابطہ فوجداری درخواست دی کہ چونکہ میں مقدمہ ہذا کے انتقال کے لئے ہائی کورٹ میں درخواست دائر کروں گا' اس لئے مقدمہ کی کارروائی روک دی جائے۔ اس پر عدالت نے مقدمے کی سماعت 16 اپریل تک کے لئے ملتوی کردی' اس تمام کارروائی کے دوران غازی کے چہرہ پر مسکراہٹ رقصاں رہی۔ کمرہ عدالت میں وہ سفید شلوار اور دھاری دار کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر سفید پگڑی تھی اور اس کے چہرہ کی بشاشت دیدنی تھی۔ 16 اپریل کو مسٹر لوئیس نے دوبارہ مقدمہ کی سماعت کی' غازی علم الدین بھی عدالت میں موجود تھے۔ استغاثہ کی طرف سے ایشرداس اور غازی کی طرف سے خواجہ فیروزالدین بیرسٹر پیش ہوئے۔ خواجہ صاحب نے عدالت سے کہا کہ یہ مقدمہ اب میں نے لے لیا ہے' قبل ازیں بیرسٹر فرخ جس نے التوائے مقدمہ کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا میرا موکل اسے ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ مقدمہ کی سماعت آخر میں سیشن کورٹ میں ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کی درخواست پر مجسٹریٹ نے انہیں کمرہ عدالت میں غازی علم الدین کے ساتھ چند منٹ گفتگو کرنے کی اجازت دی اور اس کے بعد مقدمہ کی کارروائی شروع ہوگئی اور استغاثہ کے باقی گواہوں کے بیانات ہوئے' مقدمے کی سماعت کے دوران خواجہ فیروز الدین ایڈووکیٹ اور مسٹر فرخ حسین کے علاوہ بعض دوسرے مسلمان وکیلوں نے بھی طالع مند سے تعاون کیا خواجہ صاحب نے عدالت سے کہا کہ شہادتوں سے مقدمہ ثابت نہیں ہوتا' اس لئے جج کو چاہئے کہ وہ ملزم کو بری کردیں۔

مقدمہ کی کارروائی سیشن کورٹ میں جاری رہی' لیکن جج نے غازی کے وکلاء کے دلائل تسلیم نہ کئے اور 22 مئی کو سیشن جج نے راج پال کے قتل کے جرم میں غازی علم الدین کو سزائے موت کا حکم سنادیا۔ اس فیصلہ کے بعد غازی کے والد طالع مند بمبئی گئے اور اس دور کے معروف مسلمان وکیل محمد علی جناح سے ملے' جن سے مشورہ کے بعد 15

جولائی کو سیشن کورٹ کی طرف سے سنائی جانے والی سزا کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر کردی گئی۔ ہائیکورٹ میں جسٹس براڈوے اور جسٹس جان پر مشتمل بنچ نے مقدمہ کی سماعت شروع کی۔ لیکن انہوں نے بھی محمد علی جناح کے دلائل کو قبول نہ کیا۔ اس طرح یہ اپیل خارج ہوگئی۔ پھر پریوی کونسل لندن میں بھی اپیل دائر کی گئی' لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا' وہاں بھی 15 اکتوبر کو اپیل خارج کردی گئی۔

میانوالی جیل

ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد 13 اکتوبر 1929ء کو غازی علم الدین میانوالی جیل پہنچا دیئے گئے۔ انہیں پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کردیا گیا۔ اس دوران جو لوگ انہیں ملنے جاتے تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ پھانسی کی کوٹھڑی میں غازی کا حوصلہ دیدنی تھا۔ آنے والوں کو وہ صبر کی تلقین کرتے تھے کہتے تھے جو کچھ میں دیکھتا ہوں' اگر وہ تمہیں بھی نظر آئے تو تم بھی نہایت خوشی کے ساتھ شہادت کی آرزو کرو۔ جیل کی کوٹھڑی میں غازی علم الدین کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہوگئی تھی' ان کا وزن بھی بڑھ گیا تھا اور وہ ہر وقت بہت خوش نظر آتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ جیل میں ملنے کے لئے آنے والا کوئی شخص بھی اظہار افسوس نہ کرے اور نہ ہی آنسو بہائے۔ انہی دنوں ان کی والدہ ملنے آئیں' غازی کی نصیحت کے باوجود وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔ زاروقطار رونے لگیں' غازی نے انہیں سنبھالا اور صبر کی تلقین کی۔

غازی علم الدین اگرچہ ان پڑھ تھے۔ لیکن خدا جانے پھانسی کی کوٹھڑی میں انہیں علم و دانش کی حیرت انگیز باتیں کون بتاتا تھا' ملنے والوں سے وہ حیران کن باتیں کرتے تھے' اس کا اندازہ ان کی آخری وصیت سے بھی ہوتا ہے' کوئی ان پڑھ آدمی یوں اپنی وصیت قلم بند نہیں کراسکتا۔ حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی مرحوم سے میں نے خود سنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ 1929ء میں غازی علم الدین شہید کی زیارت کے لئے میانوالی جیل میں گیا۔ ملاقات ہوئی تو غازی نے مجھ سے پوچھا۔

کیا آپ حافظ ہیں؟

میں نے کہا۔ الحمدللہ میں حافظِ قرآن ہوں۔

غازی نے کہا۔ مجھے سورہ یوسف سنائیں۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں' میں نے سورہ یوسف شروع کی' لیکن غازی کے رعب کے

باعث چند آیتیں پڑھنے کے بعد میں بھول گیا۔ غازی نے فوراً لقمہ دیا اور خود وہ آیت مکمل کی۔

عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ ان دنوں غازی سے عجیب و غریب کرامات ظاہر ہوتی تھیں۔ ظفراقبال نگینہ جنہوں نے "غازی علم الدین شہید" پر کتاب لکھی ہے' لکھتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا رہا کہ اگر جیل میں کوئی قیدی بیمار ہو جاتا اور علم الدین اسے اپنے ہاتھ سے پانی کے دو گھونٹ پلا دیتے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا۔ مرحوم نواب دین سپاہی پھگواڑہ نے جو اس وقت غازی کی نگرانی پر مامور تھا' ایک روز کمرے میں دیکھا تو علم الدین کمرے میں موجود نہیں تھے۔ وہ سمجھا کہ شاید انہیں کوئی نکال کر لے گیا ہے اس نے اعلیٰ حکام کو جو جیل میں موجود تھے' اطلاع کی اور جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ علم الدین کمرے میں موجود ہیں۔ نواب دین سپاہی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ کوٹھڑی سے شعائیں نکلتی دیکھیں۔ ایک لمحہ کو نواب دین نے کمرے کے اندر ایک ایسا منظر دیکھا کہ وہ دم بخود رہ گیا۔ اس وقت علم الدین کے پاس ایک نورانی صورت سبز پوش بزرگ کھڑے تھے اور وہ علم الدین کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور پھر نواب دین کی قوت سماعت سے الفاظ ٹکرائے' وہ بزرگ علم الدین سے کہہ رہے تھے' بیٹا! حوصلہ رکھنا' گھبرانا نہیں۔

غازی کی وصیتیں

جب پریوی کونسل میں بھی غازی کی اپیل مسترد ہو گئی' تو غازی بہت خوش ہوئے۔ کہتے ہیں کہ اب شہادت کے راستے کی ہر دیوار راستے سے ہٹ گئی ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے مجھے اس سعادت کے لئے منتخب کیا گیا۔

غازی علم الدین نے پھانسی سے قبل جیل میں آنے والے اپنے عزیز و اقارب کو جو وصیتیں کیں' وہ ان کی کتب سوانح میں محفوظ ہیں۔ وہ آنے والوں سے کہتے۔

میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو رہا ہوں۔ مرنے کے بعد یہیں مجھے غسل دینا اور یہاں میانوالی میں بھی میری نماز جنازہ پڑھنا تاکہ یہاں کے لوگ بھی میرے لئے جو دعائیں کریں' مجھے ان سے فائدہ پہنچے۔ پھر میری نعش جب لاہور لے جائیں' تو وہاں بھی اسے غسل دیں۔ ممکن ہو تو وہ چارپائی جس پر عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مولوی تاج دین رحمتہ اللہ علیہ کی نعش لے جائی گئی تھی' مہیا کریں اور اسی پر میرا جسدِ خاکی رکھ کر قبرستان لے

جائیں' میانوالی سے لاہور تک جس اسٹیشن پر بھی گاڑی رکے' وہاں جمع ہونے والے مسلمان باآواز بلند کلمہ شریف کا ورد کریں اور میرے لئے دعا کریں۔ لاہور میں میرا جنازہ چوبرجی والی گراؤنڈ میں پڑھا جائے۔

اپنی قبر کے بارے میں انہوں نے وصیت کی کہ قبر کے چار کونوں میں گلاب کے چار پودے لگانا۔ قبر پکی نہ بنانا۔ میری نعش کو صندوق میں بند کر کے دفن نہ کرنا' بلکہ اسے قبر کے خاکی فرش پر رکھ دینا۔ سنت مطہرہ کے عین مطابق میری تدفین کرنا۔ کیونکہ ہر مسلمان کے لئے سنتِ مصطفیٰ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والثنا ہی ہے جس کی ہر حال میں پیروی ضروری ہے۔

اپنی والدہ سے کہا۔ مجھے اپنا دودھ بخش دیں۔ ماں رونے لگی' تو اسے حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا۔ ماں! تو تو خوش نصیب ہے کہ تیرے بیٹے کو ایسی موت نصیب ہو رہی ہے' جس کی ہر مسلمان آرزو رکھتا ہے۔

غازی علم الدین شہید نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو تختہ دار پر جانے سے قبل اپنے رشتہ داروں کے لئے جو وصیت لکھوائی' وہ یہ تھی۔ میرے تمام رشتہ داروں کو تاکید کر دی جائے کہ میری پھانسی لگ جانے سے کسی کے گناہ نہیں بخشے جائیں گے۔ ہر ایک کو اس کا اپنا عمل ہی دوزخ کی آگ سے بچائے گا۔ میرے گھر والوں کو چاہئے کہ نماز قائم کریں اور احکام شرعی کی سختی کے ساتھ پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔ میری قبر کا فرش دو فٹ اونچا اور تیس فٹ مربع ہو۔ قبر کا کٹہرہ' جو تھڑے کے اردگرد ہو' سوا دو فٹ اونچا ہو۔ یہ سنگ مرمر کا بنایا جائے۔ قبر اندر سے کچی رکھی جائے۔ فرش خالی پر ریت بچھائی جائے۔ قبر کی چاردیواری کے باہر کی طرف دو کوٹھڑیاں بنائی جائیں اور کنواں بھی تعمیر کیا جائے۔ مسجد بھی بنائی جائے' جس کا فرش میری قبر کے فرش سے بہتر ہو۔ جب مجھے دفن کر چکو' تو دو رکعت نفل نماز شکرانہ اور دو نفل برائے مغفرت ادا کرنا۔ میرے جنازہ کے ہمراہ فساد نہ کیا جائے' سب کو امن و امان کی تلقین کی جائے۔ جنازہ میں شرکت کرنے والے اللہ جل شانہ کا ذکر کرتے رہیں اور سب کے سر جھکے ہوئے ہوں۔

پھانسی

31 اکتوبر 1929ء کو صبح سویرے میانوالی جیل میں عظیم عاشق رسول غازی علم

الدین کو پھانسی دے دی گئی۔ اس شب بھی انہوں نے حسب معمول نماز تہجد ادا کی۔ پھر نماز فجر پڑھی۔ تختہ دار پر لٹکانے سے پہلے مجسٹریٹ نے ان سے پوچھا' کوئی آخری خواہش ہو تو بتائیں۔ مسکرا کر فرمایا۔ دو رکعت نماز شکرانہ پڑھنی ہے۔ شکرانے کے یہ نفل انہوں نے نہایت ہی مختصر پڑھے۔ پھر ان کے گلے میں رسہ ڈال دیا گیا۔ مجسٹریٹ کے ایک ہی اشارے کے ساتھ ان کے پاؤں کے نیچے سے تختہ کھینچ لیا گیا۔ اور آن واحد میں غازی علم الدین ساقی کوثر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور حاضر ہو گئے دو جہاں کے آقا نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال فرمایا۔ یوں خوش نصیب علم الدین کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی۔

یہ رتبہ بلند ملا' جس کو مل گیا
ہر شخص کے نصیب میں دار و رسن کہاں

پھانسی دینے کے بعد جیل کے حکام نے انہیں جیل کے اندر ہی قبرستان میں دفن کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ نعش مسلمانوں کے حوالے کرنے سے فساد رونما ہو گا۔ جسے رد کرنا ممکن نہ ہو گا۔ مسلمانوں کو جب اس بات کا علم ہوا' تو پورے برصغیر میں شدید احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمان عمائدین کا ایک وفد گورنر پنجاب سے ملا' جس میں علامہ اقبال' سر شفیع' میاں عبدالعزیز مالواڈہ اور غلام محی الدین قصوری شامل تھے۔ اس وفد نے نعش مسلمانوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ گورنر نے چند شرائط پیش کیں' جو وفد نے تسلیم کر لیں۔ آخر طے پایا کہ عام مسلمانوں کو نعش حوالے کرنے کی اطلاع صرف بیس گھنٹے پہلے دی جائے۔ نیز یہ بھی طے ہوا کہ غازی کی نعش کوئی مسلمان مجسٹریٹ میانوالی سے لاہور لائے۔

14 نومبر کو غازی کی نعش لاہور پہنچی۔ غازی کی وصیت کے مطابق جنازہ کا جلوس جنازگاہ (چوبرجی) پہنچا' جہاں وسیع میدان میں مسلمانوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ حضرت قاری محمد شمس الدین ؒ (خطیب مسجد وزیر خاں) نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت ہزاروں مسلمانوں کے لب پر ایک ہی ورد تھا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

غازی علم الدین شہید کو قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کر دیا گیا' رسول اللہ ﷺ کی حرمت پر قربانی دینے والا "ترکھاناں دا منڈا" اپنے عمل سے مسلمانوں کو یہ

پیغام دے گیا کہ جب بھی کوئی شیطان صفت، شخص نبی آخر الزمان ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرے، اس وقت مجھے یاد کرلینا۔ میرا عمل تمہیں صحیح راہ سمجھا دے گا۔

بنا کر رند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را

محمد ﷺ اصل ایمان ہے

رسول اللہ کی توہین کو برداشت کرتے ہو
کمال ضبط دکھلاتے ہو یا مرنے سے ڈرتے ہو
تمہاری بے حسی کا آسمانوں پر بھی ماتم ہے
تعالیٰ اللہ یہی وہ قوم ہے جو فخر آدم ہے
رسول ؐ پاک کی توہین ہو اور تم رہو زندہ
یہی بے غیرتی ہے جس سے ہے اسلام شرمندہ
محمد ؐ کے لئے بھی اب تمہیں غیرت نہیں آتی
رنگیلا لفظ سنتے ہو یہ چھاتی پھٹ نہیں جاتی
دل آزاری کا عذاب اگر تم کر نہیں سکتے
تو اتنا ہی کرو، کیا ڈوب کر بھی مر نہیں سکتے
محمد ﷺ اصل ایمان ہے، یہی خالق کا فرمان ہے
اسی کا نام ہے اسلام، اسی کا نام قرآں ہے
نماز و روزہ و حج وزکوۃ اسلام ہے بے شک
مگر ناقص ہیں یہ حب نبی دل میں نہ ہو جب تک
محمد ؐ پر نہ جب تک مال جان اولاد قربان ہو
مسلماں لاکھ کہلاؤ، مگر تم نامسلماں ہو

مسلمانو! خدارا آنکھ کھولو ہوش میں آؤ!
مسلمانو! اٹھو جرات دکھاؤ جوش میں آؤ
محمدؐ کے لئے ہر چیز قرباں ہے یہ دکھلا دو
فدا اس نام پر جان مسلماں ہے یہ دکھلا دو

یہ دکھلا دو کہ تم زندہ ہو تم میں جان باقی ہے
ابھی اسلام قائم ہے، ابھی ایمان باقی ہے

حفیظ جالندھری کی یہ نظم اگست 1927ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مرتبہ کتاب "محمد درشن" میں شائع کی اور انھیں ابوالاثر کا خطاب دیا۔ جو بعد میں ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ (خواجہ عابد نظامی)

غازی محمد اسحاق شہید رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی 1355ھ/1936ء)

بیسوی صدی کا ربع ثانی برصغیر پاک وہند کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہندوؤں نے اپنی سیاسی تحریک کو تیز تر کردیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر ہندوستان میں اپنا تسلط چاہتے تھے۔ اس مقصد کی خاطر انگریز ان کے ساتھ تھا۔ مسلمانوں کے اندر سے جذبہ وجوش جہاد ختم کرنے کے لئے انگریز ایڑی چوٹی کا زور لگا چکا تھا۔ اس ناپاک مقصد کے لئے اس نے مرزا قادیانی جیسے لوگوں کو استعمال کیا۔ انگریز اور ہندو کے گٹھ جوڑ نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ دونوں کا مقصد مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔

انہی دنوں ہندوؤں کے ایک متعصب لیڈر لالہ شردھانند نے شدھی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر میں اولیائے کرام نے اپنی عظیم جدوجہد سے جن لوگوں کو نعمت اسلام سے مالا مال کیا تھا' انہیں دوبارہ ہندو بنایا جائے۔ اس کام کا آغاز انہوں نے ان علاقوں میں کیا' جہاں مسلمان تعلیمی اور معاشی اعتبار سے انتہائی پسماندہ تھے۔ غریب دیہاتیوں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر مرتد بنایا گیا۔

بڑے شہروں میں جہاں تعلیم یافتہ مسلمان موجود تھے وہاں شعائر اسلامی کی توہین اور مسلمانوں کی مذہبی دل آزاری کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ آنحضور پرنور ﷺ کی توہین اور مسلمانوں کے دینی عقائد پر حملے کئے گئے' لیکن ہندوؤں کے ان ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں ان گنت ایسے جانباز مسلمان نوجوان پیدا فرمائے جنہوں نے اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ غلامی کے اس تاریک دور میں بھی مسلمان دینی غیرت وحمیت سے عاری نہیں ہیں۔ ان مسلمان

جانبازوں میں غازی علم الدین' غازی عبدالرشید' غازی عبدالقیوم' غازی عبداللہ' غازی مرید حسین' غازی میاں محمد' غازی احمد دین' غازی بابو معراج الدین' غازی امیراحمد اور غازی محمد اسحاق شہید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کے نام نامی آج بھی عشق رسالت کی تاریخ میں زندہ و درخشندہ ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

غازی محمد اسحاق" 1331ھ بمطابق 1913ء میں لاہور کی نواحی بستی سلامت پورہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی حاجی محمد حسین تھا' جو انتہائی نیک اور پابند شریعت بزرگ تھے۔ غازی پانچ سال کے ہوئے تو انہیں سلامت پورہ کے پرائمری سکول میں داخل کرایا گیا۔ پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہیں اسلامیہ ہائی سکول مغلپورہ لاہور میں داخل کرایا گیا۔ جہاں سے 1926ء میں انہوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد ان کے والد نے انہیں کاروبار پر لگادیا۔ لڑکپن کے اس زمانے میں بھی وہ ہمہ وقت نیک کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ کام کاج سے فارغ ہوتے ہی مسجد میں چلے جاتے۔ صفیں درست کرتے' صفائی کرتے' نمازیوں کے لئے وضو کے پانی کا انتظام کرتے اور وقت پر اذان دیتے۔

غازیؒ کے چھوٹے بھائی زینت القرا قاری غلام رسول کے مطابق اسی زمانے میں بھی ان کا بیشتر وقت عبادت الٰہی میں بسر ہوتا۔ جہاں کسی اہل اللہ کی آمد کی خبر ملی' وہاں حاضر ہو کر ان سے دعا کراتے اور ایسے وظائف دریافت کرتے جن کی بدولت آنحضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اکثر مشغول وظائف رہتے۔ اکثر کہتے کہ عشق رسول ﷺ کے بغیر دعوائے ایمان خام خیال ہے۔

بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس مقصد کے لئے پیسے جمع کرتے رہتے اور جب رقم کا بندوبست ہوجاتا۔ سفر کے لئے روانہ ہوجاتے۔ قاری غلام رسول صاحب کا کہنا ہے کہ وہ پاک وہند کے بیشتر مقامات کے علاوہ افغانستان' ایران' عراق' اردن اور حجاز بھی گئے اور انبیاء صلحاء اور اولیائے کاملین کے مزارات کی زیارت کی۔

غالباً 1934ء میں غازی نے لکھن شریف (نزد جلو موڑ) کے ایک صوفی بزرگ حضرت محمد بخش" کے دست حق پرست پر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی جو حضرت بابا جی محمد

قاسمؒ موہڑہ شریف کے خلیفہ تھے۔ خود غازی محمد اسحاق کے والد ماجد بھی بابا جی محمد قاسمؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔

انہی دنوں غازی اپنے والد ماجد کے ساتھ موہڑہ شریف حاضر ہوئے۔ باباجی محمد قاسمؒ کی نظر جب غازی صاحب پر پڑی تو ان کے والد سے فرمایا۔ حاجی محمد حسین! تمہارا یہ بیٹا معمولی انسان نہیں' یہ جلد ہی کوئی ایسا اہم کام انجام دے گا' جو تمہارے لئے بھی سرخروئی کا باعث بنے گا۔ پھر باباجیؒ نے شفقت سے غازی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ غازی نے کہا۔ باباجی! میرے لئے شہادت کی دعا کریں۔ باباجیؒ کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ پھر اپنا خرقہ اور جھنڈا منگوایا اور دونوں چیزیں غازی محمد اسحاق کو عطا فرمائیں۔

1935ء میں لاہور میں مسجد شہید گنج کا قضیہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ مسلمانوں کی اس قدیم مسجد پر سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں قبضہ کرلیا تھا۔ اس مسجد کے صحن میں مسلمانوں کے کئی معروف اور برگزیدہ بزرگوں کے مزارات تھے' جن میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے پڑپوتے حضرت شاہ کاکو چشتیؒ کا مزار اقدس بھی تھا۔ یہ مسجد بھی انہوں نے بنوائی تھی۔ یہیں ان کا قائم کردہ مدرسہ اور خانقاہ بھی تھی' جہاں دور دور سے طالبان حق حاضر ہوتے تھے۔ اسی تاریخی مسجد کی بازیابی کے لئے مسلمانوں نے یہ تحریک شروع کی تھی۔ غازی محمد اسحاق بھی اس تحریک میں پورے جوش وجذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔

مسجد پر چونکہ سکھوں کا قبضہ تھا' اس لئے مسجد کے اندر اور باہر سکھ جمع رہتے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر اور سرائے سلطان میں مسلمانوں کا ہجوم رہتا اور درمیان میں لنڈا بازار کا علاقہ ہندو سکھ پولیس سے بھرا رہتا تاکہ مسلمان مسجد تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ کشیدگی کئی روز تک جاری رہی۔ مسلمان جتھوں کی صورت میں مسجد کی طرف بڑھتے' لیکن ہندو اور سکھ سپاہی نہایت بے دردی کے ساتھ ان پر گولیاں اور آنسو گیس کے شیل برساتے۔

غازی ہر روز سلامت پورہ سے سرائے سلطان آتے۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کی بھی یہی خواہش ہوتی کہ کسی طرح مسجد شہید گنج تک پہنچ جائیں اور صحن مسجد میں کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کریں۔ فرقہ وارانہ آویزش کے باعث انہوں نے ایک خنجر بھی تیار کروایا تھا' جس پر انہوں نے خاص طور پر "نصر من اللہ وفتح قریب" کے

الفاظ کندہ کرائے تھے۔ یہ خنجر تحریک کے دنوں میں وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔

ایک روز جب تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ غازی کسی طرح پولیس والوں سے چھپتے چھپاتے اور سکھ بلوائیوں سے بچتے بچاتے مسجد کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اس وقت مسجد کے دروازے پر ایک سکھ پولیس افسر پہرا دے رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت آس پاس دوسرے سکھ موجود نہ تھے۔ پولیس افسر نے نوجوان غازی سے پوچھا۔ تم کون ہو؟ غازی نے للکار کر کہا۔ میں محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں اور مسجد میں اشہد ان لا الہ اللہ اور اشہد ان محمد رسول اللہ کا آوازہ بلند کرنے آیا ہوں۔ یہ سنتے ہی سکھ پولیس افسر نے آنحضور ﷺ کی شان اقدس میں نازیبا الفاظ کہے۔ یہ سننا تھا کہ غازی موصوف نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنا خنجر نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے سکھ پولیس افسر کے سینے میں اتار دیا۔ خنجر لگنے کے بعد سکھ پولیس افسر زمین پر گر پڑا اور کراہنے لگا۔ غازی فوراً واپس لوٹے اور مسجد حضرت شاہ محمد غوثؒ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ غازی کے ایک دوست حاجی معراج دین کے مطابق گستاخ رسول کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد جب غازی خون آلود خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے اور نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے مسجد حضرت شاہ محمد غوثؒ کی طرف جارہے تھے تو اس وقت کسی کافر کو انہیں پکڑنے کی جرات نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے سب کے دلوں میں خوف ڈال دیا۔

مسجد حضرت شاہ محمد غوثؒ میں آکر غازی نے صحن میں حوض کے پانی میں اپنا خون آلود خنجر دھویا اور ابھی وضو کر رہے تھے تاکہ دشمن اسلام کو جہنم رسید کرنے کی خوشی میں دربار خداوندی میں سجدہ شکر بجالائیں کہ ہندو اور سکھ سپاہی انہیں تلاش کرتے ہوئے مسجد کے اندر پہنچ گئے۔ غازی نے خنجر لہراتے ہوئے کہا۔ خبردار' کوئی کافر میرے قریب نہ آئے۔ میری گرفتاری کے لئے کسی مسلمان سپاہی کو بھیجو۔ ان کی خواہش کے مطابق ایک مسلمان پولیس مین کو بلایا گیا۔ جس پر غازی نے اپنی گرفتاری پیش کردی۔ یہ جمعرات 4 جولائی 1935ء مطابق 2 ربیع الثانی 1354ھ کا واقعہ ہے۔

غازی محمد اسحاق کے ایک قریبی دوست حاجی معراج دین (ساکن گڑھی شاہو) کا بیان ہے کہ 3 جولائی 1934ء کو شام کے وقت جب سب مسلمان حسب معمول اپنے گھروں کو جانے لگے تو میں نے دیکھا کہ غازی اکیلے ایک بنچ پر بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا۔ محمد

اسحاق! اٹھو، گھر چلیں، اب تو سب لوگ جاچکے ہیں۔ انشاء اللہ کل صبح پھر آجائیں گے۔ لیکن غازی نے جواب دیا۔ معراج دین! تم گھر چلے جاؤ، میں بعد میں آ جاؤں گا۔ غازی نے وہ تمام رات اسی بیچ پر گزار دی۔ پھر اگلی صبح (4 جولائی 1935ء کو) اس نے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا جس کے باعث اسے غازی اور شہید جیسے بلند رتبے حاصل ہوئے۔

سکھ پولیس افسر ہرنام سنگھ نے خنجر لگنے کے بعد جو نزعی بیان ریکارڈ کرایا، اس میں کہا کہ میرے سینے میں ایک نہایت دبلے پتلے اور گورے چٹے بیس اکیس برس کے خوبصورت نوجوان نے خنجر گھونپا ہے۔

گرفتاری کے بعد غازی محمد اسحاق پر مقدمہ چلایا گیا۔ ایک موقعہ پر قائداعظم محمد علی جناح کو بھی مقدمہ کی وکالت کے لئے کہا گیا۔ انہوں نے مقدمہ کی فائل دیکھی تو کہا مقدمہ جیتنے کے لئے غازی محمد اسحاق کا محض ایک انکار کافی ہے۔ کیونکہ سکھ پولیس افسر کے نزعی بیان کے مطابق اسے ایک دبلے پتلے اور نحیف ونزار نوجوان نے قتل کیا، جبکہ غازی صاحب ماشاء اللہ خوب صحت مند ہیں (اپنے مقصد وحید میں کامیابی پر غازی موصوف اس قدر خوش تھے کہ جیل میں رہنے کے باوجود ان کی صحت روز بروز خوب سے خوب تر ہوتی جارہی تھی۔ جیل میں چند ماہ رہ کر وہ دبلے پتلے نوجوان نہ رہے تھے، بلکہ اچھے خاصے صحت مند ہوگئے تھے، حالانکہ جیل میں موٹے تازے قیدی بھی عموماً سوکھ کر کانٹا ہوجاتے ہیں)

غازی کو انکار قتل کا مشورہ دیا گیا، لیکن وہ نہ مانے اور سختی کے ساتھ فرمایا کہ میں کسی صورت ایسا نہیں کرسکتا۔ میں قیامت کے روز نبی پاک صاحب لولاک ﷺ کے جھنڈے تلے کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ انکار قتل سے میں اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہوجاؤں گا۔ ان کے عزیز واقارب، والدین، بہن بھائی واسطے دے دے کر انہیں کہتے کہ قتل سے انکار کردو، لیکن وہ جواب میں مسکرا کر کہتے۔ خدا کے لئے میرے مقصد کے حصول میں رکاوٹ نہ بنو۔ مجھے عنقریب جو انعام خداوندی حاصل ہونے والا ہے، اس کے سامنے یہ دنیا اور اس کے تمام رشتے ناطے ہیچ ہیں۔

غازی بڑے خوش الحان تھے۔ جیل کی کوٹھری میں جب وہ بلند آواز سے قرآن مجید پڑھتے تو قیدیوں پر اس کا بڑا اثر ہوتا۔ کئی ہندو اور سکھ قیدی ان کی تلاوت قرآن سن کر مسلمان ہوگئے۔ قاری غلام رسول صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ اکثر والد ماجد کے ساتھ غازی

سے ملاقات کے لئے جایا کرتے تھے۔ جب بھی وہ ان کی کوٹھڑی کے پاس جاتے تو انہیں عبادت و تلاوت میں مشغول پاتے۔ ان کی کوٹھڑی سے بڑی خوشبو آیا کرتی تھی۔ ہر نماز سے قبل وہ کوٹھڑی میں بہ آواز بلند اذان دیتے تھے۔

ایک بار انہیں پھانسی کی کوٹھڑی میں انتہائی خوش و خرم دیکھ کر کسی نے دریافت کیا کہ اس غیر معمولی خوشی کی کیا وجہ ہے تو غازی صاحب نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر رب کا جلوہ دیکھا تھا۔ میں نے یہاں کوٹھڑی میں کالی کملی والے کی زیارت کی ہے۔ میں اپنے نصیب پر کیوں خوش نہ ہوں۔

غازی محمد اسحاق کے خلاف نو ماہ مقدمہ چلایا گیا۔ آخر انگریز جج نے انہیں پھانسی کی سزا سنا دی۔ پھانسی کی تاریخ سے قبل حاجی محمد حسین اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ غازی کے ساتھ آخری ملاقات کے لئے آئے۔ ان میں غازی کی بیوی' ان کا بیٹا اور وہ چھوٹی بچی تھی' جس کی پیدائش کی خبر انہیں جیل میں ملی تھی۔ سب عزیز و اقارب رو رہے تھے اور غازی محمد اسحاق مسکرا کر سب کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔ پھر اچانک فرمایا۔ وہ دیکھو' کوٹھڑی میں سرکار دوعالم ﷺ تشریف فرما ہیں۔ تم لوگ کیوں روتے ہو' دیکھتے نہیں میں کس قدر خوش ہوں۔

پھر 25 مارچ 1936ء (مطابق یکم محرم 1355ھ بروز منگل) کی وہ ساعت آن پہنچی' جو ان کی پھانسی کے لئے تجویز ہوئی تھی۔ وقت مقرر پر سنٹرل جیل لاہور میں غازی محمد اسحاق نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالت بلند کرتے ہوئے تختہ دار کی طرف بڑھے۔ تختہ دار پر کھڑے ہو کر انہوں نے مدینہ شریف کی طرف اپنا رخ کیا اور بلند آواز سے الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ پڑھا۔ پھر پھانسی کے رسے کو چوم کر خود ہی اپنے گلے میں ڈالا۔ پھانسی دی جا چکی تو انگریز ڈاکٹر نے نعش کا معائنہ کیا۔ غازی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ بے ساختہ ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔ یہ مسلمانوں کا پیر پادری ہے' یہ اللہ کا نیک بندہ ہے۔

شہادت کے وقت غازی محمد اسحاق شہید کی عمر 23 برس تھی۔ زینت القرا قاری غلام رسول کا کہنا ہے کہ پھانسی کے بعد جب شہید کی میت ان کے مکان پر سلامت پورہ میں لائی گئی تو میری عمر اس وقت تین چار برس تھی۔ ایک رشتہ دار نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر غازی کے چہرہ اقدس کی زیارت کرائی اس وقت بھی وہ مسکرا رہے

تھے۔ شہید کی آخری زیارت کے لئے لوگ لاکھوں کی تعداد میں جمع تھے۔ سب کی زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد جاری تھا۔ سلامت پورہ کے شمال میں وسیع وعریض میدان میں شہید کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پھر گھر کے اندر ایک کمرہ میں انہیں دفن کر دیا گیا۔

اس کی لحد پہ رحمتیں ہوں' جس کی زندگی
تھی وقف عشق سید ابرار ؐ کے لئے

ماخذ و مراجع

	نام کتاب	مصنف/مؤلف	ناشر	اشاعت
(1)	قرآن حکیم	(ترجمہ خواجہ حسن نظامی)	خواجہ عابد نظامی لاہور	اشاعت سوم 1414ھ
(2)	مشکوٰۃ شریف		الفیصل لاہور	سنہ ندارد
(3)	آب کوثر	شیخ محمد اکرام	فیروز سنز لمیٹڈ	اشاعت دوم 1968ء
(4)	آفتاب زنجان	عالم فقری	شبیر برادرز لاہور	1994ء
(5)	انوار الاصفیاء	ادارہ تصنیف و تالیف	شیخ غلام علی لاہور	اشاعت دوم 1968ء
(6)	اولیائے لاہور	محمد لطیف ملک	سنگ میل لاہور	اشاعت و سنہ ندارد
(7)	الحاکم	پیر اقبال شاہ ہاشمی	قاضی پبلی کیشنز	بار اول 1411ھ
(8)	اخبار الاخیار	شیخ عبدالحق محدث	ادبی دنیا دہلی	طبع اول 1414ھ
(9)	اولیاء اللہ	خواجہ عابد نظامی	مکتبہ درویش لاہور	طبع اول 1996ء
(10)	اردو دائرہ معارف	مختلف جلدیں	دانش گاہ پنجاب لاہور	〃 1966ء
(11)	احوال تعلیمات ابوالحسن ہجویری	ڈاکٹر محمد باقر	〃 〃 〃 〃	〃 1989ء
(12)	اقبال کے محبوب صوفیاء	اعجاز الحق قدوسی	اقبال اکادمی پاکستان	طبع اول 1976ء
(13)	بزرگان لاہور	پیر غلام دستگیر نامی	نور بک ڈپو لاہور	بار دوم 1981ء
(14)	بزم صوفیہ	صباح الدین عبدالرحمان	مطبع معارف اعظم گڑھ	1949ء
(15)	پنجاب رنگ	شفیع عقیل	مرکزی اردو بورڈ لاہور	بار اول 1968ء
(16)	پنجابی دے صوفی شاعر	ڈاکٹر لاجونتی رام	مجلس شاہ حسین لاہور	طبع اول 1966ء
(17)	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	مکتبہ معین الادب لاہور	طبع چہارم سنہ ندارد

(18)	تاریخ مخزن پنجاب	مفتی غلام سرور لاہوری	دوست ایسوسی ایٹس لاہور	1995ء
(19)	تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ)	مولوی رحمان علی	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی	بار اول 1961ء
(20)	تاریخ لاہور	کنہیا لال	مجلس ترقی ادب لاہور	بار اوّل- 1977ء
(21)	تقویم تاریخی	عبدالقدوس ہاشمی	ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد	1965ء
(22)	تذکرہ اولیائے پاک و ہند	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	الفیصل، لاہور	سالِ اشاعت ندارد
(23)	تذکرۂ اولیائے ہند	مرزا اختر دہلوی	کتب خانہ میور پریس دہلی	سال اشاعت 1928ء
(24)	تذکرہ موج دریا بخاری	طالب ہاشمی	القمر لاہور	طبع اول 1995ء
(25)	تذکرہ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ	سید ولایت علی شاہ	سید علی شہباز کرمانی لاہور	سال اشاعت ندارد
(26)	تذکرہ حضرت شاہ بلاول قادری	میاں اخلاق احمد	احمد بدر اخلاق شاد باغ لاہور	1994ء
(27)	تذکرہ حضرت ایشاں	میاں اخلاق	احمد بدر اخلاق شاد باغ لاہور	طبع پنجم 1985ء
(28)	تذکرہ اولیائے لاہور	عالم فقری	شبیر برادرز لاہور	1993ء
(29)	تحقیقات چشتی	نور احمد چشتی	الفیصل لاہور	1993ء
(30)	تحریک ختم نبوت	شورش کاشمیری	مکتبہ چٹان لاہور	سال اشاعت ندارد
(31)	تذکرہ مشائخ قادریہ حسینیہ	محمد امیر شاہ قادری گیلانی	مکتبہ فیضان، پشاور	بار دوم، 1991ء
(32)	تاریخ مشائخ چشت (جلد پنجم)	خلیق احمد نظامی	دائرۃ المصنفین اسلام آباد	سنہ ندارد
(33)	تحریک احیائے اسلام اور سلاطین مغلیہ	پروفیسر ابصار عالم	حرا پبلی کیشنز لاہور	سنہ ندارد

(34)	جاوید نامہ	علامہ اقبال	شیخ مبارک علی لاہور	طبع دوم 1947ء
(35)	حدائق الحنفیہ	مولوی فقیر محمد	حسن سہیل لمیٹڈ لاہور	1300ھ
(36)	حضرت بی بی پاکدامن	حفیظ اللہ منظر	ادارہ ضیائے ادب لاہور	بار اول 1990ء
(37)	حضرت شاہ رکن عالم	نور احمد فریدی	قصر الادب بکھو والا ضلع ملتان	بار اول 1381ھ
(38)	حضرت شیخ طاہر بندگی	سید خورشید حسین بخاری	مکتبہ کاروان' ملتان	بار اوّل-1998ء
(39)	خطہ پاک اوچ	مسعود حسن شہاب	اردو اکیڈمی بہاولپور	بار اول 1967ء
(40)	خزینۃ الاصفیاء (اردو ترجمہ)	مفتی غلام سرور لاہوری	مکتبہ نبویہ لاہور	1983ء
(41)	خفتگان خاک لاہور	پروفیسر محمد اسلم	ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور	بار اول 1993ء
(42)	دبستان صوفیاء	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	الفیصل لاہور	بار اوّل-1996ء
(43)	رود کوثر	ڈاکٹر شیخ محمد اکرام	فیروز سنز لاہور	بار پنجم 1970ء
(44)	سکینۃ الاولیاء	دارا شکوہ	الفیصل لاہور	1992ء
(45)	سخن کے وارث	ڈاکٹر شفیق بابری	لوک ورثہ اسلام آباد	بار اول 1984ء
(46)	سید ہجویرؒ	سید محمد متین ہاشمی	محکمہ اوقاف پنجاب لاہور	بار اوّل-1985ء
(47)	سلطان محمود غزنوی	پروفیسر محمد حبیب	تخلیقات لاہور	1998ء
(48)	شاہ محمد غوثؒ	ڈاکٹر ام سلمیٰ گیلانی	مکتبہ الحسن پشاور	1990ء
(49)	شاہجہاں نامہ	محمد صالح کنبوہ	مرکزی اردو بورڈ لاہور	1971ء
(50)	صوفیائے پنجاب	اعجاز الحق قدوسی	سلمان اکیڈمی کراچی	بار اول 1962ء
(51)	طبقات اکبری (جلد اوّل)	خواجہ نظام الدین احمد	اردو سائنس بورڈ لاہور	1990ء
(52)	غازی علم الدین شہید	ظفر اقبال نگینہ	جنگ پبلشرز لاہور	1992ء
(53)	فوائد الفواد (ترجمہ)	خواجہ حسن ثانی نظامی	اردو اکادمی' دہلی	بار اول 1990ء

(54)	فرحت الناظرین	محمد اسلم پسروری		
(55)	کشف المحجوب (ترجمہ)	مولوی فیروز الدین	فیروز سنز لاہور	سنہ ندارد
(56)	کافیاں شاہ حسین	مرتبہ: محمد آصف خان	پنجابی ادبی بورڈ لاہور	1987ء
(57)	کلام شاہ حسین	مرتبہ: ڈاکٹر سید نذیر احمد	پیکجز لمیٹڈ لاہور	1979ء
(58)	لاہور سکھوں کے عہد میں	ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی	کتاب خانہ نورس لاہور	1964ء
(59)	لاہور کے دو قدیم صوفیاء	میاں اخلاق احمد	مقام اشاعت شاد باغ لاہور	سنہ ندارد
(60)	لاہور عہد مغلیہ میں	محمد دین فوق	ظفر برادرس لاہور	بار اول 1927ء
(61)	منتخب التواریخ (ترجمہ)	علامہ عبدالقادر بدایونی	غلام علی اینڈ سنز لاہور	بار اول 1962ء
(62)	مقالات دینی وعلمی	ڈاکٹر مولوی محمد شفیع	احمد ربانی میسن روڈ لاہور	سنہ ندارد
(63)	ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت	پروفیسر محمد اسلم	ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور	1995ء
(64)	مدینۃ الاولیاء	محمد دین کلیم	اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور	سنہ ندارد
(65)	مولوی حاکم علی اور اقبال	محمد صدیق	بزم اقبال لاہور	1992ء
(66)	مجلس صوفیہ	پروفیسر محمد معین الدین	نفیس اکیڈمی کراچی	1988ء
(67)	مقالات شیرانی	حافظ محمود شیرانی	کتاب منزل لاہور	سنہ ندارد
(68)	معجم البلدان	حافظ محمود شیرانی	کتاب منزل لاہور	سنہ ندارد
(69)	نظامی بنسری	حضرت خواجہ حسن نظامی	دفتر اردو انسائیکلوپیڈیا دہلی	1941ء
(70)	نقوش لاہور نمبر	مرتبہ عبداللہ قریشی	لاہور	فروری 1962ء
(71)	وفیات مشاہیر پاکستان	پروفیسر محمد اسلم	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	1990ء

(72) ہشت محفل (ملفوظات) سید محمد باقر اسلامک فاؤنڈیشن سن ندارد

(73) یادِ رفتگاں محمد دین فوق لاہور 1984ء

رسائل واخبار

(1) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور مرتبہ: خواجہ عابد نظامی (مختلف شمارے)

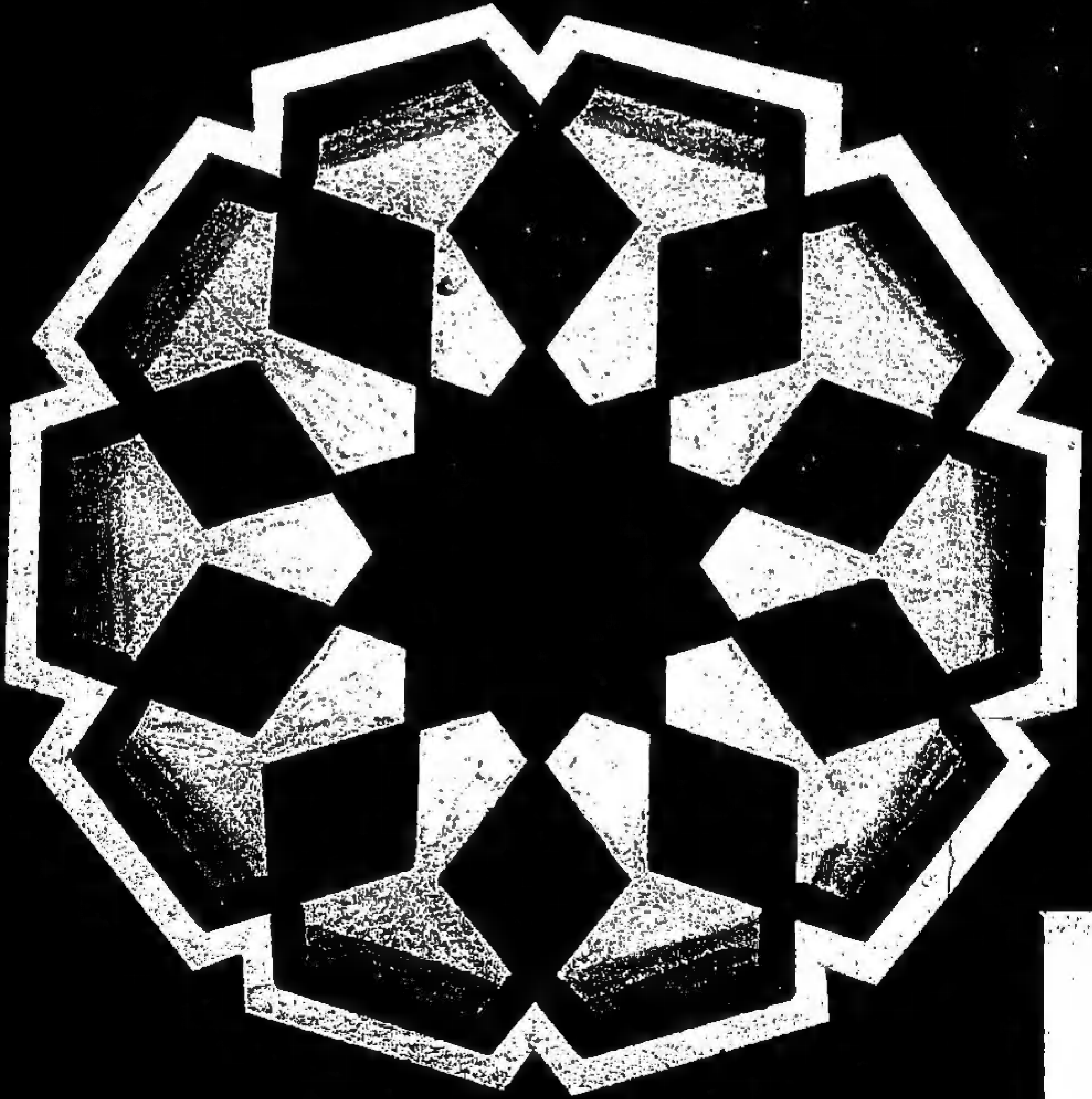
(2) ماہنامہ درویش لاہور مرتبہ: خواجہ عابد نظامی

(3) جہانِ رضا (اپریل 1997ء) مرتبہ: اقبال احمد فاروقی

(4) روزنامہ نوائے وقت لاہور (ملی ایڈیشن) مرتبہ: خواجہ عابد نظامی (مختلف اشاعتیں)

لاہور میں اسلام کے سفیر

عہدِ غزنوی سے قیامِ پاکستان تک



ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی